

برگ و سازنا کتاب و حکمت است

ایں دو قوت اعتبارت است

# اقبال اور قرآن

فکر و پیما اقبال — قرآن کی روشنی میں

جلد اول

پرویز

طابع و اعلان پبلسٹنٹری، کلکتہ لاہور

## جملہ حقوق محفوظ ہیں

اقبل اور قرآن	---	نام کتاب
غلام احمد پرویز	---	مصنف
اول	---	جلد
چہارم 1996ء (بلا ترمیم)	---	ایڈیشن
طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)	---	ناشر
25-B گلبرگ II لاہور 54660	---	
فون: 576 4484	---	
دوست ایوسی ایش	---	طابع
الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 54000	---	
فون 712 2981	---	
عصمت اسلم پرنٹرز	---	مطبع

طلوع اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ کتب کی  
جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

## مشمولات

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
ج	فہرست	۱
د ۱ ص	پیش لفظ (طبع اول ۱۹۵۵ء) ، (طبع دوم ۱۹۶۵ء)	۲
۱	اقبال اور شرآن (۱۹۳۸ء)	۳
۳۴	تلمیحات اقبال (۱۹۴۹ء)	۴
۴۱	اقبال اور ملت (۱۹۴۰ء)	۵
۵۱	اقبال کا پیغام. نوجوانانِ ملت کے نام (۱۹۵۰ء)	۶
۷۱	مقدمہ ضربِ الکلم (۱۹۵۲ء)	۷
۷۹	مقامِ اقبال (۱۹۴۹ء)	۸
۸۷	پیامِ اقبال (۱۹۵۰ء)	۹
۹۲	مشرق و مغرب (۱۹۵۱ء)	۱۰
۹۷	علامہ اقبال سے آخری ملاقات (نوشتہ ۱۹۳۹ء)	۱۱
۱۰۵	۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء (۱۹۴۹ء)	۱۲
۱۲۳	اقبال کی کہانی بخود اقبال کی زبانی (۱۹۵۱ء)	۱۳
۱۴۹	اے کشتہ سلطانی و ملانی و پیری (۱۹۴۷ء)	۱۴
۱۷۵	کیا اقبال اشتراکی تھا؟ (۱۹۴۹ء)	۱۵
۱۹۲	اقبال اور دو قومی نظریہ (۱۹۶۳ء)	۱۶
۲۲۸	اقبال کا مردِ مومن (۱۹۶۳ء)	۱۷
۲۵۹	آدم کی کہانی اقبال کی زبانی (۱۹۵۴ء)	۱۸
۲۸۰	مجلس قلندرانِ اقبال (۱۹۵۹ء)	۱۹

# پیش لفظ

(طبع اول ————— مارچ ۱۹۵۵ء)

ہمارا دور اس اعتبار سے خوش بخت ہے کہ اس میں (تیرہ سو سال کے بعد) پھر سے شُرَّان کی آواز بلند ہوئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس آواز کے اولون السابقون میں بہت سی قابل قدر ہستیوں کے نام فخر و مسرت سے لئے جاسکتے ہیں۔ لیکن جس انداز سے علامہ اقبالؒ نے شُرَّانِ اِنْقِلَاب کی آواز سے فضا کو مہمور کیا ہے، اس کا جواب نہیں ملتا۔ مبداء فیض کی کرم گتری سے انہیں نظر کی وسعت، فکر کی بلندی اور جذبات کی گہرائی کے ساتھ اسلوب بیان بھی اس قدر حسین اور دلکش عطا ہوا تھا کہ جس کے کان میں ان کی آواز پڑ گئی، وہ جھومنے لگ گیا۔ اقبالؒ نے اپنے سب سے پہلے مرتب کلام (مثنوی اسرار و رموز) میں اس حقیقت کا اعلان کیا کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا شُرَّان سے سمجھا ہے اور ان کی شاعری سے مقصود یہ ہے کہ وہ قرآنی پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اس کے بعد وہ عمر بھر اس اعلان کو (مختلف انداز سے) دہراتے رہے اور آخر تک یہی پکارتے رہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو کسی خاص نکتہ کے متعلق ان کی قرآن فہمی یا قرآنی استدلال سے اختلاف ہو لیکن اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنی مسلسل سعی و کاوش اور سوز و غم سے ہمارے دور کے ارباب فکر و نظر کا رخ قرآن کی طرف ضرور موڑ دیا۔ اور یہ جو آپ کو آجکل "رجعت الی القرآن" کی آواز چاروں طرف سے سنائی دیتی ہے، یہ اسی سعی مسلسل کی بار آوری ہے۔ کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ (۱۳/۲۴)

پھر جس طرح یہ حقیقت ہے کہ شُرَّان کی آواز بلند کرنے والوں میں علامہ اقبالؒ کا نام سب سے فہرست نظر آتا ہے اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ جنہوں نے اقبالؒ کے اس شُرَّانِ پیغام کو صحیح طور پر سمجھا اور اُسے

آگے پھیلا یا ان میں محترم پرویز صاحب کا نام بھی سر عنوان دکھائی دیتا ہے۔ وہ مسلسل بیس پچیس برس سے اس فکر کی نشہ اشاعت اور اس پیغام کی تشریح و تفسیر میں مصروف ہیں۔ ان کی ضخیم مجلدات طلوع اسلام کے ہزار ہا صفحات اور مختلف اجتماعات میں ان کی سحر آفریں تقاریر، ان کی سعی و کوشش کی زندہ شہادات ہیں۔ یوں تو ان کی تصنیفات کی ایک سطر اور ان کی تقاریر کا ایک ایک لفظ بتا دیتا ہے کہ انہیں اقبال اور قرآن پر کس قدر عبور حاصل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی شہ آنی فراست، اقبالی بصیرت اور علمی تسحر کا اندازہ ان مجالس میں جا کر ہوا جس میں انہوں نے، حلقہ درویشان اقبال میں اقبال کے کلام کو (یوں کہتے کہ) درساً درساً سمجھایا۔ یہ مجالس ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سابق سفیر مملکت مصر (متعینہ پاکستان) کے ہاں (قونصلیہ مصر میں) منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جن خوش نصیب حضرات کو ان مجالس میں شرکت کا موقع ملا ہے وہ اس سے متفق ہوں گے کہ علوم قدیمہ اور جدیدہ کی روشنی میں، قرآن اور اقبال کو بیک وقت اپنے سامنے مشہود دیکھنے کے اس قسم کے مواقع اور کہیں نہیں مل سکیں گے۔ افسوس ہے کہ یہ تشریحات قلمبند نہ کی جاسکیں ورنہ ان کے بعد اقبال کو سمجھنے کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

پیام اقبال کے متعلق ایک جامع تصنیف کا خیال محترم پرویز صاحب کے سامنے مدت سے ہے لیکن چونکہ انہوں نے قرآن سے متعلق امور کو اپنی زندگی کے مقاصد میں سب سے مقدم رکھا ہے اس لئے وہ جب تک ان سے فارغ نہیں ہو جاتے، اقبال سے متعلق مستقل تصنیف کی باری نہیں آسکتی۔ آج کل وہ "قرآنی لغت" اور "قرآنی مفہوم" کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہیں اور جب تک ان کی تکمیل نہیں ہو جاتی، کسی دوسری طرف دھیان نہیں دے سکتے۔ لیکن ہمارے پاس مسلسل تقاضے پہنچ رہے تھے کہ پیام اقبال کے متعلق پرویز صاحب کی تشریحات کا کتابی شکل میں (بلا مزید توقف) قارئین کے سامنے آجانا نہایت ضروری ہے ان تقاضوں کے پیش نظر ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کے ان مضامین (اور تقاریر) کا مجموعہ شائع کر دیا جائے جو وقتاً فوقتاً طلوع اسلام میں چھپتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ مجموعہ حاضر ہے۔ ان میں سے کچھ تو طلوع اسلام کے دور اول (دہلی) میں شائع ہوئے تھے اور باقی اس کے دور جدید (کراچی) میں آخری مضمون البتہ ابھی تک کہیں شائع

۱۔ جواب مرحوم ہو چکے ہیں، (۱۹۴۵ء)۔ ۲۔ للہ الحمد کہ یہ دونوں شائع ہو چکے ہیں، (۱۹۴۵ء)۔ ۳۔ (۱۹۳۸ء)

۴۔ ۱۹۵۸ء سے یہ ادارہ لاہور منتقل ہو چکا ہے۔

نہیں ہوا۔ ان مضامین کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ قرآن کی روشنی میں علامہ اقبال کی پرویزی تشریحات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ آپ سند ہے۔ ان مضامین کے متعلق البتہ ایک بات قابل تصریح ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں اقبال کے فلسفہ سے بہت کم بحث کی گئی ہے اور اس کے پیغام کے عملی پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان مضامین کا بیشتر حصہ ان تقاریر پر مشتمل ہے جو مختلف اجتماعات میں کی گئیں اور یہ ظاہر ہے کہ عام اجتماعات میں فلسفیانہ مباحث کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ وہاں ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ عام فہم انداز میں زندگی کے عملی گوشوں کے متعلق گفتگو کی جائے۔ دوسرے یہ کہ (ویسے بھی) محترم پرویز صاحب علامہ اقبال کی اس تائیدی تلقین کو بڑی اہمیت دیتے ہیں کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پرز میں کے ہنگامے  
بڑی ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

وہ ملت اسلامیہ کے لئے "زمین کے ہنگامے" سہل کرنے کی تدابیر سوچتے اور زیادہ تر اپنی گوشوں کے متعلق قرآن کی تعلیم اور اقبال کے پیغام کو عام کرنے کی فکر کرتے رہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان مباحث کے فلسفیانہ پہلو کو اہمیت نہیں دیتے۔ مقصد یہ ہے کہ ان مضامین میں فلسفیانہ پہلو کے لئے موزوں مقام نہیں تھا۔ ویسے ان میں زندگی کی ان مستقل اقدار کے متعلق کافی بحث آگئی ہے جن پر قرآن انسانی عمل کی عمارت استوار کرتا ہے۔ جہاں تک فلسفہ اقبال کا تعلق ہے، پرویز صاحب کے پیش نظر یہ بھی ہے کہ حضرت علامہ کے خطبات (تشکیل جدید) کا تشریحی ترجمہ شائع کیا جائے۔ یہ خطبات (جو اس وقت تک بالعموم کتاب مثنوم کی حیثیت رکھتے ہیں) اس قدر اہم ہیں کہ ان کے ترجمہ اور تشریحات کی بڑی ضرورت ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے پرویز صاحب سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کچھ اسی وقت ہو سکے گا جب وہ اپنے پیش نظر قرآنی پروگرام سے فارغ ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان اہم مقاصد کی تکمیل کے لئے عمر، صحت اور توفیق عطا فرمائے کہ ایسے لوگ روز بروز پیدا نہیں ہوا کرتے۔



# پیش لفظ

(طبع ثانی) \_\_\_\_\_ (۱۹۷۵ء)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا، مشتمل تھا پرویز صاحب کے اس وقت تک کے خطابات اور مقالات پر۔ اُس ایڈیشن کے ختم ہوجانے پر اس کے دو سکر ایڈیشن کے لئے تقاضے موصول ہونے شروع ہو گئے، لیکن پرویز صاحب کے پیش نظر ایک ایسی خود مکتفی تصنیف تھی جس میں علامہ اقبالؒ کے فلسفہ کلام اور پیام پر سیر حاصل بحث کی جائے اور بتایا جائے کہ ان کی فکر کا سرچشمہ کیا تھا اور ان تمام جگرگدازوں اور زخموں کا مقصد کیا! لیکن اُس تصنیف کی باری قرآن مجید سے متعلق پروگرام کے بعد آسکتی تھی۔ پرویز صاحب اس تمام دوراں میں اس قرآنی مشن کی سرانجام دہی میں اس قدر مصروف رہے کہ دیگر موضوعات کے لئے انہیں بہت کم فرصت مل سکی چنانچہ ان کی معرکہ آراء لغات القرآن (چار جلدیں) اور شہرہ آفاق مفہوم القرآن (مکمل قرآن کریم کا مفہوم) علاوہ دیگر اہم تصانیف مثل کتاب التقدير، جہان فردا، شاہکار رسالت ان کی اس مصروفیت کا حاصل ہیں۔ نیز تبویب القرآن (قرآنی انسائیکلو پیڈیا) جو معلوم کتنی جلدوں میں طبع ہو بھی اسی عرصہ میں تکمیل تک پہنچا۔ بنا بریں وہ اپنی شدت آرزو کے باوجود فکر و پیغام اقبالؒ سے متعلق اپنی پیش نظر تصنیف کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ اور اس دوران میں "اقبال اور قرآن" کے جدید ایڈیشن کے تقاضے بڑھتے چلے گئے۔ جو اب پیش

خدمت ہے۔

ممکن ہے ہم اس (جدید ایڈیشن) کی اشاعت میں مزید تاخیر گوارا کر لیتے لیکن بدلتے ہوئے حالات نے پکار پکار کر کہنا شروع کر دیا کہ اس باب میں مزید تاخیر مناسب نہیں۔ جس طرح ہمارے صدر اقول کے بعد ایک ایسی سازش وجود میں آئی جس سے اسلام کے نام کے زیر نقاب ہتھیاری اسلامی کو مسخ کر کے رکھ دیا گیا (تفصیل اس اجمال کی شاہکار رسالت میں ملے گی)۔ اسی طرح اب کچھ عرصہ سے یہاں ایک ایسی سازش پرورش پارہی ہے

جس میں اقبال کے نام کی آڑ میں فکر و پیغامِ اقبال کو بڑی طرح مسخ کیا جا رہا ہے۔ مقصد اس کا بالکل واضح ہے اقبال ہی نے صدیوں کے بعد اسلام کے صحیح نظریات و تصورات کا احیاء کیا۔ اس نے اسلام کے بنیادی مسئلہ "دو قومی نظریہ" کا تصور دیا۔ اسی نے اس فراموش کردہ حقیقت کو از سر نو اجاگر کیا کہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین پر عمل پیرا نہیں ہو جا سکتا۔ انہی بنیادوں پر اس نے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا اور پاکستان وجود میں آ گیا۔ اگر اقبال کو ایک قومیت پرست سوشلسٹ، مغرب کی سیکولر جمہوریت کے علمبردار کے پیکر میں پیش کر دیا جائے تو ظاہر ہے کہ نہ مملکتِ پاکستان کے جداگانہ وجود کی وجہ جو از باقی رہ سکتی ہے اور نہ ہی اس خطہ زمین میں حقیقی اسلام کے احیاء کا امکان۔ طلوعِ اسلام اس سازش کا مسلسل مقابلہ کئے چلا آ رہا ہے اور اس سلسلہ میں ضروری سمجھا گیا ہے کہ "اقبال اور قرآن" کا نیا ایڈیشن بلا مزید تاخیر شائع کر دیا جائے جس میں پرویز صاحب کے اس وقت تک کے مقالات و خطبات شامل ہوں۔ ان سے آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ فکر و پیغامِ اقبال کو مسخ کرنے کی کیا کیا کوششیں کی جا رہی ہیں اور پرویز صاحب ان کے خلاف کس طرح مصروفِ جہاد ہیں۔ اسی سے آپ اس کا بھی اندازہ لگا سکیں گے کہ اس جہاد سے مقصود "محمد اقبال" نامی ایک شخص کی مدافعت اور تائید نہیں۔ اس سے مطلوب اقبال کے پیش کردہ قرآنی مسلمات کی حقیقت کشائی ہے جو پرویز صاحب کی زندگی کا مشن ہے۔ علامہ اقبال کے متعلق بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ لیکن اس نقطہ نگاہ سے ان کے متعلق بہت کم سوچا اور کہا گیا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فکرِ اقبال کے ساتھ ساتھ قرآن مجید پر بھی فائرنگاں ہو۔ پرویز صاحب کو بفضلِ ایزدی یہ دونوں سعادات حاصل ہیں۔ اس لئے وہ اس زاویہ نگاہ سے پیغامِ اقبال کو پیش کرنے کے لئے موزوں ترین صاحبِ فکر و نظر ہیں۔ اگر آپ زیرِ نظر تالیف کا اس نگاہ سے مطالعہ کریں گے تو ہمیں امید ہے کہ آپ اسے بید مفید اور منفرد پائیں گے۔

پرویز صاحب کی قرآنی فکر کی نشہ و اشاعت کی خوش بختی ادارہ طلوعِ اسلام کے حصہ میں آئی ہے جس پر یہ جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ جہاں تک ان کتابوں کے حسنِ صورتی کا تعلق ہے اس اوارہ نے اپنے سامنے ہمیشہ بلند معیار رکھا ہے۔ اس گرائی (اور بعض اعلیٰ پیمانہ کی اشیاء ضروریہ کی کمیابی بلکہ نایابی) کے زمانے میں اس روایتی معیار کا قائم رکھنا بڑا دشوار ہے۔ بایں ہمہ ہم اس کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں کہ معیار کرنے نہ پائے۔

والسلام

جون ۱۹۷۵ء

طلوعِ اسلام ٹرسٹ  
۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور



# اقبال اور قرآن

(پہلے یومِ اقبال، جنوری ۱۹۳۸ء کی تقریر)

۴۴  
مکھنڈ  
۴۵  
باوجودیکہ قرآن کریم میں باعتبارِ بلاغت ہر وہ حُسن موجود ہے جو ایک بہترین شعر میں ہونا چاہیے مگر متعدد مقامات پر اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن کریم شاعری نہیں۔ رسول اکرم شاعر نہیں۔

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ  
يُنذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقُّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝ (۴۹-۵۰/۳۶)

اور ہم نے اس (رسول) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ اس کے شایانِ شان تھی۔ بلکہ یہ تو (زندگی کی فراموش کردہ حقیقتوں کی) یاد دہانی ہے اور واضح قرآن (اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جس (کے خون میں) زندگی کی تڑپ موجود ہو (خدا کے اہل قوانین سے) آگاہ کر دے اور نہ ماننے والوں پر) ان کی ہلاکت و بربادی سے بیشتر، تمام حجت ہو جائے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ قرآن کی رُو سے محض "شاعری" کیوں کسی پیغمبر کے شایانِ شان نہ تھی اور ایک رسول کا پیغام شعر کی تمام لطافتیں اپنے اندر رکھتے ہوئے کس طرح "شعر" سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ پیغام جس کا سرچشمہ خدائے حق و قیوم کا علمِ ازلی ہو، اس کی ماہیہ الاقنیا از خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قوموں کے عروقی مُردہ میں خونِ زندگی دوڑائے، مردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل بھونک دے۔

یہی خصوصیت ہے جس کے لئے نوع انسانی کو قرآن کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَ لِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

اے ماننے والو! اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہا کرو۔ جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔

”شعر“ اور قرآن کے اس نمایاں فرق کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ”شاعروں“ کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۚ وَ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۚ

(۲۲۵ - ۲۲۴/۲۶)

وہ یوں ہی ادھر ادھر صحرا نوردیاں اور دشت پیمائیاں کرتے پھرتے ہیں اور ان کے قول و فعل اور قلب و زبان میں کبھی ہم آہنگی نہیں ہوتی۔

**شاعر اور اقبال میں فرق** | ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے کوئی منزل مقصود ہوگی، زندگی کا کوئی نتیجہ ہوگا اس کا ہر قدم ایک خاص سمت میں اٹھے گا، اس کا

رُخ خاص قبلہ مقصود کی طرف ہوگا۔ برعکس اس کے جس شخص کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ ہوگا، کوئی منزل مقصود متعین نہ ہوگی، وہ شتر بے ہمار کی طرح جدھر منہ اٹھائے گا چل دے گا۔ کبھی تخیلات کی اس حسین و جمیل دادی میں، کبھی تصورات کے اس ہولناک اور بھیانک صحرا میں مقصد پیش نظر صرف گرمی سخن ہوگا۔ اور اس کی خاطر اکثر و بیشتر یہی کرنا پڑے گا کہ دل کچھ محسوس کرے اور زبان کچھ کہے۔ برعکس اس کے ایک شخص ہے جس کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد بھی اپنا متعین کر دہ نہیں بلکہ وہ ہے جسے اس قرآن کریم نے متعین کیا ہے جس پر اس کا ایمان ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے قلب و دماغ، اپنے جذبات و افکار کو اس چیز کے تابع رکھے جس پر اس کا ایمان ہے۔ وہ سوچے تو اس کی مدد سے سمجھے تو اس کی روشنی میں دیکھے تو اس کے نور سے، وہ حقائق کو پرکھے تو اسی کسوٹی پر اور قبول کرے تو اسی کو جو اس کی رُو سے قبول کئے جانے کے قابل ہو اور رد کرے تو اس کو جو اس کے نزدیک مردود ہو، اب اگر ایسا مرد مومن اپنے خیالات کو جو دراصل قرآن پاک ہی کے حقائق ہوں گے (زبان شعر سے ادا کرے تو مومنین کے اس زمرہ میں آجائے گا جس کا ذکر قرآن کریم نے اس آیت میں کیا ہے جو مذکورہ صدر آیت سے متصل ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانْتَصَرُوا  
مِنْ، بَعْدِ مَا ظَلَمُوا..... (۲۶/۲۲۷)

گروہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اعمالِ صالحہ کرتے ہیں اور قرآن میں خداوندی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اپنی مدافعت اس وقت کرتے ہیں جب ان پر زیادتی کی گئی ہو۔

اقبال اسی زمرہ میں شامل ہے اور علومِ حاضرہ کے متعلق فکر اور شُرآنِ فہمی کی جن بلندیوں پر وہ پہنچ چکا تھا، ان کی رُو سے بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ عالمِ اسلام نے اس سے پہلے کبھی ایسا مفکر پیدا نہیں کیا۔ لہذا، اگر یہ درست ہے کہ کسی مفکر کے پیام میں عروسِ معنی کو بے نقاب دیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ان جذبات و خیالات کی تہ تک پہنچا جائے جس پر اس کی فکر کی اساس ہے اور اس سرچشمہ سے واقفیت حاصل کی جائے جو اس کے تخیلات کا ماخذ ہے تو بلا تکلف کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کا کلام کما حقہ سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک شُرآنِ کریم نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ جو اس زاویہ نگاہ سے پیغامِ اقبال کو دیکھے گا وہ جہاں ایک طرف یہ محسوس کر لے گا کہ شُرآنِ کریم انسان کو کن بلندیوں تک لے جاتا ہے، دوسری طرف یہ بھی دیکھ لے گا کہ حضرت علامہ قرآنِ کریم کے ان حقائق اور ادق مسائل کو کس خوبصورتی سے ایک شعر میں مل کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے ایامِ جاہلیت میں اقبال کو محض ایک "شاعر" کی حیثیت ہی سے دیکھا اور ان کے کلام سے محض "شاعری" ہی کا لطف اٹھایا تھا۔ لیکن جب یہ حقیقت سامنے آگئی کہ کلامِ اقبال کا سرچشمہ کیا ہے تو اس کے بعد ان کی **سرچشمہ فکر اقبال** شاعری کی نوعیت ہی بدل گئی اور پھر سمجھ میں آیا کہ اقبال کیا کہتا ہے، کیوں کہتا ہے اور کیسے کہتا ہے۔ اور یہ راز بھی کھل گیا کہ وہ کون سی شاعری ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس کا اتباع راہِ گم کردہ لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔ وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ (۲۶/۲۲۳) اور وہ کون سی ہے جو اس منزلِ مقصود کے لئے چراغِ راہ کا کام دیتی ہے جس کی طرف صراطِ مستقیم لے جاتا ہے۔ ایسے شاعر کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

شاعر اندر سینہٴ لبت چو دل رطقتے بے شاعرے انبارِ گل

سوز و مستی نقش بندِ عالمے است

شاعری بے سوز و مستی ماتھے است

## شعر را مقصود اگر آدم گری است شاعری ہم وارث پیغمبری است

بہر کیف یہ ہے وہ انداز جس سے میں نے حضرت علامہ کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے قرآن کریم کو جس نوعیت سے سمجھا ہے اس کی اجمالی سی کیفیت آپ کو معارف القرآن کے ان حصوں سے معلوم ہو گئی ہوگی جو اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں۔ شہر آن فہمی کے اس اسلوب کی طرف میری رہنمائی کرنے میں جن گراں مایہ ہستیوں کے بار احسان سے میری گردنِ شکر ہمیشہ نگوں سار رہے گی۔ ان میں حضرت علامہ اقبال کی ذات گرامی ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں شہر آن کریم کے کسی مشکل مقام پر جا کر رُک گیا تو علامہ کے ایک شعر نے ذہن میں بجلی کی سی ایسی چمک پیدا کر دی جس سے صحیح راستہ فوراً نگاہ کے سامنے آ گیا۔ دوسری طرف ایسا بھی ہوا کہ حضرت علامہ کے کسی شعر کے متعلق اُلجھاؤ پیدا ہوا تو کسی آیت شہر آنی نے اپنے "سسم" کے اعجاز سے قفلِ ابہام کو کھول دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ کی صحیح عظمت ہی اس میں ہے کہ انہوں نے اس دور میں جب کہ مسلمان قرآن کریم سے بہت دُور جا چکے تھے، ان کے سامنے شہر آنی تعلیم کو اس حسین و دلکش انداز میں پیش کیا کہ سعیدِ روحیں اپنے بربط ہستی کے تاروں اور اس سازِ نغمہ الست کے پرووں میں ایک کھوئی ہوئی ہم آہنگی یوں محسوس کرنے لگیں جیسے امن کو ہمار کی چاندی رات میں دُور سے بنسری کی ہلکی ہلکی آواز کسی بھولے ہوئے افسانہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ قوم کے نوجوانوں کو مذہب سے چڑسی ہو چکی تھی اور مذہب پرست طبقہ ان کے کھلے ہوئے الحاد اور دہریت کی وجہ سے ان کی طرف سے بائوس ہو چکا تھا۔ حضرت علامہ نے دین کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ اس کی رُوح پھر سے ان کے خون کے ذروں میں جذب ہو گئی اور اس طرح وہ غیر محسوس طور پر قرآن کریم کے قریب لا کر کھڑے کر دیئے گئے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان جو مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہو چکا ہو لیکن کلامِ اقبال سے اسے کچھ ذوق ہو اس کے سامنے اگر قرآن کریم کو اس کی اصلی شکل میں پیش کر دیا جائے تو وہ اسے ایک جانی پہچانی ہوئی حقیقت محسوس کرنے لگتا ہے۔

۱۔ معارف القرآن کی حسب ذیل مجلدات اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ ابلیس و آدم، جوتے نور، برقی طور، شعلہ مستور، معراج انسانیت، جہان فردا، من ویزداں، کتاب التقدير وغیرہ۔

جب حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا پورا پیام قرآن حکیم ہی کی تعلیم کی تفسیر ہے تو پیام اقبال پر قرآن کریم کی روشنی میں تمام و کمال تبصرہ ناممکن ہے جب تک پورے کا پورا مشران سامنے نہ لایا جائے۔ اس مقصد جلیلہ کے لئے میں نے معارف القرآن کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس وقت قرآن کی اساسی تعلیم کے ایک آدھ گوشہ پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی جاسکے گی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ اقبال کا پیام کس طرح قرآنی حقائق کو اپنے جاذب و دلکش انداز میں پیش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نقطہ نگاہ سے پیام اقبال کا تجزیہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ یہ ضرورت میرے پیش نظر ہے اور اگر توفیق ایزدی نے میری یاوری کی تو معارف القرآن کی تکمیل کے بعد اس طرف بھی توجہ دوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی مشران فہمی کے لئے جس قدر حضرت علامہ کی بصیرت کا رہن منت ہوں۔ اس کے سپاس گذاری کے تقاضے سے میں اپنے اوپر یہ فرض سمجھتا ہوں کہ میں اقبال کے پورے پیغام کو مشران کی روشنی میں پیش کروں میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس اہم فریضہ سے سبکدوش ہونے کی ہمت اور فرصت عطا فرمائے۔

اگر کوئی شخص مشران کریم کی بنیادی تعلیم کو دو لفظوں میں بیان کرنا چاہے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ مشران کریم جو پیغام نوح انسانی کو دیتا ہے وہ

**لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ**

ہے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ اس کلمہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سببی

یعنی اس امر کا یقین، اس حقیقت کا اعتراف کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکا یا جائے، جس کی غلامی اختیار کی جائے، جسے آقا تسلیم کیا جائے، جسے اپنی حاجت کا قبلہ مقصود سمجھا جائے، جس کے قانون کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنایا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے۔ تخریبی پہلو ہے۔ یعنی جو کچھ پہلے ذہن میں موجود ہے اسے مٹا دینا ہوگا، بھلا دینا ہوگا۔ جب زمین یوں صاف ہو جائے تو پھر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر ہوگی۔ پھر ایجابی پہلو آئے گا۔

تمام قوتوں کے انکار کے بعد اس امر کا اترا آئے گا کہ ہاں! مگر ایک قوت ایسی ہے جس کی غلامی اختیار کرنا ضروری ہے۔ جس کے قانون کے سامنے جھکنا زیبا ہے اور جسے اللہ کہتے ہیں۔ تمام قوتوں کو راستے سے ہٹا کر یوں خدا اور بندے کا براہ راست تعلق پیدا کر دینا یہ ہے مشران کریم کی تعلیم۔ دنیا

میں اس تعلیم کو سب سے پہلے ایک منضبط شکل میں پیش کرنے والے حضرت خلیلؑ اشد تھے۔ ان کی حیات مقصد کا یہ اہم واقعہ سب کو معلوم ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی قوم کے صنم کدہ میں بتوں کو پہلے توڑا اور اس کے بعد خدائے واحد کی طرف دعوت دی۔ پہلا قدم لا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ تھا اور اس کے بعد اِلَّا اللهُ۔ جب تک مکان خالی نہ ہو، نیا مکین آکر نہیں بستا۔ اس حقیقت کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل

یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لہجہ میں ہے

اسی لا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ کی تفسیر سورہ بقرہ میں یوں آئی ہے۔

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ  
الْوُثْقٰى لَا الْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)

جو شخص ہر سرکش قوت کا انکار کر کے فقط ایک اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس نے ایک ایسے مضبوط سررشتہ کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

اسی کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے ایک شخص مستم بنتا ہے۔

بیا کہ مثل خلیل این طلسم در شکنیم کہ جز تو ہر چہ دریں دیر دیدہ ام صنم است

شُرک کے متعلق بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کسی پتھر کی مورتی کے سامنے جھک جانے کا نام ہے اور بس۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے شرک یہی نہیں بلکہ اللہ کے سوا جو طاقت بھی ہو اس کے سامنے جھک جانے کا نام شرک ہے۔ اور یہ قوتیں وہ بُت ہیں جن کی تعمیر کسی سنگ تراش کے ہاں نہیں ہوتی یہ خود ذہن انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں۔ ان کا مسکن کوئی مندر نہیں ہوتا خود قلب انسانی ہوتا ہے۔ مال و اولاد کا بُت، عزت و جاہ کا بُت، دولت و ثروت کا بُت، حکومت و سلطنت کا بُت، ملک و نسب کا بُت۔ اور نہ معلوم کون کون سے لات و منات اور کون کون سے مہل و عزیٰ ہیں جو ہر آن اس کے جملہ و ماغ میں تہمتے رہتے ہیں جن کے سامنے کھڑا یہ کا پنتا ہے، لرزتا ہے، گڑ گڑاتا ہے، سجدے کرتا ہے، ماتھے رگڑتا ہے۔ یہ ہیں وہ بُت جن کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

رہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را ہر زماں در آستین دارِ خداوندے دگر

یہ بُت انسان کی خواہشات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور یہ ہے شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں گر جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی شرک کے متعلق فرمایا ہے۔

اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمِهِ... (۲۲/۲۵)

اکیا تو نے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا معبود بنا لیا؟ یہ ہے وہ جسے خدا

کے قانون ہدایت نے باوجود علم و عقل کے سیدھے راستے سے ہٹا دیا۔

کہ علم کا تقاضا تھا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کرتا لیکن جب جذبات عقل پر غالب آجاتیں جب خواہشات دماغ پر قابو پالیں تو پھر علم و عقل کبھی صحیح راستہ کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتے۔ یہی وہ بُت ہیں جن کی وجہ سے انسان قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

می تراشد فکر ماہر دم خداوندے دگر

رست از یک بند تا افتاد و ر بندے دگر

ایک زنجیر سے اس کا پاؤں نکالا جاتا ہے تو یہ اُسے دوسری میں الجھا دیتا ہے۔ ایک کی غلامی کا طوق اس کے گلے سے اتارا جاتا ہے تو یہ دوسرے کی غلامی کا طوق پہن لیتا ہے حالانکہ جس رسولِ اکرم کی امت ہونے کا یہ مدعی ہے ان کی بعثت کا مقصد ہی ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۱۵۷/۷)

وہ انسانوں کے طوق و سلاسل اتارنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ان کے بوجھ ہلکے کرنے اور

ان کے پاؤں سے زنجیریں اتروانے کے لئے۔

لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ :-

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے

باز طرح آفری انداخت است

کاید از خوں ریختن اندر طرب

بسر این باطل حق پیر ہن

بہر زماں در جستجوئے پیکرے

تازہ تر پروردگارے ساخت است

نام اونگ است ہم ملک و نسب

تیغ لا مؤخوذ الا هو بزن

جب تک دماغ سے ان غیر خدائی قوتوں کو نکالنا نہ جاتے خدا کا صحیح تصور ذہن میں نہیں آسکتا جب تک

روح قلب صاف نہ ہو توحید کے حروف و نقوش اس پر کئے نہیں جا سکتے۔ فرماتے ہیں۔

بیرں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہتے  
 یہی منفی اور مثبت کے دو ٹکڑے ہیں جن کے جوڑنے سے کلمہ توحید بن سکتا ہے۔ جب تک آپ دوسرے آقاؤں  
 سے رُخ نہیں موڑ لیتے نئے آقا کی غلامی اختیار نہیں کر سکتے جب تک اس پرانی  
 دنیا کو ویران نہیں کیا جاتا جہاں تو کی تعمیر نہیں ہو سکتی جب تک اس زنگ کو اتارا

## نفی اور اثبات

نہیں جاتا تو ارپرسی آب نہیں چڑھ سکتی۔ رموز میں ارشاد ہے۔

آتشی افروز از خاشاک خویش شعلہ تعمیر کن از خاک خویش  
 اس کو برنگ رنجتہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو

خوف باطل کیا کہ غارت گر باطل بھی تو

حق آنے سے باطل خود بخود فنا ہو جاتا ہے۔ اندھیرے کی فطرت ہی یہ ہے کہ جب چراغ آجائے تو اندھیرا  
 گھر چھوڑ جائے۔

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۗ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (۱۷/۸۱)

کہئے کہ حق آیا اور باطل غائب ہو گیا۔ باطل تو بنا ہی اصل لیتے ہے کہ فنا ہو جائے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس فروغ حق کے لئے کرنا کیا چاہیے۔ فرمایا۔

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی ٹرپ پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار اور خاک تر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوت پہنماں کو کر دے آشکار تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

حضرت علامہ کے کلام میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے الفاظ کے انتخاب میں جہاں "حسن شعریت"

لمحوظ ہوتا ہے، وہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہتی ہے کہ ان الفاظ کا استعمال محض برائے "وزن بیت" نہ

ہو بلکہ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے الفاظ بھی شہد ان کریم کے مختلف حقائق کے آئینہ دار

ہوتے ہیں۔ اگر میں اس لحاظ سے ان کے اشعار اور اشعار کے الفاظ کی تشریح کرنے لگوں تو ظاہر

ہے کہ



سفینہ چاہیے اس بحرِ سبکراں کے لئے

ہر چند جی چاہتا ہے کہ ایسا بھی ہوتا کہ ان کے کلام کی عظمت پورے طور پر سامنے آجائے لیکن عدم گنجائش مانع ہے۔ مثال کے طور پر مذکورہ صدر اشعار کے پہلے شعر میں "صداقت کے لئے مرنے کی تڑپ" کا ذکر ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوکتِ الفاظ شعر میں حرارت پیدا کرنے کے لئے ہے لیکن حقیقت اس سے کہیں بلند ہے۔ نبی اکرمؐ کے سامنے یہود وغیرہ بہت سی جھتیں پیش کرتے۔ بحث و جدل کا تقاضا کرتے۔ لیکن قرآن کریم نے سچے اور جھوٹے کی پہچان کے لئے ایک اور ہی معیار پیش کر دیا اور چیلنج دے دیا کہ آؤ اس کسوٹی پر پورے اترو۔ فرمایا۔

**معیار صداقت** فَتَمَثُّوا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲/۹۴)

اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔ مرنے کی تڑپ پیدا کرو۔ یہ ہے صداقت کی پہچان۔

دیکھے حضرت علامہ اس حقیقت کو ایک مصرع میں کس خوبصورتی سے بیان کر گئے ہیں۔ دوسرے مصرع میں "پیکرِ خاک کی میں جاں" پیدا کرنے کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن ان کی تشریح کے لئے مجھے قرآن کریم کی روشنی میں پورے نظریہ ارتقاء (THEORY OF EVOLUTION) کو بیان کرنا ہو گا اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں۔

ہاں تو کہا یہ جارہا تھا کہ جب لا کی تخریب کے بعد لا کی تعمیر کی جائے، تب آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ ایک قدم آگے بڑھے ہیں۔ دورِ حاضرہ جو یکسر اضطراب اور عدم اطمینان کا دور ہے اپنی ہر روش پر لا ہی لا کا مسلک اختیار کئے جا رہا ہے اور اس تخریب کو جہادِ زندگی سمجھا رہا ہے حالانکہ یہ محض استہلاک (DESTRUCTION) ہے تعمیر (CONSTRUCTION) نہیں۔ مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول، سوسائٹی کی

مسلمہ روایات سب اسی سیلابِ لا کی نذر ہو چکے ہیں اور اس کے بعد لا کی تعمیر کہیں شروع نہیں ہوئی۔ حالانکہ تخریب سے غرض ہی ایک نئی تعمیر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ بر پیدا  
سفرِ خاک کی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ  
نہاؤ زندگی میں ابتدا انتہا لا  
پیامِ موت ہے جب لا ہوا لا سے بیگانہ

عصر حاضر کے متعلق ارشاد ہے۔

لبالب شیشہ تہذیب حاضر ہے لآ سے مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ اِلا

روس اس لآ کے جنون میں سب سے زیادہ شدت سے گرفتار ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد ہی نفی سے شروع

ہوتی ہے۔ خدا کی نفی، کلیسا کی نفی، ملوکیت کی نفی، حکومت کی نفی، یعنی **اشتراکیت کا بحران نفی** (کمیونزم کے انتہائی دور میں) عائلی زندگی کی نفی، تدبیر منازل کی نفی، اس

میں شبہ نہیں کہ بعض چیزوں کی نفی تھی بھی ضروری۔ لیکن محض نفی سے تو کام نہیں چل سکتا۔ نفی کے بعد اثبات کی

بھی تو ضرورت تھی۔ توہمات کو چھوڑیے تو حقائق پر ایمان لائیے۔ یہ تفریط (EXTREMISM) اس یکسر

کفر (انکار) ہی کا تو نتیجہ ہے کہ دنیا بھر میں انقلاب کے مدعی خود اپنے اصولوں میں اس قدر عجلت سے تبدیلیاں

پیدا کر رہے ہیں کہ باریک میں نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ کچھ عرصے کے بعد وہ پھر وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے

تھے۔ روس کے متعلق ارشاد ہے۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ	لا سلاطین، لا کلیسا، لا اِلا
فکر او در تند بادِ لا بماند	مرکب خود را سوتے اِلا نراند
آیدش روزے کہ از زور جنون	خویش رازیں تند باد آرد برون
در مقامِ لا نیا ساید حیات	سوتے اِلا ی خرامد کائنات
لا و اِلا ساز و برگ اُمتاں	نفی بے اثبات مرگ اُمتاں

دو ہی صفحے پہلے ہے۔

نکتہ می گویم از مروانِ حال	اُمتان را اِلا جلال اِلا جمال
لا و اِلا احتساب کائنات	لا و اِلا فتح باب کائنات
ہر دو تقدیر جہاں کاف و نون	حرکت از لا زاید از اِلا سکون

اس آخری مصرع کو غور سے دیکھتے جب تک تو میں لآ کے بحران میں رہتی ہیں، عدم سکون و فقدان طمانیت کے گرداب میں چکر کھاتی ہیں کسی محکم چٹان پر ان کا قدم نہیں جمتا۔ آج ایک نظریہ قائم ہوتا ہے۔ دنیا میں شور

لے روس تو اب قریب قریب پھر نظام سرمایہ داری تک پہنچ رہا ہے۔

مچ جاتا ہے کہ بس وہ مداوا ہاتھ آگیا جس سے تمام دنیا کے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔ ابھی چار قدم بھی اس کی روشنی میں چلنے نہیں پاتے کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جسے تریاق سمجھ رہے تھے وہ زہر ہے۔ جسے چشمہ حیوان تصور کئے بیٹھے تھے وہ سراب ہے۔ اسے ڈھا دیا جاتا ہے اور پہلے کی طرح ایک اور فریب تیار کر لیا جاتا ہے۔ دو چار قدم اس کی روشنی میں چلتے ہیں پھر اندھیرے میں ٹامک ٹوٹیاں مارنے لگ جاتے ہیں۔ کَلَّمَآ اَصَاآ لَهُم مَّشْوَفِيْهِ قَا وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَا مُوَا ط (۲۲/۲۰) جب ذرا بجلی چمک پڑتی ہے تو اس میں دو قدم چل لیتے ہیں اور جب وہ روشنی غائب ہو جاتی ہے تو پھر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف تکیے لگ جاتے ہیں۔ یہ ہے متذبذب زندگی کا وہ جہنم جس میں آج ساری دنیا گرفتار ہے اور یہ نتیجہ ہے الہ کے نہ ہونے کا۔ اس عملی شرک کا۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَ مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَنَخَطْفُهُ الطَّيْرُ اَوْ قَهْوِيٌّ بِهٖ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَعِيْقٍ ۝ (۲۲/۳۱)

جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی حالت یوں سمجھئے گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا یا جیسے (مرغی کے چوزے کو) کوئی (عقبانی پنچوں والا) پرندہ اچک کر لے جائے۔ یا جیسے تندو تیز ہوا کے جھونکے (پیرگاہ کی طرح) اسے کسی دور دراز مقام پر پھینک دیں۔

گویا اس نظام کا مرکز ثقل گم ہو جاتا ہے جس میں لا ہی لا ہو، الا نہ ہو۔ وہاں حرکت ہی حرکت ہوتی ہے۔ سکون نہیں ہوتا۔ اسے کہیں حجم کر کھڑے ہونے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ بخود خنزیرہ و محکم چوں کو بساراں زری مزی چوں خس کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است اس تعمیر کا سبق وہ ملت اسلامیہ کے ان نوجوانوں کو دیتے ہیں جو لاعلمی کی وجہ سے اس قسم کی نفی کی طغیانوں میں بہ چلے جا رہے ہیں۔

کہنہ را در شکن و بازہ تعمیر نخرام ہر کہ در ورطہ لا ماند بہ الا نرسید اور ان مسلمانوں کو جو ہزار ہزار دانے کی تسبیح پڑھنے کے باوجود لا الہ الا اللہ کے معنی نہیں سمجھتے پھر سے یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ

کافر! دل آوارہ دگر بارہ باوبند بر خویش کشا دیدہ و از غیر فریبند

دیدن و گر آموز ندیدن و گر آموز

پھر سے سیکھ کہ لا کہاں تک جائے گا اور اِلا کہاں سے شروع ہوگا۔

جب تک انسان لا کے بھنور میں رہتا ہے وہم و قیاس آرائیوں کا تختہ مشق بنا رہتا ہے۔ اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تذبذب اور گمان میں قلبِ انسانی کس جہنم میں رہتا ہے اطمینان و سکون یقین میں ہے اور یقین پیدا نہیں ہو سکتا جب تک

## خدا کا دستِ قدرت

اس سلبی لا کے بعد ایجابی اِلا نہ آجائے۔ اس کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے

یقین پیدا کر لے فافل کہ مغلوب گماں تو ہے

مومن خدائے لم یزل کا دستِ قدرت کیسے بنتا ہے اس کی تفسیر دیکھنی ہو تو قرآن کریم میں واقعہ بدر دیکھتے کہتے ہیں کہ دائرہ کی لڑائی نے یورپ کی تاریخ بدل دی۔ لیکن جن کی نگاہیں دُور رس اور دقیقہ شناس واقعہ ہوئی ہیں ان کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہے کہ بدر کی لڑائی نے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔ اگر اس وقت خدا نکرہ مسلمان مجاہدین کی وہ مسطی بھر جماعت جو اوٹوں کی پسلیاں اور کھجوروں کی ٹہنیاں لے کر سر بکھٹ میدان میں آگئی تھی کہیں ضائع ہو جاتی تو آج دنیا پر توہم پرستی کے گھناؤنے بادل منڈلا رہے ہوتے اور کوئی نہ جانتا کہ علم و عقل، شعور و ادراک، حکمت و فلسفہ کیا شے ہے اور کوئی نہ پہچانتا کہ انسان کی اس دنیا میں صحیح پوزیشن کیا ہے۔ آج نہ اقبال ہوتا نہ اقبال کے یہ قلب و دماغ میں چمک پیدا کرنے والے حقائق اور روح میں برقی تپاں بن کر دوڑ جانے والے شعر ہاں تو اس بدر کی لڑائی میں جب کہ تین سو بارہ بظاہر بے کس بے بس مسلمانوں کا مقابلہ قوت اور سامان کے هجوم کے ساتھ تھا۔ مومنین کے دست و بازو خدا کے ہاتھ بنے۔ فرمایا کہ

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَ لَكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۗ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ

لَكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی ۙ (۸/۱۷)

تم نے ان دشمنوں کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے۔ تم نے تیر اندازی نہیں کی بلکہ وہ تو اللہ نے کی ہے۔ (تواریں تمہاری تھیں اور ان میں بگلیاں ہمارے غضب کی کوند رہی تھیں۔ تیر ہمارے تھے اور ان کی انیوں کے ساتھ قضائیں ہماری پٹ رہی تھیں)۔

یہ تھے وہ دست و بازو جن کے متعلق فرمایا کہ

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں لیکن برعکس یقین کے جو شخص مغلوبِ گماں رہتا ہے جو ایمانِ محکم کی بجائے تذبذب و دساؤں میں الجھا رہتا ہے اس کی تمام محنتیں اکارت جاتی ہیں۔ تمام کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ تمام ساز و سامان تمام جیوش و عساکر دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ بعینہ جس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گولی چلانے والا اپنا کارتوس بھی ضائع کر دیتا ہے۔

وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ (۵/۵)

جس نے ایمان و یقین سے انکار کیا تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے۔

لیکن جب اس میں ایمان پیدا ہو جاتے تو پھر انہی بازوؤں کی پرواز حد و فراموشی اور انہی ہاتھوں کی قوتیں وسعتِ نا آشنا ہو جاتی ہیں۔

جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا

تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روحِ الا میں پیدا

قرآنِ کریم میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَالْأَشْرَارُ بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ه (۴۱/۳۰)

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس یقین پر جم کر کھڑے ہو گئے تو ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں (جو انہیں بشارت دیتے ہیں کہ) امتِ ڈرو! بالکل نہ گھراؤ تمہارے لئے خوشخبری ہے اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

جب انسان میں ایمان و یقین کی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ وہ ہر ایک شے کو نئے نئے انداز سے دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھ پر کسی خارجی اثر کا رنگین چشمہ نہیں ہوتا۔ گویا وہ ہر چیز کو اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہاں پہنچ کر حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

میانِ آب و گلِ خلوتِ گزیدم ز افلاطون و فارابی بریدم

نکروم از کسے در یوزہ چشم جہاں راجز چشم خود ندیدم

قرآنِ کریم نے علم کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ سمع، بصر اور قلب کی شہادت سے حاصل ہوتا ہے۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ  
أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝ ۱۷۶

جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو سمع، بصر اور قلب ہر ایک کی بابت پرسش ہوگی۔

پوچھا جائے گا کہ جس چیز کو تم نے بطور علم کے تسلیم کیا تھا اسے تم نے سماعت و بصارت کی رو سے تجربات و مشاہدات کے ذریعے پرکھ کر دیکھ لیا تھا کہ واقعی یقینی شے ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ **علم و عقل** تمہارے قلب سلیم کو بھی اپیل کرتا تھا۔ اس کے برعکس ان ذرائع سے کام نہ لینے والے کو قرآن کریم نے جہنمی قرار دیا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۚ وَ لَهُمْ آعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ۚ وَ لَهُمْ  
أُذُنٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَئِكَ كَانُوا لَنَا مِثْلًا ۚ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ (۱۷۶)

وہ لوگ جو دل و دماغ رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے، تو یہ بالکل ڈھور ڈنگر ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ ان سے بھی زیادہ بے راہ رو۔

لیکن نے علم کے متعلق یہی نظریہ استقرار پیش کیا اور یورپ کی کایا پلٹ دی۔ اور قرآن کریم نے چودہ سو برس پیشتر علم کی یہی تعریف بیان فرمائی۔ لیکن قرونِ اولیٰ کے بعد مسلمانوں نے اسے غلاف اڑھا کر اونچے اونچے طاقتوں میں نہایت ادب و تعظیم سے رکھ چھوڑا اور خود اندھوں کی طرح دوسروں کی لکڑی کے بہارے چلتے گئے کہ وہ گڑھے میں گریں تو یہ بھی ساتھ ہی جائیں۔

حضرت علامہ علم کی اس قرآنی تعریف کے متعلق فرماتے ہیں کہ "جہاں زاہدہ چشم خود ندیدم"۔ اسی "چشم خود" کے متعلق ضربِ کلیم میں ہے۔

افلاک منور ہوں بڑے نور سے	دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سمانے تم سے	خوشید کرے کسب ضیاء تیرے سر سے
شرمندہ ہو فطرت تیرے اعجازِ ہنر سے	دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی تسائی	اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی

یہ ہے جہان کو اپنی نظر سے دیکھنا۔ یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر دیکھتے کہ آپ کی دنیا میں کیسا تھجرا نیکر انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ نگاہ کے بدل جانے سے ہر شے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ دنیا کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اشیاء کی قیمتیں بدل جاتی ہیں اور قرآن کریم کے الفاظ میں یَوْمَ تَبْدَلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتِ۔ یہ زمین بدل جاتی ہے، یہ آسمان بدل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سُخِّرَ لَكُمْ أَعْيُنٌ تُرَىٰ بِهَا مَا تَصَدَّقُونَ  
اگر نگاہ تو دیگر شود جہاں دگر است

جاوید نامہ میں ہے۔

تبدیلی نگاہ | ایک منزل رانمی دانی زرہ  
قیمت ہر شے ز اندازِ نگہ  
نوع دیگر ہیں جہاں دیگر شود  
ایں زمین و آسماں دیگر شود

یہی وہ نگاہیں ہیں جن سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں اور یہی وہ نگاہیں ہیں جو بدبختی سے ہماری قوم کے نوجوانوں سے چھن چکی ہیں۔ جنہیں وہ بزعم خویش اپنی نگاہیں سمجھتے ہیں وہ اپنی نہیں ہوتیں دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہی وہ متاعِ گراں بہا ہے جس کے چھن جانے پر ہر رونے والی آنکھ روتی ہے اور ہر تڑپنے والا دل تڑپتا ہے۔ یہی نوجوانوں کی ”بے بصری“ اقبالؒ کو بھی لہو لاتی ہے اور اس نے اپنے قلب و دماغ کے بہترین جوہر اسی جہاد میں صرف کر ڈالے ہیں کہ کہیں سے یہ فردوسِ گم گشتہ پھر نوجوانوں کو مل جائے۔

لیکن مومن کی یہ ”چشمِ خویش“ یہ اپنی آنکھ اس وقت اپنی بنتی ہے جب یہ قرآن کریم کی روشنی میں اس آنکھ سے کام لے کہ جس طرح آنکھ بیرونی روشنی کے بغیر بیکار ہے، دیدہ عقل و شرانِ کریم کے نورِ مبین کے بغیر بالکل کور ہے۔ اس کے متعلق نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ خدا کا نور و شرانِ کریم ہے۔ ایک مرد مومن دنیا کی ہر شے کو قرآن کریم کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اس کے

انکار و آزار اس کے تابع چلتے ہیں۔ اس کا علم و فلسفہ اس کی پیروی کرتا ہے۔ یہ ہے قرآن کی روشنی | فرق ایک مومن اور غیر مومن حکیم ہیں۔ غیر مومن یا تو تنہا اپنی عقل کے زور پر چلتا ہے

اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے یا دوسرے انسانوں کے پیچھے پیچھے قدم بقدم چلتا ہے کہ اگر وہ جہنم کا راستہ اختیار کئے ہیں تو یہ بھی وہیں پہنچے گا۔ برعکس اس کے ایک حکیم مومن اپنی عقل و خرد سے شرانِ کریم کی روشنی میں کام لیتا ہے اور چونکہ وہ روشنی خدا نے علیم و خبیر کی عطا فرمودہ ہے اس لئے وہ اشیاء کی حقیقتوں کو بے نقاب کر دیتی ہے اور انسان پھر کبھی لغزش نہیں کھاتا۔ یہ ہے وہ حصہ الٰہی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور جس سے

محروم رہنے کی وجہ سے آج دنیا جہنم زار بن رہی ہے اور یہ حصّۃ الّا یہ خدا کے غیر متبدل قوانین، یہ فطرت کے اٹل حقائق، سوائے قرآن کریم کے دنیا میں آج کہیں نہیں ہیں۔ چونکہ حضرت علامہ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم انسانوں کو کس قسم کی بصیرت عطا کرتا ہے، یہ نگاہوں کو کس اوج تک پہنچا دیتا ہے، یہ قلب انسانی میں کیا کیا انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ یہ کس طرح اس کی ساری دنیا بدل دیتا ہے۔ اس لئے جہاں کہیں وہ قرآن کریم کا ذکر کرتے ہیں، وجدِ مسرت سے مجھوم اٹھتے ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے قرآن کریم سے عشق و محبت کی چاشنی ٹپکتی ہے۔ وہ خود بھی اس میں جذب ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی جذب کر لیتے ہیں۔ رموز میں فرماتے ہیں۔

زیر گردوں سر تمکین تو چست	تو ہی دانی کہ آئین تو چست
حکمت اولایزال است و قدیم	آن کتاب زندہ شران حکیم
بے ثبات از قوتش گیر ثبات	نسخہ اسرار تکوین حیات
آیہ اشش شرمندہ تاویل نے	حرف اور اریب نے تبدیل نے
حایل اور حمتہ للعالمین	نوع انساں را پیامِ آخریں

اور سنئے۔

ایں کتاب نیست چیزے دیگر است	فاش گویم آنچه در دل مضمراست
در ضمیر خویش و در قرآن نگر	چوں مسلماناں اگر داری نظر
عصر ہا پیچیدہ در آناست اوست	صد جہان تازہ در آیات اوست
ہر جہاں اندر بر او چوں قباست	بندہ مومن ز آیات خداست
می دہد شران جہانے دیگرش	چوں کہن گرد جہانے در برش

دو چیزیں قابل غور ہیں۔ ایک تو "ضمیر خویش" اور دوسرے "عصر ہا پیچیدہ در آناست اوست"۔ اس "عصر ہا پیچیدہ" کی خوبصورتی دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے۔ قرآن کریم کی آیات کو کھولتے جاتے جہاں اندر جہاں

قرآن اور رموز کائنات

زمانہ در زمانہ ان کے اندر لپٹا ہوا ملے گا۔ شران کتاب فطرت ہے یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانے میں بھی جا کر یہ کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی، اسی طرح شران بھی یہ کہہ نہیں کہے گا کہ بس اب



میں تھک گیا۔ جو کچھ میرے اندر تھا سب باہر آچکا۔ اب میں خالی برتن ہوں۔ اب کسی اور رہبر کی تلاش کرو۔ قطعاً نہیں۔ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی۔ آدم کے وقت لوگ اتنا ہی جانتے ہوں گے کہ اس سے پیاس بجھائی جاتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا بھی جاتا ہے۔ لیکن اس پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیات زمانہ کی عقل و علم، تجربہ و مشاہدہ، وسعت و بلندی کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں جیسے وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آج دیکھئے، اسی پانی سے کس قدر کام لئے جا رہے ہیں۔ کیا آدم کے وقت کے پانی میں یہ خصائص موجود نہ تھے! یا کیا دنیا آج یہ کہہ سکتی ہے کہ پانی میں جو کچھ تھا سب معلوم کر لیا گیا ہے۔ دنیا اپنے تجربات کی جن بلندیوں تک چاہے اڑتی چلی جاتے، فطرت کی اشارہ ان کا ساتھ دیتی جائیں گی۔ اسی فضا کو دیکھئے جو کل تک خالی بھی جاتی تھی، آج اس میں ایٹر کی امواج نے کیا کچھ کر دکھایا ہے۔ کیا ایٹر پہلے موجود نہ تھا! کیوں نہ تھا۔ اسی فضا میں لپٹا ہوا تھا ہیچیدہ تھا۔ یہی قرآن کریم کی کیفیت ہے۔ زمانہ عقل و علم کی جن پہنائیوں تک چاہے بلند ہوتا چلا جائے، قرآن اس سے بھی آگے نظر آئے گا۔ جو بات آج سمجھ میں نہیں آسکتی اسے کل کی آنے والی نسلیں، جو اگر تجربات و مشاہدات میں موجودہ نسل سے آگے ہوں گی، خود بخود سمجھ جائیں گی۔ اسی طرح قرآن کریم کی ایک ایک آیت حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آتی جائے گی۔ اُس وقت اس کی کوئی آیت مشابہ نہیں رہے گی۔ سب محکم ہو جائیں گی۔ یہ میں نہیں کہتا۔ خود قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَ فِي الْآنْفُسِ حَتَّىٰ يَتَّبِعِنَا  
لَهُمْ آيَةُ الْخُرُوجِ ۝ (۴۱/۵۳)

ہم ان کو اپنی نشانیاں اس نظام کائنات میں اور خود نفس انسانی کے اندر دکھاتے جائیں گے  
یہاں تک کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن فی الواقعہ حق ہے۔

انسانوں کی صحیح پوزیشن | اس نظام کائنات میں انسان کی صحیح پوزیشن کیا ہے،  
اسے سب سے پہلے قرآن کریم ہی نے متعین کیا۔ یہ اعلان

آپ کو قرآن ہی میں ملے گا کہ

وَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۝ (۲۵/۱۳)

جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے۔ جو کچھ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہے

اس نے ان سب کو تمہارے لئے تابع فرمان کر رکھا ہے۔

یہ تو اس کائنات سے متعلق ہے لیکن شُرَّانِ کریم تو اس سے بھی آگے جاتا ہے (اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا)۔ قرآنِ کریم کوئی علم الحیات (BIOLOGY) کی کتاب نہیں کہ اس میں ان امور کی ریسرچ دے رکھی ہو۔ بایں ہمہ جہاں کہیں ضمناً تخلیق انسانی کا ذکر اس میں آگیا ہے، جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ وہی ہے جس پر انسان اپنے کمالِ تحقیق کے بعد پہنچے گا۔ یہی حالت دیگر علوم سائنس کے متعلق ہے۔ قرآن میں تبعاً اور ضمناً جہاں جہاں ان کا ذکر آگیا ہے وہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ انسانی انکشافات جس نتیجہ پر پہنچیں قرآن اس کے خلاف ہو۔ بشرطیکہ وہ انکشاف حقیقت کی حد تک پہنچ چکا ہو۔ محض قیاس آرائی نہ ہو۔ انسانی انکشاف ہے کیا۔ یہی ناکہ فطرت کی ایک حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل تھی۔ انسانی کدو کاوش نے وہ پردہ اٹھا دیا۔ وہ حقیقت جیسی تھی سامنے آگئی۔ اسی کو انکشاف کہتے ہیں۔ ایٹر اس فضا میں موجود تھا۔ بجلی کی لہریں یہیں تڑپ رہی تھیں۔ لیکن پہلے وہ نگاہ سے اوجھل تھیں۔ اب بے نقاب **سائنس اور قرآن** ہو کر سامنے آگئیں۔ لیکن خدا وہ ہے جس نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ اگر یہ چھپی ہوئی ہوتی ہیں تو انسانوں کی نگاہوں سے چھپی ہوئی ہیں۔ خدا کی نگاہوں سے چھپی ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس لئے جہاں کہیں خدا ان کا ذکر کرے گا وہ تو ایسے ہی کرے گا جیسے کوئی اس چیز کی بابت کہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب موجود ہو۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسانی انکشافات کے نتائج اور قرآنِ کریم کا بیان باہم متضاد ہوں۔ جہاں کہیں تضاد ہو، سمجھ لیجئے کہ انسانی تحقیق میں ابھی غلطی ہے جسے وہ حقیقت سمجھ رہا ہے، قیاس آرائی ہے جب حقیقت حقیقت ہو کر سامنے آجائے گی تو وہ وہی ہوگی جو اس حقیقت کے پیدا کرنے والے نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے۔ اسی نظریہ ارتقاء کو لیجئے جسے دورِ حاضرہ کے انکشافات میں ایک معرکتہ الارارہ کا نامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ میں جو چیزیں بطور حقیقت کے معلوم ہو چکی ہیں جن کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود ہے اور جن کی روشنی میں اسلامی مفکرین مثلاً فارابی اور ابن مسکویہ نے دلیلیں اور ڈارون سے کہیں پہلے ان نظریوں کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ (نظریہ ارتقاء اور قرآنِ کریم ایک جداگانہ مبحث ہے جسے میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں وضاحت سے بیان کیا ہے)۔ لیکن یورپ کے حکماء اس نظریہ کے

تحت انسان کی سابقہ کڑیوں کی تحقیقات کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں اور انسان کو اس سلسلہ کی  
**انسان اور سلسلہ ارتقاء** آخری کڑی سمجھتے ہیں کہ اس کی موت کے ساتھ یہ سلسلہ ارتقاء  
 بھی ختم ہو جاتا ہے لیکن قرآن کریم اس حصہ زندگی کو محض ابتداء  
 قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ منزل تو ابھی شروع ہوئی ہے۔ انسان کی موت اس سلسلہ ارتقاء کا  
 کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اگلی کڑی کی ابتداء ہے۔ آپ دیکھتے کہ سلسلہ ارتقاء میں جمادات سے نباتات  
 اور نباتات سے حیوانات تک آتے آتے ایک نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگلی منزل میں بمقابلہ  
 پچھلی منزل کے ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو مجرد مادہ میں موجود نہ تھی۔ مادہ غیر شعوری شے ہے اس  
 میں تعقل و ادراک نہیں لیکن مٹی سے درخت اور درخت سے حیوان کی تدریجی ترقی میں یہ کیفیت  
 نظر آئے گی کہ جو چیز پہلی کڑی میں مفقود تھی، اگلی کڑیوں میں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ حیوانات  
 میں ایک خفیف سی حد تک عقل و شعور آجاتا ہے اور اس سے اگلی منزل یعنی انسان میں یہ خصوصیت  
 ابھر کر سطح پر آجاتی ہے۔ یعنی اس میں شعور و ادراک، جذبات و احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔  
 یہ وہ چیز ہے جو مادہ میں موجود نہ تھی۔ گویا سلسلہ ارتقاء کی ہر کڑی میں "مادیت" سے کسی  
 "غیر مادیت" کی طرف قدم اٹھتا ہے۔ وہ "خالی" سے کچھ "ذری" سا ہو جاتا ہے۔ ہر چند یہ "غیر مادی"  
 عنصر اسے ایسا ہی کہنا چاہیے کیونکہ اور کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتا، انسان میں آگر  
 نمایاں ہو گیا ہے لیکن بایں ہمہ یہ عنصر ابھی اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ لہذا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ  
 سلسلہ یہیں ختم ہو جائے۔ اس کا آگے بڑھنا ضروری ہے اور یہی آگے بڑھنے کی منزلیں ہیں جہاں  
 جا کر یورپ کے حکماء اور مسلم حکیم میں فرق شروع ہو جاتا ہے۔ حکیم مومن کے نزدیک حیات ایک  
 مسلسل شے ہے اور موت اس کا خاتمہ نہیں کر دیتی بلکہ شب تیرہ و تار کے بعد ایک نیا دن طلوع  
 کرتی ہے۔ مادی عنصر میں تو تاریکی ہی تاریکی ہے۔ یہ عقل و خرد، یہ شعور و ادراک کی چمک تو مادہ سے  
 آگے بڑھنے میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ لہذا یہ سلسلہ ارتقاء جتنا آگے بڑھتا جائے گا تیرگی و رخشندگی  
 میں تبدیل ہوتی جائے گی۔ وہ لوگ جن کے اس منزل میں اعمال صالح ہوں گے یعنی ایسے کام جو  
 اس میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں کہ وہ اس سے اگلی زندگی، اس سے نفیس و لطیف، اس سے  
 اعلیٰ و ارفع زندگی بسر کر سکے وہ اپنے ادپر کی منزل میں چلے جائیں گے جسے جنت کہتے ہیں جن کے

اعمال انہیں اصلح نہیں بنائیں گے وہ سلسلہ ارتقا کی اگلی منزل میں نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہیں روک دیتے جائیں گے۔ یہ جہنم کی زندگی ہوگی۔ لہذا "موجودہ زندگی تو انسانی خمیر کے آب و گل کی زندگی ہے۔ ذرا اسے سنور لینے دیجئے۔ پھر دیکھتے یہ کیا بنتا ہے۔" انسان کا مستقبل "یہ ہے وہ موضوع جو حضرت علامہ کے تمام کلام کا گویا نقطہ ناسک ہے۔ فرماتے ہیں۔

یکے در معنی آدم نگر از من چہ می پرسی      ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شوونے  
چنان موزوں شو ایں پیش پا افادہ مضمونے      کہ بزداں رادل از تاثیر اد پرنوں شوونے

اس نظام کائنات میں انسان کا درجہ کس قدر بلند ہے اس کے لئے اس داستان حقیقت کشا کو دیکھتے جو تخلیق آدم کے باب میں پہلے ہی پارہ میں تمثیلاً بیان کی گئی ہے۔ اس تمثیلی داستان میں آدم سے مراد کوئی خاص فرد نہیں۔ اس سے خود "آدمی" مراد ہے۔ یعنی وہ داستان خود آدمی کی داستان ہے جسے اس قصہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ آدم گویا نوع انسان کا نمائندہ ہے۔ فرشتوں سے کہا جاتا ہے کہ

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً. میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یعنی ایک ایسی صاحب اقتدار مخلوق جو زمین پر سابقہ مخلوق کی جانشین ہوگی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں جب اس بیوقوفی آب و گل کو دیکھتی ہیں تو اس میں خون کے پھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔ بارِ الہ! یہ فتنہ سامانیوں کا مجموعہ اور خلیفہ فی الارض! اس اعزاز کے مستحق تو کچھ ہم ہی نظر آتے ہیں کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ. ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں اور اپنے اختیار و ارادہ

سے کام لئے بغیر وہی کچھ کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔ خلاقِ فطرت کے

**قصہ آدم** | چہرے پر ایک حسین تبسم نے گلشنی کی اور فرمایا کہ إِنِّي آَعَلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ. میں جانتا ہوں یہ مضمون مکمل ہو کر کیا بننے والا ہے اور تم کیا ہو۔ لیکن اتنا کہہ کر فرشتوں کو خاموش نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کے ثبوت میں عظمتِ آدم کی ایک جھلک بھی دکھا دی اسے علم الاشیا۔ یعنی علم الفطرت عطا کیا گیا ہے اور فرشتوں سے پوچھا کہ تم بھی اس کی نسبت کچھ جانتے ہو۔ انہوں نے گردنیں جھکا دیں اور عرض کیا۔ نہ حضور! لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا. ہمیں تو اتنا ہی پتا ہے جتنا ہمیں سکھایا گیا ہے۔ فرمایا کہ اب بتاؤ کہ یہ ہمارے رازوں کا امین! یہ عظمتوں کا پتلا، اس قابل ہے یا نہیں کہ تم اس کے سامنے جھک جاؤ۔ اب سوائے اعترافِ حقیقت کے چارہ کیا تھا۔ وہ

جھکے اور بار بار جھکے۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ

کچا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند  
کچا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را

بالِ تجرید میں ہے۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

ذرا غور کیجئے اس فلسفہ پر فطرت کی ہر شے اس غرض سے پیدا کی گئی ہے کہ انسان اس سے کچھ کام لے یا وہ انسان کی کچھ خدمت بجالائے۔ ان اشیاء کا وجود انسان کی زندگی اور زندگی کی ضروریات کے لئے ہے۔ ہوا نہ رہے تو انسان بھی نہ رہے۔ پانی نہ رہے تو انسان نہ رہے۔ لیکن اگر روئے زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہے تو بھی سلسلہ کائنات اسی طرح جاری رہے گا۔ اس میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کا وجود اس نظام کائنات کے لئے نہیں۔ اس کی تخلیق سے یہ غرض نہیں کہ یہ اسی دنیا کا ہو کر رہ جائے۔ دنیا اس کی خاطر ہے۔ یہ دنیا کی خاطر نہیں۔ یہ اس سے کسی بلند و بالا مقصد کے لئے پیدا کیا گیا اور یہی چیز اسے نظام کائنات سے ممتاز کر دیتی ہے۔ لیکن یہ شرفِ اعتبار یہ امتیاز و خصوصیت محض ایک انسان کے گھر میں پیدا ہو جانے سے ہی نہیں حاصل ہو جاتی۔ اس کے لئے ایک "یقین کامل" اور "عمل پہم" کی ضرورت ہے۔ جب کسی قوم میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے تو وہ "خیر امت" بن جاتی ہے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس خیر امت کا مقام کس قدر بلند ہوگا۔ اس جماعت کے بھولے ہوئے فرد سے خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

اپنی اصلیت سے ہوا گاہ اے غافل کہ تو  
قطر ہے لیکن مثالِ بحر بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ بیچ مقداری ہے تو  
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفلک  
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سماں بھی ہے

یہی وہ ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے کہ

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا ۚ وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (۳/۱۳۹)

مت گھبراؤ، مت خوف کھاؤ، تم دنیا میں سب سے بلند ہو بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ۔

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

خدا نے تم پر کادستِ قدرت تو زباں تو ہے  
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلمان کی  
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکان فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے  
 تیری فطرت میں ہے ممکناتِ زندگانی کی جہاں کے جوہرِ مضمحل گویا امتحانِ تو ہے  
 وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ  
 وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۝ (۲/۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین قوم بنایا کہ تم تمام نوعِ انسانی کے (اعمال کے) نگران ہو  
 اور تمہارے (اعمال کے) نگران رسول ہوں۔

مسلم کی توشان یہ ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کے اعمال کا جائزہ لیتا رہے کہ کون ٹھیک کام کر رہا ہے اور کون  
 راستے سے بھٹک گیا ہے۔ اسے تمام اقوامِ عالم کا نگرانِ کار (SUPERVISOR) بنا  
**مقامِ مومن** کر بھیجا گیا ہے اور مرکزِ ملت اس کے اعمال کا نگران۔ جب مومن کے علومِ تربیت کی یہ  
 شان ہو تو پھر دنیاوی حکومت و ثروت اس کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے۔ یہ تو بنی ہی اس کے لئے ہے۔ یہ  
 تو اس کی وراثت ہے کسی اور کے پاس جا ہی نہیں سکتی۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے  
 اس فقط کو دیکھئے کسی اور کا اس میں حصہ نہیں۔ یہ بطورِ حق کے اس پر قابض ہوگا کوئی اور اسے اس سے چھین  
 نہیں سکتا۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے اور کس قدر سچا فیصلہ!

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا  
 عِبَادِي الصَّالِحُونَ ۝ (۲۱/۱۰۵)

اور یقیناً ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ بے شک زمین ہمارے صالح بندوں  
 کی میراث ہے۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے  
 اور یہ اس لئے کہ مومن کی برابری دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ تو اعلیٰ ہے سب سے بلند و بالاتر۔

مومن بالائے ہر بالاترے غیرتِ اُوبرتا بدہمسرے

یہ تو تھا اس دنیا کے متعلق۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ شانِ کریم کے نزدیک یہ زندگی تو

حیاتِ انسانی کا اولین گہوارہ ہے۔ عہدِ طفولیت ہے۔ اس نے ابھی جوان ہونا ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم کے نزدیک یہ زندگی بایں ہمہ رعنائی و زیبائی اصل معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق ہی نہیں۔ "زندگی" تو اس کے بعد آنے والی ہے۔

## تسلسلِ حیات

وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَ لَعِبٌ ۗ وَإِنَّ الدَّارَ  
الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ ۗ (۲۹/۶۴)

یہ زندگی تو محض کھیلنے کودنے کی زندگی ہے۔ بچپن کا زمانہ ہے۔ زندگی تو درحقیقت اس کے بعد کی منزل ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ زندگی ایک مسلسل شے کا نام ہے۔ جہاں کوئی شے رُک جائے وہ اس کی موت ہوتی ہے۔

زندگانی از خرامِ پیہم است      برگ و ساز ہستی موجِ ازم است

موجودہ دورِ حیات کے لہو و لعب ہونے کے متعلق ارشاد ہے۔

زمیں خاکِ درمیخانہ ما      فلک یک گردشِ پیمانہ ما

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است      جہاں دیباچہ افسانہ ما

ذرا اس "خاکِ درمیخانہ" اور "گردشِ یک پیمانہ" کے ٹکڑوں کو دیکھئے اور پھر سامنے لائیں آیتِ مذکورہ کے اس حصہ کو کہ "وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَ لَعِبٌ" اور اس "دیباچہ افسانہ ما" کے ساتھ "وَ إِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ" کو۔ یہ موجودہ زندگی تو محض دیباچہ ہے۔ اصل کتاب ابھی شروع ہونے والی ہے۔

ہر چند بات لمبی ہو رہی ہے لیکن جی نہیں چاہتا ہے کہ ایک چیز سامنے آجاتے اور اسے یوں ہی چھوڑ کر آگے گزر جائیں۔ "حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است" کے لئے مجھے نظریہ ارتقار بیان کرنا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، یہ ایک الگ موضوع ہے جس کا ضمناً بیان کرنا دشوار ہے۔ یہاں صرف حضرت علامہ کے اس مصرعہ کے متعلق کچھ اشارات ضروری ہیں۔ قرآنِ کریم میں ارتقار کے ضمن میں یہ بیان ہوا

لے دنیا اور آخرت کی قرآنی اصطلاحات کے مفہوم کے لئے "اسبابِ زوالِ امت" دیکھئے۔

ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تدبیر (PLAN) کرتا ہے۔ پھر اس تدبیر کو پختگی کی حد تک پہنچانے کے لئے اسے مختلف مراحل طے کراتا ہے۔ قطرہ کو گہر ہونے تک گونا گوں مقامات میں سے گزرنا ہوتا ہے۔ ایک ایک مقام اور ایک ایک منزل کا نام یوم ہے۔ لیکن یہ ایام ہمارے گردشِ لیل و نہار کے ایام نہیں بلکہ ان کا طول و عرض ہمارے حساب سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

يَذَبُّ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ  
مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ بِمَقَامٍ تَعَدُّونَ ۝ (۳۲/۵)

وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیر امور کرتا ہے پھر وہ امر (پختگی اختیار کر کے) اس کی طرف بلند ہوتا ہے ایک دن میں جس کی مقدار انسانوں کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ہزار سال ہو سکتی ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ بعض ایام پچاس پچاس ہزار سال کے بھی ہوتے ہیں۔ اسی کثرۃ ارض کو دیکھتے۔ یہ اپنے اولین بیوٹی سے الگ ہونے کے بعد جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے، کتنے عرصہ دراز میں اس قابل ہوئی ہوگی کہ اس پر کوئی ذی روح آباد ہو سکے۔ اسی طرح انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کتنی منازل طے کرنی ہوں گی اور اس میں کتنا وقت صرف ہوگا۔ اب پھر دیکھتے کہ

حدیث سوز و ساز ما دراز است

کس قدر سچی حقیقت ہے اور کس قدر لطیف پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ اس کو دوسری جگہ ذرا زیادہ شوخی سے لکھتے ہیں کہ

باغ بہشت سے مجھے حکم سفیر دیا تھا کیوں کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر  
ہاں تو کہنا یہ تھا کہ موت زندگی کو ختم کرنے والی شے نہیں بلکہ یہ تو ایک نئی زندگی کا دروازہ ہے۔

چشم بکشتائے اگر چشم تو صاحب نظر است

زندگی درپے تعمیر جہانِ دگر است

اسی عنوان پر دو ایک شعر اور بھی دیکھتے جاتے۔ کبھی شعروں کو دیکھتے اور کبھی اپنے قلب و دماغ کو کہ ایک ہی ثانیہ میں ان اشعار نے انہیں علم و ادراک کی کن بلندیوں اور کیفیت و نشاط کی کن جنتوں میں پہنچا دیا۔ ایسے شعر کہہ دینا درحقیقت فیضان ہے اس کتابِ مہین کی ضیا پاشیوں کا جس کا دعویٰ ہے کہ آؤ تمام نوع انسانی مل کر اس کی ایک سورت کی مثل پیش کر کے دکھاؤ۔ ایسے شجر طیب کے برگ و بار بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ فرماتے



ہیں۔

خاکِ ماخیزو کہ سازد آسمانے دیگرے ذرّۂ ناخیزو تمحیرِ بیابانے نگر

پیامِ مشرق کے دو شعر ہیں۔

زندگی جوئے رواں است رواں خواہد بود  
شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گر دیدیم

ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود  
صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گر دیدیم

اس آخری شعر کو ملاحظہ فرمائیے۔ شعلہ کی شکست اس لئے نہیں ہوئی کہ وہ خاک تر بن کر رہ جائے بلکہ اس لئے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ ٹپ، چمک، حرارت پیدا ہو جاتے۔ انسانی ہیروئی میں ہر چند "نورانیت" کا عنصر موجود ہے لیکن ابھی "مادیت" کا عنصر زیادہ غالب ہے اس لئے حقائقِ اشیاء پر ظلمتوں کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس ہیروئی کی شکست اس لئے ہوگی کہ اس کے بعد شعلہ کی حرارت میں سمٹ کر شرر بن جائیں اور وہ اس آتشِ انِ خاکی سے اڑ کر فضا تے نور کی ان دسعتوں میں جا پہنچے جن کے لئے لاشرقیہ و لاغربیہ آیا ہے جو زمان و مکان (TIME AND SPACE) کے موجودہ تصورات کے دائرہ سے باہر ہیں۔ یعنی ادھر سکر ات موت کی چکی آنکھ بند کرے اور ادھر نورانی ملائکہ استقبال کے لئے آجائیں کہ دیدہ و دل فرس راہ! یہ نورانی وادیاں! یہ دل و نگاہ کو سکون و اطمینان کی ٹھنڈک پہنچانے والی حسین جنتیں آپ کے انتظار میں ہیں۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّوهُمْ الْمَلٰئِكَةُ طَيِّبِينَ ۚ يَقُولُونَ سَلٰمٌ عَلٰیكُمْ

اُدْخِلُوْا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۳۲) ۵

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ملائکہ نہایت آسودگی کی حالت میں وفات دیتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم پر سلامتی و رحمت ہو۔ آیت جنت میں داخل ہو جائیے بوجہ ان اعمال کے جو تم نے کئے ہیں۔

اس آیت کو سامنے رکھتے اور پھر اس شعر کو پڑھئے کہ

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گر دیدیم  
صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گر دیدیم

پھر جنت کے متعلق جو اس آیت میں اور دیگر متعدد آیات میں آیا ہے کہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یعنی جنت اعمال کی جزا ہے۔ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ

آں بہنتے کہ خدائے تو بخشد ہمہ ہیج تاجزائے عمل نُست جنان چیزے ہست  
زندگی کے تسلسل کے متعلق غزل کا ایک شعر سنئے اور دیکھئے کہ غزل کی رنگینی باقی رکھتے ہوئے بھی حقائق کیسے بیان  
کئے جاسکتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخردل بن جائے      جواب مشکل ہے یارب پھر وہی شکل نہ بن جائے  
اس غزل کا دوسرا شعر ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں      کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مسہِ کامل نہ بن جائے  
اس شعر میں انسان (آدم) کے بہبوط و صعود کی حقیقت کس قدر دلآویز پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ تخلیقِ آدم  
کا قصہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ اس کے بعد بہبوطِ آدم کا ذکر ہے۔ بہبوط کے معنی نیچے گرنے کے ہیں۔ آدم کے  
جنت سے نکلنے کے لئے قرآن کریم نے خروج (نکلنا) کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ بہبود (نیچے گرنے) کا لفظ  
استعمال کیا ہے۔ اس بہبوط کی رعایت سے آدم کو ٹوٹا ہوا تارا کہنا کس قدر موزوں ہے۔ آدم نے اپنے بہبوط  
کا جو اثر بیان کیا ہے وہ یہ تھا کہ اے بارالہا! اگر ہماری توبہ قبول نہ ہوئی، اگر ہمیں اپنی حالت میں نہ پہنچایا گیا  
تو لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ اس بہبوط کے بعد  
ان تمام ارتقائی منازل طے کر کے پھر ایسا عروج حاصل کرنا کہ تارا مسہِ کامل بن جائے۔ اس کی عظمتیں اور  
رفعتیں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائیں۔ یہ ہے وہ راز جو ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ قرآن کریم میں ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ  
سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ  
غَيْرٌ مَمْنُونٍ (۹۵-۹۶)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین بیست میں پیدا کیا۔ پھر اسے (اس کے اعمال کی بدولت)  
نچلے درجہ میں لوٹا دیا مگر سولے ان کے جنہوں نے ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ کئے۔  
پس ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے۔

انسان میں ایمان و عملِ صالح پیدا ہونے دیکھتے پھر دیکھتے کہ یہ شہباز کن بلندیوں پر اڑتا ہے ایسی فضاؤں میں  
جو خود نا آشنا ہیں (غیر ممنون) اسی پرواز کی پہلی منزل ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں۔  
برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد      این مشیتِ خدا کے را انجم بسجود آمد

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہی فرق ہے یورپ کے نظریہ ارتقار اور ایک مسلم کے نظریہ عروج میں۔ یورپ کا مادہ پرست انسان کی پرواز اس دنیا یا زیادہ سے زیادہ کسی قریبی ستارے مثلاً مریخ وغیرہ تک سمجھتا ہے اور وہ بھی محض جسمانی پرواز۔ لیکن قرآن کریم انسان کو بہت اونچا لے جاتا ہے

كشَجْرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ. ایسے مبارک درخت کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جس کی شاخیں آسمان میں جھولے جھول رہی ہوں۔ اسی لئے حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن  
اس چیز کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔  
قدم اٹھایہ مقام انتہائے راہ نہیں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں  
تہی زندگی سے نہیں یہ فضا میں  
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں  
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں  
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں  
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں  
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں  
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا

ارتقائی منازل کو "عشق کے امتحاں" کہنا خشک فلسفہ کو کس قدر شیریں بنا دیتا ہے۔ دوسرے شعر میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ یہ بلندیوں کی فضائیں جنہیں قرآنی اصطلاح میں سموات کہا جاتا ہے آبادی سے خالی نہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا  
سُورَةُ الْاَنْۢبِيَاءِ ط (۲۹/۲۲)

اللہ کی نشانیوں میں سے یہ (بھی) ہے کہ اس نے زمین و آسمان، پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا اور ان دونوں میں جو جاندار پھیلا دیئے، وہ بھی۔

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ان آباد فضاؤں کو کارواں کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا سُورَةَ الْاَنْۢبِيَاءِ ط (۲۹/۲۲) اور ہم نے تمہارے اوپر متعدد درگزر بناتے۔ یہ رگزر کاروانوں ہی کے لئے تو ہیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کارواں درکارواں، جھوم کون کونسی ارتقائی منازل طے کرتے

پھر رہے ہیں اور عشق کی کون کون سی وادیوں میں سرگرداں ہیں۔ پھر چونکہ یہ تمام آبادیاں ایک جوئے رواں کی طرح ہر وقت مصروفِ خرام ہیں۔ قطع منازل کر رہی ہیں۔ اس لئے ان کو کارواں کہنا کیسا حسین انداز ہے۔ شعر کو جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ انہی جذبات سے اس میں دکھشی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب شعر میں حقائق بیان کئے جائیں یا اس کا انداز مصلحانہ اور پیامی ہو جائے تو پھر اس میں بالعموم شعریت باقی نہیں رہتی۔ پھر یا تو وہ شعر اس انداز کا ہو جاتا ہے کہ ۷

اے شمع تیری عمرِ طبعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اے رو کر گزار دے

یا اس انداز کا کہ ۷

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے  
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں بُرا کہنے سے تو اسکے بُرا مانتا ہے

اور ایک ذوق ہی پر کیا موقوف ہے۔ بڑے بڑے اچھے شعر کہنے والے جب تبیانِ حقائق یا مصلحانہ انداز میں کچھ کہتے ہیں تو شعر بے جان ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ خصوصیت حضرت علامہ ہی کے حصہ میں آئی ہے کہ حقائق اور حقائق بھی اس درجہ دقیق بیان کئے جاتے ہیں اور شعر کے حُسن میں بھی کوئی کمی نہیں آتی۔ ذَلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَّشَاءُ۔ ستاروں کی دنیا کے متعلق زبورِ عجم میں فرماتے ہیں۔

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست

کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است

زندگی، مسلسل خرام کا نام ہے۔ چلتے جانا، بڑھتے جانا، بڑھتے ہی چلے جانا کہ

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیاتِ ذوقِ سفکے سوا کچھ اور نہیں

جسے مقام سمجھا جاتا ہے وہ مقام نہیں۔ جسے منزل کہا جاتا ہے وہ منزل نہیں۔ یوں ہی ذرا ستانے، دم لینے کے لئے گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ کارواں کے دو پہر کاٹنے کے لئے نخلستان ہے۔ وہ جنت

کہ جسے بالعموم منزل مقصود سمجھا جاتا ہے، راستہ کی خوشگوار واوی ہے کہ جنت میں پہنچ کر بھی اہل جنت کی یہ کیفیت ہوگی کہ

يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ (۵۷/۱۲)

ان کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں طرف چلتا ہوگا۔

یہ نور، پیشانی کی روشنی، یہ سرچ لائٹ اگلی منزل کا راستہ دکھانے کے لئے ہوگی وہ راستہ جس کے متعلق ارشاد ہے کہ جنت میں پہنچ کر بھی دَهْدُ ذَا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِيْدِ۔ ان کی ایک پسندیدہ راستہ کی طرف رہنمائی کی جائے گی (۲۲/۲۲)۔ اس لئے جنت بھی مقام نہیں، راہ گذر ہے۔ وہاں سے بھی انسان کو آگے بڑھ جانا ہے۔

اگر عنانِ توجہ بریل و حور می گیند کرشمہ بردلِ شاہ ریز و دلبرانہ گذر  
لیکن بایں ہمہ انسان "لامکان" نہیں۔ ہر ایک مقام سے آگے ہی سہی لیکن مقام اس کا ضرور ہے۔ وہ مقام کیا ہے؟ وہ منزل مقصود کونسی ہے؟ یہ راز ہے جسے کھول کر بیان نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اس کی آج ضرورت تھی۔ آج تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کے بعد اگلی منزل کون سی ہے۔ سو اس کی تفصیل شرح و بسط سے قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس منتہی کے متعلق تو سرِ دست اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وَ اِلٰی رَبِّكَ مُنْتَهٰی۔ اس کا منتہی تیرے رب کی طرف ہے۔

شعلۂ درگیر زو بر نفس و خاشاک من مرشد روی کہ گفت منزل با کبریاست  
لیکن یہاں پہنچ کر حضرت علامہ "واصل بالحق" ہونے کے عقیدہ کا اتباع نہیں کرتے کہ قرآن کریم کی رو سے انسان کے خدائے واحد کی ذات میں جذب ہو جانے کے عقیدہ کی سند نہیں ملتی۔ لیکن حضرت علامہ اس عقیدہ کے اختلاف میں بھی ایک شانِ انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں اور اسے انسان کی خودی کے محکم بالذات ہونے کے منافی سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کی ذات میں گم ہو جائے۔ ان کے نزدیک عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا نہیں بلکہ تہ دریا گہزن کر بیٹھ جانا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

چناں با ذات حق خلوت گزینی ترا او بیند و اورا تو بینی

بخوز محکم گزار اندر حضورش مشونا پید اندر ز بحر نورش

"ترا او بیند" تو ہر وقت کا معاملہ ہے وہ کون سا لمحہ ہے جب خدا انسان کو نہیں دیکھتا۔ لیکن "اورا تو بینی" کامت اس منزل سے آگے آتا ہے۔ موجودہ مقام میں تو ایک اولوالعزم پیغمبر نے جب یہ آرزو کی کہ "رَبِّ اَرْزِنِي" تو جواب ملا کہ "لَنْ اَسْرَانِي" (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا) لیکن اس سے اگلی منزل میں مومنین کی یہ کیفیت ہوگی کہ

وَجُوهٌُ يُّوْمِعِي نَاظِرَةً اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةً ۝ ۲۳-۲۴

بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

اب خدا بندے کو دیکھ رہا ہے اس وقت بندہ بھی خدا کو دیکھے گا کہ

عبد و مولا اور کمین یک دگر ہر دو بے تاب انداز ذوقِ نظر  
زندگی ہر جا کہ باشد جستجو است حل نشد این نکتہ من صیدم کہ است

اگر ایک طرف انسان کی تڑپ اور تجسس کا یہ عالم ہے کہ اِلٰی رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ اپنے رب کی طرف رواں دواں جائیں گے تو دوسری طرف یہ کیفیت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُورٍ رَبِّهَا۔ زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ وَ جَاءَ رَبُّكَ وَ الْمَلٰٓئِكُ صَفًّا وَ صَفًّا وَ تَبٰرَكَ رَبُّكَ وَ تَبٰرَكَ رَبُّكَ وَ تَبٰرَكَ رَبُّكَ۔ اور فرشتے قطار اندر قطار آئیں گے کہ

ہر دو بے تاب انداز ذوقِ نظر

لیکن یہ تمام مراحل طے کس طرح ہوں گے۔ یہ ”محکم خودی“ حاصل کیسے ہوگی۔ یہ اس دنیا میں ایشیا آءِ عَلٰی الْكُفَّارِ ہونا یعنی ایسا سخت ہو جانا کہ کوئی اسے مضم نہ کر سکے۔ کوئی اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ یہ کیسے ہوگا! اس خاک کے تودے میں فولادی جوہر کیونکر پیدا ہوں گے۔ یہ نازک سا شیشہ اپنے اندر ایسی سختی کیسے پیدا کرے گا کہ اس کا ”زجاج حریف سنگ“ ہو جاتے۔ اس کے لئے رموز و اسرار میں پورا لائحہ عمل مرتب کر کے دیا گیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن ان سب کا حاصل ایک نکتہ ہے اور یہی نکتہ دراصل کلامِ اقبال کا محور ہے۔ مرکز ہے، محیط ہے، سب کچھ ہے، یہ نکتہ یہ ہے کہ

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو فردغ دیدہ افلاک ہے تو  
ترے صید زبوں افرشتہ دحور کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

بس یہ ہے راز ایک مومن کی پختگی کا۔ اس کی خودی کے استحکام کا کہ شاہین شہ لولاک ہے تو۔ تو ان مقدس ہاتھوں کا پروردہ ہے جس کی شان میں آیا ہے کہ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ تو اس ذاتِ گرامی کا شاہین ہے جو دانائے سبل ”ختم رسل“ ہے۔ جو معراج انسانیت کا مظہرِ کامل ہے جب تو ایسی رفیع الشان بارگاہ کا شاہین ہے تو تیرے عرشِ آشیاں ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ لہذا یہ

اطاعت مرکز قرآن

تمام فضائیں اور فضاؤں کی پہنائیاں یہ سب پستیاں اور تمام بلندیاں یہ ارض و سماوات یہ تمام کائنات اور اس کی قیود نا آشنا

وسعتیں اس شاہین لولاک کے بازوؤں کے نیچے کیوں نہ ہوں۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت عشق کے مرتبہ تک نہ پہنچ چکی ہو کہ رسول کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت قرآن کی اطاعت سے میسر آتی ہے کہ حضور قرآن ہی کی اطاعت سکھانے کے لئے تشریف لائے تھے۔

قسم ہے تیرے پروردگار کی ان میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے ان تمام معاملات میں جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں اے رسول! تمہیں اپنا حکم تسلیم نہ کر لیں پھر تمہارے فیصلوں پر دل میں کوئی تنگی اور گرانی محسوس نہ کریں۔ بلکہ ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

(۴/۶۵)

اس نکتہ کے اندر امت کی مرکزیت، امیر کی اطاعت، وحدت افکار و عمل اور ان کے جیتے جاگتے نتائج یعنی تمکن فی الارض، شان و شوکت، حکومت و سطوت، زمین پر آسمانی بادشاہت، کا قیام، سرفرازیوں اور بندیاں، کامیابیاں اور کامرانیاں اور اس کے بعد حیاتِ اُخروی میں، بعد کی منزل میں، آگے بڑھنے کی قوتیں، مدارجِ عالیہ، یہ سب کچھ اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے ضمناً اس بحث کو یہاں چھوڑ دینا پڑا اور نہ یہ تو وہ عنوان ہے جس پر کلامِ اقبال سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اقبال کی تمام شاعری اور شاعری کا تمام سوز و گداز رہیں منت ہے مجتہد رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جذبہ اطاعت کا۔ اسی ذاتِ گرامی کی شعلہ ریز مجتہد ہے جس نے اقبال کو اقبال بنا دیا اور نہ یہ کبھی کہیں میر شاعرہ ہوا کرتے۔ جذبہ اطاعت رسول نے (جسے وہ عشق کہتے ہیں) اقبال کو اس انداز سے گداز کر رکھا ہے کہ اس کے برہم بستی کے کسی تار کو چھری سے اس میں سے نغمہ وہی پیدا ہوتا ہے۔ اسی چیز نے ان کے سامنے قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا اور شرآنی حقائق نے ان کے کلام میں دم میسا اور ضربِ کلیم کے اعجاز پیدا کر دیئے۔ فطرت کی گرم گستری نے وہ دماغ عطا کیا تھا جو

لے نظامِ اسلامی کی رُو سے کس طرح امام متفق علیہ (مرکزیت) کی اطاعت، اطاعتِ خدا اور رسول کے مرادف ہو جاتی ہے، قرآن کریم میں بہ صراحت اس کی تشریح موجود ہے۔ اسی جذبہ اطاعت کے اندر قوموں کی زندگی کا راز ہے اور اس کو بھلا دینے سے مسلمانوں کی آج یہ حالت ہو رہی ہے۔ اطاعت جب خوف و ترہیب سے بلند اور مزد و معاوضہ سے بے نیاز ہو جائے تو عشق بن جاتی ہے۔ ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے۔ اسلامی نظام۔

یکسر علم و حکمت تھا۔ محبت رسول کی موبہبتِ عظمیٰ سے وہ قلب منور مل گیا جسے صہبائے ایمان کا مقدس آبگینہ کہنا چاہیے۔ ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی جو اشیا کی حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے، جو گل و خار کے نظر فریب امتیاز سے ہٹ کر شاخ گل کے اندر جا کر مشاہدہ کر لے کہ درونِ اُونہ گل باشد نہ خار است۔ اسی نگہ حقیقت شناس کا نام ہے اقبال یعنی قلب و دماغ کا مجموعہ، ایمان و حکمت کا فشرودہ، زیر کی و عشق کا عصا، اویس و بوعلی کا مرکب، مجتہد رومی و رازی کا مشترکہ شاہکار، مشرق و مغرب کا مقام اتصال۔

غریباں رازیر کی راز حیات      شرقیاں راعشق راز کائنات  
زیر کی از عشق گرد و حق شناس      کار عشق از زیر کی حکم اساس  
خیز و نقش عالم دیگر بن      عشق را بازیر کی آمیزندہ

اور یہی وہ امتزاجی کیفیت ہے جو قرآن کریم ایک مومن کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مظاہرِ فطرت کی گونا گوں نیرنگیوں کے بعد فرمایا۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْخِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ  
لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ  
جُنُوبِهِمْ ..... ۵ (۱۹۰-۱۹۱/۳)

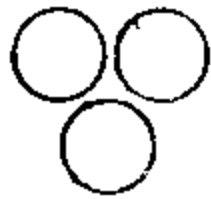
بیشک (ان مظاہرِ فطرت) کے اندر صاحبانِ عقل و خرد کے لئے آیات ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔

یہ عقل و بصیرت کے ساتھ خدا کو یاد کرنے والے وہ مومنین ہیں جنہیں نوعِ انسان کے لئے نمونہ بنایا گیا ہے۔ اور پھر سبحانِ فطرت کا کرم بالائے کرم کہ اس نگہ حقیقت بین کو اظہارِ جذبات کے لئے ذریعہ بھی ایسا حسین و دلکش عطا کر دیا کہ جو دیکھے کھنچا چلا آئے۔ بشرطیکہ وہ کہیں سے بوجہل و بولہب کی ہی آنکھیں نہ مانگ لایا ہو۔ اور پھر تماشہ یہ کہ یہ ملکوتی کام لیا اس شاعری سے جس کے علمبردار ابھی تک اس "تحقیقِ انیق" سے ہی فارغ نہیں ہو سکے کہ بیل مذکور ہے یا موٹا۔ سچ ہے جب خدا چاہے تو ایک خشک لکڑی سے وہ کام لے لے کہ وہ کذب و باطل کے بڑے بڑے اژدہوں کو نگل جائے۔ یہ اور بات ہے کہ قومِ اقبال کو بھی ایسی ہی ملی ہو جو قومِ موسیٰ کی طرح کہہ دے فَاذْهَبْ أَنْتَ وَ رَبِّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ۔ جا تو اور تیرا رب لڑو جا کر۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں جب فتح



ہو جائے تو آواز دے دینا۔ بایں ہمہ یقین مانتے کہ جس طرح قرآن کریم نے عرب کی شاعری کے دورِ جاہلیت کو ختم کر کے اسی قوم سے ایک ایسا خمیر تیار کر دیا تھا کہ وہ جس آٹے میں جا کر ملے اس میں بھی خمیر کی کیفیت پیدا کر دے۔ اقبال نے بھی مشکوٰۃ قرآن کی روشنی میں ”عجمی شاعری“ کے ”دورِ جاہلیت“ کو ختم کر کے ان کے افیونی اعصاب میں ایسا خونِ زندگی دوڑا دیا ہے کہ وہ دن دُور نہیں جب یہ زمین بدل جائے گی یہ آسمان بدل جائے گا اور مسلمان پھر یہ کہنے کے قابل ہو جائے گا کہ

زمین از گوکبِ تفتدیرِ ما گردوں شود رونے  
فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود رونے



# تلمیحاتِ اقبال

(قرآن کریم سے)

ریڈیائی تقریر۔۔۔۔۔ جنوری ۱۹۴۹ء

کسی مفکر کے پیغام کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے فکر کے سرچشمہ کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ اس لئے کہ جب تک اس کی اصل حقیقت معلوم نہ ہو جاتے جس سے اس کے فکر کی شاخیں چھوٹی ہیں۔ اس کے برگ و بار کی ماہیت اور اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اکثر مفکرین اپنی اساس فکر کو اس طرح غیر معین اور مبہم چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے پیغام پر غور و فکر کرنے والوں کو اس اصل و اساس کے تعین میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اور ان کے ناقدین و شارحین کی قیاسی سراغ رسانیوں سے یہ مہم پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد ان کے پیغام پر ان قیاس آرائیوں کے اتنے دبیز پردے پڑ جاتے ہیں کہ حقیقت نگاہوں سے یکسر گم ہو جاتی ہے اور لوگ جسے ان مفکرین کا پیغام سمجھتے ہیں وہ ان کے ناقدین و شارحین کی خیال آفرینیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس باب میں علامہ اقبال کی ہستی ممتاز نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنے فکر کے سرچشمہ اور اپنے پیغام کی اساس کو اس طرح واضح اور غیر مبہم طور پر بیان کر دیا ہے کہ اس میں کسی ظن و تخمین اور قیاس و گمان کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ بایں ہمہ اسے ہماری لذت نکات آفرینی کہتے یا ذوقِ اعجب و پسندی کہ پیغامِ اقبال سے دلچسپی رکھنے والے گزشتہ دس برس سے اپنی تحقیق و جستجو میں سرگرداں و حیراں پھر رہے ہیں کہ علامہ اقبال کے فکر کے ماخذ کیا تھے اور انہوں نے کن افکار و خیالات سے متاثر ہو کر

اپنا پیغام متعین کیا تھا۔ انہی قیاس آرائیوں کا نتیجہ ہے کہ کوئی ان کے فکر کو کانٹ کے فلسفہ کا رہین منت بتاتا ہے اور کوئی نیٹسے کے خیالات کا پر تو کہیں انہیں برگسان کا آئینہ دار کہا جاتا ہے اور کہیں ہیگل کا خوشہ چیں۔ اور بہت کم ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ جب انہوں نے خود واضح طور پر بتا دیا ہے کہ ان کی فکر کا ماخذ کیا ہے اور وہ کن حقائق سے متاثر ہوئے ہیں تو پھر اس کا دیش بے جا اور کاہش لا حاصل سے مقصود کیا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ علامہ مرحوم نے مشرقی و مغربی علوم قدیمہ و جدیدہ کا بدقت نظر مطالعہ کیا تھا اور چونکہ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا اس لئے انہوں نے مغربی مفکرین کے افکار و تصورات پر گہری نظر ڈالی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے فکر کی اساس ان مفکرین کے تصورات و نظریات پر تھی۔ ان کی فکر کی اساس ایک محکم اور مستقل حقیقت پر تھی جو نہ مشرق سے متاثر ہوئی ہے نہ مغرب سے۔ وہ اس کی تائید و تشریح میں مشرق و مغرب کے خیالات و تصورات کو استنباداً پیش کرتے تھے۔ لیکن اسے ان کے قیاسات و مزعومات سے ملوث نہیں ہونے دیتے تھے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ جس مقام سے وہ بات کر رہے ہیں وہ حکمت و فلسفہ کی حد سے ماوراء ہے۔

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے وراثے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیر  
عصر حاضر کے علوم و فنون کے متعلق انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا کہ ان میں جو باتیں انہوں نے اس حقیقت  
ثابتہ کے مطابق پائی ہیں جس پر ان کے فکر کی اساس تھی انہیں تائیداً لے لیا گیا ہے اور جو چیزیں خلاف  
حقیقت ہیں ان کے فریب کو بے نقاب کر دیا گیا ہے۔

طلسمِ علم حاضر شکستم      ربودم دانہ و دامش شکستم  
خدا دانہ کہ مانند برہم      بہ نار اوچہ بے پروا شکستم

غور کیجئے جو شخص دورِ حاضر کی علم و حکمت کو آتشِ نمرود قرار دے رہا ہو اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے اپنی فکر کی اساس اس علم و حکمت پر رکھی تھی اس پر کتنا بڑا بہتان ہے۔ علومِ جدیدہ ہی نہیں، علومِ قدیمہ کے نظریات کے متعلق بھی ان کا یہی مسلک تھا۔ وہ ان غلط نظریاتِ زندگی اور تصوراتِ حیات کو "ملا و صوفی" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں کہ

بیاساتی بگرداں ستانگیں را      بیفشاں برد و گیتی استیں را  
حقیقت را بہ رسد کاش کردند      کہ ملاکم شناسد رمزدیں را

جدید و قدیم دونوں کے متعلق

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد  
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب علامہ اقبالؒ نے اپنی فکر کو کہیں سے مانگے ہوئے افکار و تخیلات سے متاثر  
نہیں ہونے دیا تو وہ کون سی حقیقت ثابتہ تھی جس پر اس فکر کی اساس تھی جیسا کہ میں نے شروع میں کہا  
ہے انہوں نے اسے ایسے واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ اس کے متعلق کسی ظن و قیاس یا تاویل و تعبیر  
کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ ان کا پیغام سب سے پہلے منضبط صورت میں اسرار و رموز میں ہمارے سامنے  
آتا ہے جو ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں انہوں نے اس ذات اقدس و اعظم  
(علیہ التیمتہ والسلام) کی بارگاہ میں ایک التجا پیش کی ہے جو ان کے عشق کی منتہی، ان کی آرزوؤں کی محور  
اور ان کی تمناؤں کی مرکز تھی۔ اس دعا میں وہ کہتے ہیں کہ

گر دلم آیتنہ بے جوہر است      در بحر فم غیرتُ شرآن مضمراست  
یعنی اگر میرے پیغام میں قرآن کے سوا کچھ بھی اور ہے تو اے ختمِ رسل، دانائے سبیل،  
پردہ ناموسِ فکر مچاک کُن      ایں نیاباں را ز فارم پاک کن  
یہیں تک نہیں بلکہ

روزِ محشر خوار و رسوا کُن مرا      بے نصیب از بوسہٴ پاکن مرا  
جن کی نگاہیں قلبِ اقبالؒ پر ہیں وہ اس شدتِ احساس کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کے ماتحت انہوں نے  
اپنے حق میں اتنی بڑی تعزیر روار کھی ہے۔ اس سے آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ  
گردِ اسرارِ قرآن سفتام      با مسلماناں اگر حق گفتہ ام  
اگر میرا پیغام قرآن ہی کا ترجمان ہے تو

عرض کن پیشِ خدائے عزوجل      عشق من گرد ہم آغوشِ عمل  
میں نہیں سمجھتا کہ ایسے کھلے کھلے الفاظ کے بعد اس کی گنجائش بھی باقی رہ جاتی ہے کہ تحقیق کی جائے  
کہ اقبالؒ کے فکر کا سرچشمہ کیا تھا اور ان کی نگاہیں کس آفتابِ حقیقت سے مستنیر تھیں۔ میرے نزدیک  
اقبالؒ کی عظمت و عقیدت اسی بنا پر ہے کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا شرآن سے سمجھا اور جو کچھ سمجھایا  
شرآن سے سمجھایا۔ ان کی مے سخن براہِ راست حکمہٴ حجاز سے سر بہر آ بگینوں میں آیا کرتی تھی اور

اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ

از تا کہ بادہ گیسوم و در ساغر افکنم

اقبال کے پیغام کو سامنے رکھتے اور پھر دیکھتے کہ اس میں جہاں جہاں قرآن کا ذکر آتا ہے وہ کس جذب و شوق اور کیفیت و مستی سے جھومتے نظر آتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک قرآن کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔

تو ہی دانی کہ آئین تو چیت	زیر گردوں سے تمکین تو چیت
آن کتاب زندہ شہر ان حکیم	حکمت اولایزال است و قدیم
نسخہ اسرار تکوین حیات	بے ثبات از قوتش گیر و ثبات
حرف اور اریب نے تبدیل نے	آیہ اش شرمندہ تاویل نے
نوع انساں را پیامِ آخریں	حایل او رحمتہ للعالمین

اور سینے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمراست	این کتاب بے نیست چیزے دیگر گشت
صد جہان تازہ در آیاتِ اوست	عصر با چپیدہ دراناتِ اوست
بندہ مومن ز آیاتِ خداست	ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گرد و جہانے در برش	می دہد شہر آن جہانے دیگرش

یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اقبال کے فہم قرآن کے کسی مقام سے اختلاف ہو۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے فکر کی اساس کچھ اور تھی۔ اب آپ یہ سوچتے کہ جس مفکر کے فکر کا سرچشمہ قرآن ہو، نہیں؛ بلکہ جس کا دعویٰ یہ ہو کہ میرے پیغام میں غیر قرآن ایک حرف بھی نہیں، اس کے پیغام سے قرآن کی تلمیحات پیش کرنا اس کے پورے کے پورے پیغام کو پیش کرنا ہوگا۔ تلمیح قرآنی کے معنی یہ ہیں کہ اگر علامہ اقبال اپنے کسی شعر میں قرآن کی کسی آیت کا کوئی لفظ یا کلمہ لائے ہیں تو یہ بتا دیا جائے کہ اس سے کس آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے مثلاً انہوں نے اپنی نظم خضر راہ کے ایک مصرعہ میں لکھا ہے۔

آبِ تَاوُنِ تَجْهٍ كُورِ مِرْ آيَةِ اِنِّ الْمَلُوكِ

تو ان الملوك کی تلمیح سے اشارہ ہے سورہ نمل کی اس آیت مقدسہ کی طرف کہ قَالَتْ اِنَّ الْمَلُوكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةً اَهْلِهَا اَذَلَّةً كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ. مَلِكًا سَبَابًا

نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی (کو فتح کر کے) اس میں داخل ہوتے ہیں تو اس کا تختہ الٹ دیتے ہیں اور وہاں کے صاحبِ عزت و حشمت لوگوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں اور یہ کوئی ہنگامی چیز نہیں بلکہ ملوکیت کا خاصہ ہی یہ ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے چونکہ اقبال کے پیغام کا ماخذ ہی قرآن ہے اس لئے ان کی جس کتاب کو اٹھائیے آپ دیکھیں گے کہ قرآنی آیات کی طرف اشارہ پر اشارہ چلا آ رہا ہے۔ کہیں خود قرآن کے الفاظ ہیں اور کہیں قرآنی مفہوم اپنے الفاظ میں۔ مثلاً اسرار و رموز کے چند الفاظ لیجئے۔

آنکہ براعدہ دیر رحمت کشاد مکہ را پیغام لا تشریب داد

نبی اکرم نے جب مکہ فتح کیا ہے تو سردارانِ قریش جنہوں نے حضور کی ایذا رسانی اور تکلیف دہی میں کوئی گسر نہیں اٹھا رکھی تھی پابجولاں سامنے کھڑے تھے۔ دنیا کے ہر قانون کی رو سے ان کی سزا قتل تھی لیکن حضور نے اپنے انتہائی عفو کریمانہ سے کام لیا اور فرمایا کہ لا تشریب علیکم الیوم۔ جاؤ! تم سے کچھ مواخذہ نہ ہوگا۔ قرآن کریم میں یہ الفاظ حضرت یوسفؑ کی زبان سے آئے ہیں جب انہوں نے اپنے بھائیوں کی ہر خطا کو معاف کر دیا تھا۔ ایک اور شعر ہے۔

ایکہ در زندانِ غم باشی اسیر از نبی تسلیم لا تحزن بگیر

شبِ ہجرت کی صبح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق کی معیت میں ایک غار میں چھپے بیٹھے تھے کہ دشمنوں کے پاؤں کی آہٹ کان میں آئی۔ حضور کی حفاظت کے خیال سے حضرت صدیق اکبرؓ کی پیشانی پر تردد کے آثار نمایاں ہو گئے۔ حضور نے اسے بھانپا اور دل کے کامل سکون اور اطمینان سے فرمایا کہ لا تحزن ان اللہ معنا۔ مت گھبراؤ! ہم اکیلے نہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہی ہے وہ واقعہ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

از نبی تسلیم لا تحزن بگیر

یامثلاً جب صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ کا ساحرین دربارِ فرعون سے آمناسا منا ہوا اور جادو گروں کی رستیاں دیکھنے والوں کی نگاہوں میں سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو حضرت موسیٰؑ کو خیال پیدا ہوا کہ

لے یہ قرآن کی متعلقہ آیات کے لغوی معانی ہیں۔ ان کا مجازی مفہوم کچھ اور ہے جسے میں نے ”برقِ طور“ میں بیان کیا ہے۔

کہیں لوگ ان کی نگاہ فریبی سے متاثر ہو کر باطل کی طرف نہ جھک جائیں۔ اس پر اللہ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ۔ اے موسیٰ! مت گھبراؤ۔ یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔ اقبال مردوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ:-

چوں کلیمے سوئے فرعون نے روو      قلبِ او از لا تخف محکم شود

ان اشعار میں تو آیات قرآنی کے ایک ایک دو دو الفاظ ہی آتے ہیں۔ بعض اوقات پورے کا پورا مصرعہ آیت قرآنی پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثلاً وطنیت کے پرستاروں کے متعلق کہتے ہیں:-

جنتے جستند در بیس القرار      تا اخلوا قومهم دار البوار

سورہ ابراہیم میں ہے۔ أَلَمْ نَرِ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَ أَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۗ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَ يَبْسُ الْقَرَارِ۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناسپاس گزاری کی اور اس طرح اپنی قوم کو بلاکت کے گھر میں لے گئے یعنی جہنم میں داخل ہو گئے اور وہ کیسی بڑی جگہ ہے ٹھہرنے کی۔

ان اشعار میں قرآنی الفاظ سے آیات قرآنی کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ لیکن ایسے اشعار بھی ہیں جن میں اپنے الفاظ میں قرآنی آیات کی طرف تلمیحات ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم کے متعلق فرماتے ہیں:-

بہر ما دیرانہ آباد کرد      طائفال راخانہ بنیاد کرد

پہلے مصرعہ میں دیرانہ سے اشارہ ہے سورہ ابراہیم کی اس آیت جلیلہ کی طرف جس میں حضرت ابراہیم نے بحضور رب العزت عرض کیا تھا۔ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ غَيْرِ ذِي زُرْعِ۔ ہمارے پردردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس وادی میں آباد کر دیا ہے جس میں شگفتگی و

شادابی کا نام و نشان تک نہیں۔ اور دوسرے مصرعہ (طائفال راخانہ بنیاد کرد) میں اشارہ ہے سورہ بقرہ کی اس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہے کہ وَ عٰهَدْنَا اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطّٰلِقِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرّٰكِعِ السّٰجِدِ و ادرہم نے ابراہیم و اسمعیل کو حکم دیا کہ وہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجد کرنے والوں کے لئے ہمارے گھر کو پاک کر دیں۔

میں نے ان اشعار کو محض تمثیلاً پیش کیا ہے در نہ مفہوم کے اعتبار سے اقبال کے پورے

پیغام سے بتایا جاسکتا ہے کہ وہ قرآن کے کس مقام کا ترجمان ہے۔ وہ اپنے الفاظ کے پردے میں سب کچھ کہہ گئے ہیں۔ پیامِ مشرق میں ہے۔

پردہ بر گیسوم و در پردہ سخن می گویم

تیغِ نونِ ریزم و خود را بہ نیلے دارم

لہذا اگر یہ صحیح ہے کہ کسی مفکر کے پیغام کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک اس کے پیغام کے ماخذ اور اس کے فکر کی اساس کو نہ سمجھا جائے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ اقبال کے پیغام کو نہیں سمجھا جاسکتا جب تک پڑھنے والے کے سامنے قرآن نہ ہو۔ جو اقبال کو اس طرح نہیں سمجھتا وہ اس کے الفاظ میں کھو کر رہ جاتا ہے حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ انہی کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ

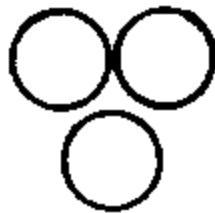
آشنائے من ز من بیگانہ رفت از خمتانم ہی پیمانہ رفت

من شکوہ خسروی اورا دہم تخت کسری زیر پائے او نہم

او حدیثِ دلبری خواہد ز من رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من

کم نظر بیتابی جانم نہ دید

آشکارم دید و پنہانم نہ دید





# اقبال اور ملت

(۱۹۳۰ء کے یومِ اقبال کی تقریر)

۱۹۳۸ء میں جب پہلا یومِ اقبال منایا گیا تو میں نے مسلم برادر ہڈ کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ حضرت علامہ (علیہ الرحمۃ) کی یاد میں سر جھکائے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے یومِ اقبال تو سینکڑوں منائے جائیں گے لیکن گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر زمزمہ تہنیت و غلغلہ تبریک سے سر مست یومِ اقبال منانے کا سہرا برادر ہڈ کے سر ہی رہے گا۔ نہ جانے وہ کونسی قوت تھی جس نے میری زبان سے اس وقت یہ الفاظ کہلوا دیئے کہ دوسرے ہی سال ہمیں سر جھکائے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے "یومِ اقبال" منانا پڑا۔ بہر حال میں اس وقت اپنے بربط ہستی کے ان تاروں کو نہیں چھیڑنا چاہتا جس میں یہ المیہ نغمات خوابیدہ ہیں کہ ہمیں ایسے مواقع پر سکھایا یہ گیا ہے کہ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۱۵۵-۱۵۶

آپ کو معلوم ہے کہ میرا مستقل موضوع ہوتا ہے "پیامِ اقبال اور قرآن کریم"۔ اس لئے کہ میرے نزدیک حضرت علامہ کی صحیح عظمت و عقیدت اسی بنا پر ہے کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ کہا قرآن سے کہا۔ ان کے پیام کا سرچشمہ نہ افلاطون و فارابی کے تصورات کی دنیلہ ہے اور نہ کانٹ اور میگن کے تخیلات کا عالم۔ انہوں نے جس قدر کتابِ ضیا کیا اللہ کی اسی شمع نورانی سے کیا۔ ان کی مئے سخن براہِ راست نہستانِ حجاز سے سر بہر آ بگینوں میں آتی تھی تاکہ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغر انگنم

سال گذشتہ میں نے اس وسیع موضوع کے ایک ضمنی گوشے یعنی اسلامی فلسفہ اجتماعیت کے متعلق کچھ عرض کیا تھا۔ اس وقت "اقبال اور ملت" کے عنوان سے کچھ گزارش کروں گا۔ اسے دراصل سال گذشتہ کے سلسلہ ہی کی ایک کڑی سمجھئے۔ دعا تو فیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اگر آپ اسلام اور دیگر ادیان عالم پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو آپ کو ان دونوں میں ایک بین فرق نظر آئے گا۔ دنیا کے دیگر مذاہب کا انتہائی مقصود یہ ہے کہ انسان کو اس کی اپنی نجات کا طریقہ سکھائیں۔ اُسے بتائیں کہ اُس کی مُکتی کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ (SALVATION) کس طرح حاصل کر سکتا ہے

اور اس نجات، مُکتی یا (SALVATION) کے حصول کے لئے سکھایا یہ جاتا ہے کہ انسان دنیا کے دھندوں سے الگ ہو کر ایشور کی بھگتی میں گمن ہو جائے۔ ان مذاہب میں خدا کا مقرب وہی سمجھا جاتا ہے جو اس کے بندوں سے دُور ہوتا چلا جائے۔ گہر بست آشرم اور سنیاں آشرم ایک انسان کی دو مختلف زندگیوں کے نام ہیں جو کبھی ایک جا نہیں ہو سکتے۔ کلیسا کا راز اب

## اسلام کا مقصود

بیوی بچوں کی زندگی سے دُور بھاگتا ہے۔ کیونکہ اسے ان میں شیطان کی روح نظر آتی ہے۔ سلطنت اور مذہب (CHURCH AND STATE) نظام عالم کے دو جداگانہ شعبے ہیں جن میں کبھی تطابق و توافق پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے برعکس اسلام دنیا کو ایک اور ہی سبق دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دین انسان کی عملی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ اس کے حدود و قیود وہ پختہ ساحل ہیں جو حیات انسانی کی جوئے رواں کارخ متعین کرتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک دین کا منشا محض ایک انسان کی انفرادی نجات نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر جسے انسانی چہرہ دستیوں اور ہوس پرستیوں نے جہنم بنا رکھا ہے، خدا کی بادشاہت قائم کی جائے۔ اس نظام زندگی، اس ضابطہ حیات کا نام ہے اسلام۔ یہ کبھی ظاہر ہے کہ اس قرآنی نظام

لے دنیا میں دین خداوندی صرف ایک ہی ہے جسے اسلام کہتے ہیں اور جو قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ باقی سب مذاہب ہیں۔ خدا کے رسول دین پیش کرتے ان کے تبعین ان کے بعد اس دین میں اپنی طرف سے آمیزش کر دیتے تھے۔ دین کی اہل تحریف شدہ شکل کو مذہب کہتے ہیں۔

کے قیام و بقا کے لئے اللہ کے سپاہیوں کی ایک جماعت کی ضرورت ہوگی، اس جماعت کا نام ہے ملت اسلامیہ جو دنیا میں اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے خدا کے لئے جیتی اور اسی کے لئے مرتی ہے۔ قُلْ اِنَّا صَلَوَاتِي وَ نُسُكِي وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

ہم تو جیتتے ہیں کہ دنیا میں ترانام رہے  
کہیں ممکن ہے کہ ساتی نہ رہے جام رہے

لیکن برادران! اسلام کی اس امتیازی تعلیم پر غیر اسلامی تصورات اس درجہ غالب آگئے کہ حیات اجتماعیہ کا یہ نظریہ مسلمانوں کی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو گیا اور دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے متعلق بھی یہی سمجھ لیا گیا کہ اس کا مقصد انسان کی انفرادی نجات ہے۔ اگرچہ یہ عجمی نظریہ مسلمانوں کے ذہن پر ایک عرصہ سے مسلط تھا لیکن دورِ حاضرہ میں ان لوگوں کی طرف سے جو سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ امتیازی نشان ان کے بعض مخصوص مقاصد کی راہ میں ایک سنگِ گراں بن کر عائل ہے، اس نظریہ کو بڑا نمایاں کر کے دکھایا گیا اور ہر جگہ اس کا ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ مذہب انسان کے پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے۔ عملی زندگی میں اس کا کوئی دخل دائرہ نہ ہونا چاہیے۔ ایسے پُر آشوب زمانے میں جب کہ مذہب کے متعلق اپنوں اور بیگانوں کی طرف سے اس قسم کے غیر اسلامی تصورات کو عام کیا

**اقبال** | جارہا تھا۔ ملت اسلامیہ کی خوش بختی سے ان کے اندر ایک مردِ مومن پیدا ہوا جس نے اپنی بصیرت قرآنی اور جراتِ ایمانی سے مسلمانوں کے سامنے ان کے اس گم گشتہ نظریہ کو پھر سے نمایاں کیا اور پوری قوت سے اعلان کیا کہ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ.

فرد را ربط جماعت رحمت است	جو ہر اور اکمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش	رونق بشکامہ احرار باش
فرد می گیرد ز ملت احترام	ملت از فرد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود	قطرہ وسعت طلب فلزم شود

فرد اور ملت کی مثال ایک گھڑی کے پُر زوں کی سی ہے۔ پُر زے الگ الگ بکھرے پڑے ہوں تو ایک ایک پُر زہ کتنا ہی قیمتی اور کیسا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، کسی کام کا نہیں۔ لیکن اگر یہی پُر زے ایک خاص نظام کے ماتحت گھڑی کے اندر فٹ (FIT) ہو جائیں تو ہر پُر زہ کی حرکت تمام مشینری پر

اثر انداز ہوگی اور یوں ان پُرزوں کی حرکات کے جیتے جاگتے درخشندہ و تابندہ نتائج آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا قف و اتقوا  
اللَّهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ۝ (۳/۲۰۰)

اگر آپ حضرت علامہ کے کلام پر اس نگاہ سے غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔  
**ملت اور مرکز** کا نام ہے۔ یہ گئے تو اسلام بھی گیا۔

اپنی اصلیت پر قائم تھا تو جمعیت بھی تھی  
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت یہ  
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی  
فرد قائم ربط ملت گتے نہہا کچھ نہیں

چھوڑ کر محل کو پریشاں کاروان ہو ہوا  
زندگی کیسی جو دل بے گانہ پہلو ہوا  
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا  
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

یہ تصور کہ ملت کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے، اس کی اجتماعیت فنا ہو چکی ہے، ان کی وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے، ان کی مرکزیت انفرادیت میں گم ہو چکی ہے، حضرت علامہ کو خون کے آنسو لانا تھا۔ بحضور رسالت مآب عرض کرتے ہیں۔

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است  
ز کار بے نظام او چہ گویم

ہنوز ایں کارواں دور از مقام است  
تومی دانی کہ ملت بے امام است

ان کے نزدیک ایک مسلمان کی تعریف (DEFINITION) ہی یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو مستحکم کر کے ملت کا جزو و لاینفک بن جائے اور یوں بقائے دوام اور حیات جاوید کے بلند ترین مقام پر سرفراز ہو جائے۔ وہ دنیا سے عشق میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ تصوف کے عجمی تصور کو پھر سے اسلامی بنیادوں پر استوار کرتے ہیں۔ وہ انا الحق کی جگہ انا الملت کا نعرہ لگانا سکھاتے ہیں۔

مسلمانی غم دل در خریدن  
چوں سیاب از تپ یاران پیدن

حضور ملت از خود درگذشتن  
دگر بانگ انا الملت کشیدن

”چوں سیماں از تپِ یاراں تپیدن“۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ تمام رُوئے زمین کے مسلمانوں کی مثال ایک جسدِ واحد کی سی ہے۔ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے آبِ گینے میں آنسو چھلک آئیں۔ اگر افریقہ کے پتے ہوئے صحراؤں میں کسی حبشی کے تلوے میں آبلہ پڑ جائے تو گل کدہ ایران میں حریر و اطلس کے گدوں پر لیٹے ہوئے شاہنشاہ کی آنکھوں میں نیند حرام ہو جائے۔ علاوہ بریں اپنے آپ کو ملت کا جزو بنا دینے اور اس طرح خود ملت بن جانے کے نکتہ پر بھی غور فرمایا آپ نے؟ اسلامِ ملتِ ابراہیمی کا نام ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا

یقیناً ابراہیم ایک فردِ واحد نہیں تھا بلکہ ایک (پوری پوری) ملت قانتا کو اپنی ذات میں سموئے ہوئے تھا اور تمام دنیا سے کٹ کر سیدھا اسی کے راستے پر قائم تھا۔

چشمِ کم میں تنہا ایم را کہ من صد کارڈاں اندر کنام

چونکہ اس زمین پر حکومتِ الہیہ کے قیام کی ذمہ دار ملتِ اسلامیہ ہے۔ اس کی سلطنت کا تخت اسی کے ہاتھوں بچھایا جائے گا۔ اس لئے اگر یہ ملت (افراد نہیں ملت) انا الحق کا دعویٰ بھی کرے تو بجا نہیں۔

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست سزائے او چلیا بست یا نیست  
اگر فردے بگوید سرزنش بہ اگر قومے بگوید ناروا نیست

لیکن یہ انا الحق کا دعویٰ زیب کس قوم کو دیتا ہے فرماتے ہیں۔

ہاں ملت انا الحق سازگار است کہ از خوش نم ہر شاخا راست  
نہاں اندر جلالِ او جمالے کہ اورانہ سپر آئینہ دار است

وہ اُمت جو

میان اُمتاں والا مقام است

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۴)

کہ آل اُمت دو گیتی را امام است

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ يَكُونِ

الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۝ (۱۳۳)

ہاں! وہ اُمت کہ  
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزلِ مسلمان کی  
تکے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کاڑاں تو ہے

میان اُمتاں والا مقام است  
کیا ساید ز کارِ آفرینش  
کہ آں اُمت دو گیتی را امام است  
کہ خوابِ دختگی بر دے حرام است  
وہ اُمت کہ جس کا اندازِ زندگی یہ ہو کہ

پر در و سعتِ گردوں یگانہ

جن بلندیوں پر یہ اڑے کسی اور کے شہرِ تخیل کی بھی وہاں تک رسائی نہ ہو۔

مومنے بالائے سر بالائے غیرتِ اُدرِ متا بد بمرے

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا أَوْ أَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ ۱۳۹

خود نگر۔ وہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو نے اپنے مقام کو پہچانا ہی نہیں۔ تہذیبِ یورپ کے جھوٹے  
انگوں کی مینا کاری تیری نگاہوں کو یوں ہی خیرہ کر گئی حالانکہ اگر تو کبھی اپنے آپ سے باخبر  
ہو جاتا تو خود محسوس کر لیتا کہ

فرنگِ سبیت آگے ہے منزلِ مہینِ قدم اٹھایہ مقام انتہائے راہ نہیں

یورپ کا مادہ پرست اسی جہانِ آب و گل کی چار دیواری میں محسوس ہو کے رہ گیا۔ اس کی نگہِ تجسس نے  
بہت بڑی جست کی تو کسی کرے سے ٹکرا کر نیچے گر پڑی۔ اس کے برعکس مومن کو قرآن یہ سکھاتا ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمانِ مکان اور بھی ہیں

اقبال نے اس ملت کے متعلق کہا ہے کہ

پر در و سعتِ گردوں یگانہ۔ وہ آسمان کی بلندیوں پر بلا شریک و سہیم اڑتی ہے۔ لیکن اتنی بلندیوں  
پر اڑنے کے باوجود، نگاہِ اُوبشاخِ آسمانہ۔ اس کے قلب کا رشتہ مرکز سے وابستہ رہتا ہے۔

بچو پر کاریم پائے در شریعتِ مستقیم پائے دیگر سیرِ بفتاد و دولتِ کردہ ایم

کہ اگر پاؤں مرکز سے اٹھ گیا تو دائرہ کائنات جگڑ گیا۔ اگر آشیانے سے نگاہ اُچٹ گئی تو فضا کی پہنائیوں میں کھو گیا۔ کیا آپ نے شہد کی مکھیوں کی طرف نہیں دیکھا (وَ اَوْحٰی رَبِّکَ اِلٰی النَّحْلِ) مرکز سیکڑوں اور ہزاروں میل کی مسافت طے کرتی ہیں۔ ایک سے ایک الگ ہو جاتی ہے۔ قسم قسم کے باغات اور رنگارنگ کی وادیوں میں جانکتی ہیں لیکن وہ کبھی اس فضائے رنگ و بو میں کھو نہیں جاتیں۔ وہ کلی کلی کارس چوستی ہیں۔ اس تمام خارجی فضا کو اپنے اندر جذب کر بیٹی ہیں۔ لیکن اس عالم رنگ و تعطر میں اس جہان کیف و کم میں قلب کا رشتہ اپنے مرکز سے قائم رکھتی ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی محنتوں کا سرمایہ، اپنی اپنی تگ و دو کا حاصل امیر ملت کے قدموں میں ڈھیر کر دیتی ہے۔ یہی کیفیت ملتِ اسلامیہ کی ہے۔

نگاہِ او بشارِ آشیانہ  
بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ

پروردِ وسعت گردوں یگانہ  
مہ و انجم گرفتارِ کندش

اس ملت کی صفات کیا ہوں گی؟

براغاں حجرہ بازے زود گیرے

باغاں عندیے خوش صفرے

یعنی

شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا  
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیداکر  
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہِ دیباہاں سے

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَ الَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ

عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَلِيغُهُمْ

دیریاؤں کے دل جس سے دل جاتیں وہ طوفان

جس سے جگڑ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

ہاں!

براغاں حجرہ بازے زود گیرے

باغاں عندیے خوش صفرے

فقیر او بہ درویشی امیرے

امیر او بہ سلطانی فقیرے

ایک زندہ و پایندہ قوم جیتی جاگتی قوم، وہ قوم جس کے اعمالِ صالح کے درخشندہ نتائج دیکھ کر دنیا

پکار اٹھے کہ

نشاں یہی ہے زلمے میں زندہ قوموں کا  
کمالِ صدق و مروت ہے زندگی ان کی  
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال  
اسی غزل کا ایک اور شعر ہے۔

شکوہ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن  
مختلف تجیروں میں کس قدر فرق ہے فرماتے ہیں۔  
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن  
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں  
مسلمان سے پوچھتے ہیں کہ

وحدت  
وحدت

چیت ملت ایک گوئی لا الہ  
ذرہ از یک نگاہی آفتاب  
مردہ! از یک نگاہی زندہ شو  
وحدت افکار و کردار آفریں

باہزاراں چشم بودن یک نگاہ  
یک نگہ شو تا شود حق بے تقاب  
بگذر از بے مرکزی پایندہ شو  
تا شوی اندر جہاں صاحبِ نگین

توحید نام ہی وحدت و یک نگہی کا ہے۔ تفرقہ قرآن کے نزدیک شرک ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا  
شِيَعًا ۝ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فِرْحُونٌ ۝ ۳۱-۳۲

سلمانو! دیکھنا کہیں تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے جو دین میں تفرقہ پیدا  
کر دیتے ہیں اور خود ایک فرقہ بن بیٹھتے ہیں۔ (پھر یہ حالت ہو جاتی ہے کہ) کہ ہر فرقہ اپنے اپنے  
سلک میں مگن ہو جاتا ہے۔

حضرت علی کا قول ہے۔

إِيَّاكُمْ وَالتَّفْرِقَةَ. فَإِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاسِ لِلشَّيْطَانِ لَمَّا إِنَّ الشَّاذَّ  
مِنَ الْعَنَمِ لِلذَّنْبِ. إِلَّا مَنْ دَعَا إِلَى هَذَا الشَّعَارِ فَاقْتُلُوا.  
وَلَوْ كَانَ تَحْتَ عَمَامَتِي هَذَا.



ہمیشہ تفرقہ سے بچو یاد رکھو جو شخص ملت سے کٹ کر تنہا رہتا ہے وہ اسی طرح شیطان کا شکار ہو جاتا ہے جس طرح ایک بھیڑنگلے سے جدا ہو کر بھیڑ پیٹے کا شکار ہو جاتی ہے! دیکھو! جو شخص تمہیں اس شعار کی طرف دعوت دے اسے قتل کر ڈالو خواہ وہ سرسیرے ہی عمامہ کے نیچے کیوں نہ ہو۔

ہوس نے ٹوٹے ٹکڑے کر دیا ہے نوح انساں کو      انوت کا بیاں ہو جا مجتت کی زباں ہو جا  
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی      تولے شرمندہ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا  
غبار آلودہ رنگ نسب ہیں بال و پیر تیرے  
تولے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرقتاں ہو جا

نبی اکرم نے فرمایا۔

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّهُ مَنْ شَذَّ شَذَّ فِي النَّارِ

ہمیشہ جماعت کے ساتھ رہو۔ جو جماعت سے الگ ہو ایدھا جہنم میں گیا۔

برکہ از بند خودی دارست مرد      برکہ با میگانگاں پیوست مرد

ایسے مسلمان جو ملت اسلامیہ سے اس لئے برگشتہ ہو جاتے ہیں کہ یہ نیکت وادباد کے زرخے میں آچکی ہے۔ یہ دور انحطاط سے گزر رہی ہے۔ اس میں کوئی جاذبیت نہیں رہی۔ انہیں مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ اور سینے کہ کس دلگداز پیرایہ میں فرماتے ہیں کہ :-

کہن شاخے کہ زیر سایہ اوپر بہ آوردی      چون رگش ریخت ازوے آشیاں برداشتن ننگ

ملت اسلامیہ کا وہ شجر مقدس جس کے سایہ میں تم پروان چڑھے جس نے تمہارے جیسے بے بال و پر ناتواں کو وہ بازوئے شاہیں عطا کئے جس سے تمہاری بلندی پرواز کی داستانیں زبان زدِ خلاق ہو گئیں۔ اگر آج اس نخت پر خود تمہاری ہی بدولت خزاں کا دور آ گیا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی اور سرسبز ٹہنی پر جا بسیرا کرنا دنیا کے خودداری میں بڑی ہی گری ہوئی بات ہے۔ مسند امام احمد حنبل کی ایک روایت ہے۔

قَالَ صَلَّعُمْ أَنَا أَمْرُكُمْ بِخَيْرِ اللَّهِ أَمْرِي بِهِنَّ الْجَمَاعَةُ  
وَالسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ وَالْهَجْرَةُ وَالْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَإِنَّهُ  
مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ شَيْئًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ

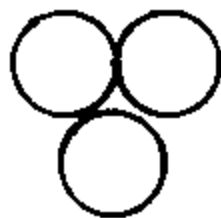
مِنْ عُنُقِهِمْ - قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ . وَإِنْ صَامَ وَ صَلَّى . قَالَ وَ إِنْ صَلَّى وَ صَامَ وَ زَعَمَ إِنَّهُ مُسْلِمٌ .

حضور نے فرمایا میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے جماعت (کے ساتھ رہو) حکیم امیر، سنو اور (اس کی) اطاعت کرو! ضرورت پڑے تو اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھی چھوڑ دو اور اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے نکل کھڑے ہو یا درکھو جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا، اسلام کا پٹہ اس کے گلے سے اتر گیا، عرض کیا کہ یا رسول اللہ! خواہ وہ روزے رکھتا ہو اور نمازیں پڑھتا ہو (پھر بھی اسلام سے خارج ہو جائے گا)۔ فرمایا ہاں! خواہ وہ نمازیں پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور بزرگم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو (دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا)۔

اس لئے کہ

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ  
ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے  
شاخ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو  
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے  
کچھ واسطہ نہیں ہے لے برگ بار سے  
نا آشنا ہے قاعدہ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ  
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ



# اقبال کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام

عرصہ کی بات ہے۔ میں کسی کام کے لئے عجلت میں تھا اس لئے بازار میں تیزی سے جا رہا تھا کہ ایک بوڑھے آدمی سے میرا کھواچھل گیا۔ میں فوراً رُکا اور اس مردِ بزرگ سے معذرت چاہی۔ اس نے شفقت اور طنز کے ملے جلے لہجہ میں کہا "کوئی بات نہیں بیٹا! یہ عمر کا تقاضا ہے۔ جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو آدمی تو ایک طرف دیواروں تک کو مونڈھے مار کر چلا کرتے تھے" اس واقعہ کو ایک عمر گزر گئی لیکن اس پیردانا کی بات آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ جوانی کے زمانے میں چونکہ فطرت کو قوائے جسمانیہ کی نشوونما مقصود ہوتی ہے اس لئے وہ خون میں کلیاں بھر کر رکھ دیتی ہے جس سے نوجوان چلتا نہیں دوڑتا ہے۔ اٹھتا نہیں پھانڈتا ہے۔ بیٹھتا بھی ہے تو کبھی نچلا نہیں رہتا۔ حرکت۔ حرکت۔ حرکت پیہم۔ مسلسل حرکت۔ یہ ہے جوانی کی نشانی، عمر کے ایک درجہ تک یہ سلسلہ نشوونما بالیدگی جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد یہ ترقی رُک جاتی ہے۔ لیکن اس کا ماہِ حاصل علیٰ حالہ قائم رہتا ہے۔ پھر انحطاط کا زمانہ آجاتا ہے جو جوانی کی گردنِ فرازی کو کٹوٹیں جھکوا دیتا ہے اور انسان و من نعمة ننكسه فی الخلق۔

دبڑھاپے میں انسان کی حالت منکوس و منکوب ہو جاتی ہے، کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتا ہے۔

جوانی کی شعلہ نشانیوں | اس کے دل و دماغ پر کبھی ہوتا ہے۔ جوانی میں جس طرح اس کا جسم ساکت نہیں رہ سکتا اسی طرح اس کے خیالات کبھی جامد نہیں رہتے۔ ان میں کبھی ہر آن ایک تبدیلی

پیدا ہوتی رہتی ہے۔ وہ "نچلے نہیں بیٹھتے" کبھی یہ اسکیم سوچتے ہیں کبھی اس پر دو گرام کے پیچھے چلتے ہیں یہ ہونا چاہیے وہ نہیں ہونا چاہیے۔ خیالات کیا کوندے کی لپک اور شعلے کی چھٹ ہوتی ہے۔ ابھی یہاں ابھی وہاں جس نوجوان کو دیکھو یہ کیفیت ہے کہ

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نسا زد  
چوں نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے  
دلِ ناصبور وارم چو صبا بہ لالہ زار سے  
تپد آں زماں دلِ من پتے خوب تر نگار سے  
ز شرستارہ جویم ز ستارہ آفتاب سے  
سر منزلے نہ دارم کہ میرم از قرار سے

ان خیالات کی یہی برق رفتاری اور شعلہ پائی ان میں شیخرائیگز انقلابات کی صلاحیتیں پیدا کر دیتی ہے۔ اگر ان صلاحیتوں سے صحیح کام لیا جائے تو قوم کی اپنی تقدیر ہی نہیں بدلتی بلکہ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں آجاتی ہیں۔ لیکن اگر انہیں سرکش دیباک چھوڑ دیا جائے تو ان کا ماہاصل ایک بگولے کے نص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ جب تک وہ جوش و حرکت میں رہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے شاید ایک نیا آسمان پیدا کر دے گا اور جب آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتا ہے تو زمین پر اپنا نقش تک بھی نہیں چھوڑتا۔ اور اس کے بعد یہی نوجوان جو ابھی ابھی ایک شعلہ جو الہ حقاہ اسخطاطہ عمر کے زمانہ میں راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ حرارت ہوتی ہے نہ حرکت۔ تبدیلی احوال کے تصور سے اس کا دم گھٹتا ہے۔ انقلاب کے نام سے اس کی جان جاتی ہے۔ بے بسی کی قناعت اس کے نزدیک شرافت کی زندگی اور بیکیسی کا سکون اس کے خیال میں بزرگی کا شیوہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اس جمود و سکوت کی قبرستانی زندگی پر قانع نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہے کہ

نئے تیرکساں میں ہے نہ صیاد کمیں میں

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

حرکت و جنبش اس کے نزدیک بچپن کی شام کاریاں اور تیز خزامی و سبک سیری اس کے خیال

بڑھاپے کی سہل انگاری میں جوانی کی نلون انگاریاں بن جاتی ہیں۔ پھر چونکہ عقل جیلہ جو انسان کو جھوٹے فریب سے مطمئن رکھنے کی کوشش کرتی ہے اس لئے

وہ اس سکوت و جمود کی زندگی کو سنجیدگی اور ثقاہت کے بزرگانہ پیر بن میں پیش کر کے اس کی عدم حرکت کو تقدس کا جامہ پہنا دیتی ہے اور اس کے خیالات کے خرد و جمود کو تجربہ کی پختگی اور فکر

کی تکمیل قرار دے کر اسے "قطب" بنا دیتی ہے کہ ساری دنیا اپنی جگہ سے بل جائے۔ لیکن یہ اپنے مقام کے نہ ملے۔ فکر و نظر کا یہی تعطل جب مذہب کی دنیا میں آتا ہے تو انسان اسے اسلاف پرستی اور تقلیدِ آباء کا مقدس نقاب اڑھا کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح بعض آدمیوں کے قوائے جسمانی اخیر عمر تک صحیح و سالم رہتے ہیں۔ اسی طرح ایسی صورتیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جہاں انحطاطِ عمر کی برودت انسانی خیالات کی حرارتِ انقلاب کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیتی۔ لیکن یہ صورتیں شاذ اور یہ شکلیں مستثنیات میں سے ہیں۔ کلیہ یہی ہے کہ من نعوذ منتكسہ فی الخلق۔ عمر کی زبادت سے حالت منکوس ہو جاتی ہے۔ یہی وہ بڑے بوڑھے تھے جو صاحبِ ضربِ کلیم جناب موسیٰ جیسے کوہِ نمثال و فرعون شکن داعی انقلاب کی دعوتِ جہاد کے اولین مخاطب تھے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ خدا کا یہ اولوالعزم پیغمبر انہیں بشارت دیتا ہے کہ یہ سرزمین تمہارے نام لکھی جا چکی ہے۔ اٹھو اور اس پر قابض ہو جاؤ۔ لیکن ان پر عاقبت کوشی اور سہل انگاری کی افسردگی اس درجہ طاری ہو چکی ہے اور فریقِ مخالف کا خوف انہیں اس طرح چھلا وہ بن کر ڈراتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ

نہ صاحب! جب تک اس سرزمین میں بسنے والے وہاں موجود ہیں ہم وہاں قطعاً پاؤں نہیں

رکھیں گے۔ تم اور تمہارا خدا جاؤ اور ان سے لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" (۵/۲۴)

نتیجہ اس کا یہ کہ اس قانونِ مشیت نے جس میں کسی کے لئے رعایت نہیں ہوتی فیصلہ کر دیا کہ۔ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيَهُونَ فِي الْاَرْضِ (۵/۲۴) یعنی جب ان کی یہ حالت ہے تو وہی سرزمین جو ان کے لئے مقدر کر دی گئی تھی، ان پر چالیس برس تک حرام کر دی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ اس بیابان میں۔ گرداں پھرتے رہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ ان چلتی پھرتی لاشوں کو لئے لئے چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے تا آنکہ اس قوم کے بڑے بوڑھے ایک

**بنی اسرائیل** ایک کر کے اٹھ گئے اور وہ نوجوان جن کی تربیت شہروں کی غلام ساز فضا سے دور کوہ و بیابان کی آزاد ہوا میں ہوئی تھی، نئے دماغ، نئی زندگی، نئی آرزوؤں کو اپنے دلوں میں لئے حضرت موسیٰ کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے (فَمَا اَمِنَ لِمُوسَىٰ اِلَّا ذَرِيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهِ (۱۰/۸۳) یہی وہ آہن گداز نوجوان تھے جو انقلابی تصورات کو دماغوں میں لئے پھرے ہوئے شیروں کی طرح اٹھے اور ہر مخالف قوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ وہی مغلوب و محکوم قوم جو کل تک نہایت

ذلیل و حقیر شمار کی جاتی تھی، قوم غالب کے خزان و دفائن اور تخت و تاج کی وارث بن گئی۔

تاریخ کے اوراق کو ساڑھتے ہیں ہزار ساں آگے اٹتے اور قوم بنی اسرائیل سے ہندی مسلمانوں  
**ہندی مسلمان** آپ دیکھیں گے کہ انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی  
 کے اوائل میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت بعینہ وہی ہو چکی تھی جس کا  
 نقشہ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کی شکل میں کھینچا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شجرِ ملت کی ہر شاخ  
 پر افسردگی اور پژمردگی چھا چکی تھی۔ مدت ہائے دراز کی غلامی اور محکومی سے ان کے حوصلے پست، ہمتیں  
 کمزور، افکار جامد، اعمال خاد ارادے سقیم اور تمنائیں عقیم ہو چکی تھیں۔ ہر شعبہ زندگی بساطِ  
 بے نظام اور ہر فردِ کارواں ناقہ بے زمام تھا۔ دماغ فکر سے عاری، دل سوز سے خالی، نگاہیں  
 بے نور، قلوب بے حضور، قوم کیا ایک راکھ کا ڈھیر تھی جسے مخالف ہوائیں جلدھر چلبے اڑائے اڑائے  
 پھر رہی تھیں۔ یہ تھا وہ زمانہ جس میں مہدار فیض کی کرم گتری نے اس قوم کو  
**اقبال** اقبال جیسا مردِ خود آگاہ و خدامست عطا کر دیا جس نے اپنی نفس گدازیوں سے  
 اس مردوں کی بستی میں عویر اسرائیل بھونک کر ان میں حیاتِ نو کے آثار پیدا کر دیئے اور اپنی  
 شعلہ نوائیوں سے راکھ کے اس ڈھیر میں پھر سے زندگی کی چنگاریاں نمودار کر دیں۔ اس نے اپنے گرد  
 پیش نظر دوڑائی تو اسے بالعموم وہی بڑے بوڑھے دکھائی دیئے جن میں تبدیلی احوال کی صلاحیتیں ختم ہو  
 چکی تھیں۔ اس لئے اسے سوچنا پڑا کہ وہ اپنے اس پیغام کو جس کا ایک ایک لفظ حشرِ بدایاں اور ایک  
 ایک حرف برق سماں تھا، کس کے سامنے پیش کرے۔ لیکن اسے اس فیصلہ میں کچھ دقت نہ ہوئی  
 اس لئے کہ تاریخ کے اوراق، فلسفہ کے غوامض، انسانی ذہنیت کے مشاہدات اور قرآن کریم کے  
 حقائق و معارف نے اس پر یہ حقیقت بے نقاب کر دی تھی کہ قوم کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں  
 کے ہاتھ میں ہوا کرتی ہے۔ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے گرم خون کی حرارتیں،  
 ان کا زورِ یازد، ان کا جوشِ کردار، ایک کفِ بدہاں سیلاب کی طرح اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت  
 کو جس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کی تخلیق تو ان کے نوجوانوں کے  
 کوہ شکن ارادوں کی رہین منت ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ:-

جوان مردے کہ خود را فاش بیند      جهان کہنہ را باز آفریند  
ہزاراں انجمن اندر طوافش      کہ او بانویشتن خلوت گزیند

اس لئے یہی وہ طبقہ تھا جسے اس نے اپنے تصورات کی آماجگاہ 'اپنی امیدوں کا مرکز' اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی کو اپنے پیغامات انقلاب آفرین کا درخورد تخطاب سمجھا۔  
اپنی کے لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ

جوانوں کو مری آہ سحر دے      پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے  
خدا یا آرزو میری یہی ہے      مرا نور بصیرت عام کر دے

اور انہی کو اپنے سوز و گداز، پیش و خلیش، تڑپ اور اضطراب کا وارث سمجھتے تھے۔ بال جبریل کے ساقی نامہ میں دیکھتے۔ جذب و کیف کی کس والہانہ بیتابی سے بحضور رب العزت ملتی ہوتے ہیں کہ  
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر      زمینوں کے شب زندہ دلوں کی خیر  
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے      مرا عشقِ میری نظر بخش دے  
مرے دیدہ ترکی بے خوابیاں      مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں  
اُمنگیں مری، آرزوئیں مری      امیدیں مری جستجوئیں مری  
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر      اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر  
مرے قافلے میں لٹا دے اسے      لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ان کی آرزوی یہ تھی کہ جس پیغام انقلاب انگیز کو وہ قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ نوہالان ملت کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے تاکہ وہ وہاں سے زندہ آرزوؤں کا چشمہ بن کر اُبے اور خیابان ملت کو اس طرح سیراب کر دے کہ اس کی ایک ایک شاخ پھر سے شگفتہ و شاداب نظر آنے لگ جائے۔ اسی لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ

من کہ نویدم ز پیران کہن      وارم از روزے کہ می آید سخن  
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا      بہر شاہ پایاب کن حرفِ مرا

تاریخی آثار و شواہد جوان کے نور بصیرت سے ان کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جاتے تھے، اس حقیقت کبریٰ کو واضح کئے دیتے تھے کہ

گرچہ اس دیر کہن کا ہے یہ دستورِ قدیم  
کہ نہیں میکرہ و ساقی و مینا کو ثبات  
قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا  
انگہیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

لیکن ان کے ہاں محض شاعرانہ جذبات نگاری نہ تھی بلکہ ان کی نگہِ حکمت و بصیرت زندگی کے حقائق کو پرکھتی اور ہر شے کو اس کے حقیقی مقام پر دکھتی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ صدیوں کی غلامی سے قومِ ہلاکتِ تباہی کے جس جدام میں گرفتار ہے، قوم کے نوجوان بھی اس کے مہلک جراثیم سے محفوظ نہیں رہے۔ جوانی کے پیمانے دن اور سال نہیں بلکہ کشمکشِ حیات میں عزم و استقامت سے **جوانانِ کہن سال** سینہ سپر ہونے کی ہمت ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس معیار کے مطابق قوم کے نومند جوان بھی پیرانِ کہن سال سے کچھ بہتر نہیں۔ اس لئے وہ ان کی عافیت کوشی اور سہل انگاری پر خون کے آنسو روتے تھے۔ وہ ان نرم و نازک پیکرانِ آب و گل کی طرف نہایت حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتے اور سرد آہ بھر کر کہتے کہ

ترے صوفے ہیں افرونگی ترے قالین میں لیرانی  
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی  
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل  
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلیمانی

یہی کج کلاہانِ ملت، قوم کے مستقبل کے آئینہ دار تھے۔ لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے قلوب دولتِ یقین سے تہی مایہ، ان کی نگاہ نورِ بصیرت سے محروم، ان کے بازو قوتِ عمل سے بیگانہ اور ان کے دماغِ تخلیقِ مقاصد کی متاعِ گراں مایہ سے عاری تھے۔ دیکھئے کہ وہ کس حسرت سے ان کے متعلق کہتے ہیں کہ

نوجواناں تشنہ لبِ خالی ایاغ  
شستہ رو، تار یک جاں، روشن دماغ  
کم نگاہ و بے یقین و ناامید  
چشمِ شاہان اندر جہاں چیزے ندید  
ناکساں، منکر ز خود مومن بغیر  
خشت بند از خاکِ شاہ معمارِ ویر

ان کی زندگی بے مقصد، ان کے افکار یریشاں، نہ کوئی متعین نصب العین، نہ منہائے نگاہ۔ کبھی جذبات کی ان وادیوں میں مصروفِ جادہ پیمانی، کبھی امیال و عواطف کے ان صحراؤں میں مشغولِ انجمن آرائی۔ زندگی کے حقائق سے چشم پوشی اور مصافحہ حیات سے گریز پائی۔

ابں مسلمان زاوہ روشن دماغ  
ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ  
در جوانی نرم و نازک چوں حریر  
آرزو در سینہ او زود میر



ایں غلام، ابن غلام، ابن غلام حریت اندیشہ اور احرام

ایں زرخود بیگانہ ایں مست افرنگ نان جو می خواہد از دستِ فرنگ

لیکن ان کی یہ تادیب ایک طبیب مشفق کی تحقیق تھی، فیصلہ عدالت کی تہدید نہیں تھی۔ ان کا ناکب تنقید ایک غمخوار جراح کی نوکِ نشتر تھی، دشمن کی سنان زہر آلود نہ تھی۔ ان کی تنبیہ ملا کی نفرت انگیز لاجول نہ تھی۔ مادرِ مہرباں کی سیلی تھی کہ جس کی چوٹ بچے سے پہلے خود اپنے کلیجہ پر پڑے۔ یہ قہر آلود نگاہیں غصہ سے لال سیلی نہیں ہو رہی تھیں بلکہ دل کا خون تھا جو شدتِ غم سے آنکھوں میں کھنچ آیا تھا۔ وہ ان سہل انگار نوجوانوں کو دیکھتے تھے تو راتوں کی تنہائی میں اٹھ اٹھ کر روتے اور سسکیاں لے لے کر کہتے کہ

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

یہ کس کا فردا کا غمزہ خوں ریز بے ساقی

لیکن انہوں نے اسی لٹی ہوئی متاع کی فقط مرثیہ خوانی نہیں کی بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ یہ لٹی کیسے! جب تک کہ نہ بتا دیا جاتا، اس کے تحفظ و بقا کا انتظام کیسے کیا جاسکتا تھا؟

تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالتے ایک مسلسل داستانِ صید و صیاد نظر آئے گی۔ ہر وہ شخص یا اشخاص کی جماعت جو کسی طرح قوت فراہم کر لیتی ہے کمزور انسانوں کو اپنی ہوس کام جوئی کا ذریعہ بناتی ہے۔ مختلف زمانوں میں اس قوت کے استعمال کے طریق بدلتے رہتے ہیں، روح ہمیشہ اور ہر جگہ وہی کار فرما رہی ہے۔ چونکہ عہد جاہلیت میں انسان کی عقل حیلہ جوئے ابھی ایسی پُرکاری ہی نہیں سیکھی تھی اس لئے اس زمانہ کے اوزاروں اور ہتھیاروں کی طرح محکوموں کو پنجمہ استبداد میں جکڑے رکھنے کے حربے بھی کھر دے اور کندہوتے تھے جنہیں ہر آنچک مشہور دیکھ سکتی تھی اور ہر قلب محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں انسانی عقل مکر و حیل میں ترقی کرتی گئی، آلات و ادواتِ حرب و ضرب کی طرح مغلوب قوموں کو ضعیفی و زبردستی کی نیند میں سلانے رکھنے کے اسباب و ذرائع بھی لطیف

**تعلیم کی اہمیت**

غیر محسوس ہوتے چلے گئے۔ ان تمام ذرائع میں تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں اس کے بچوں کو اسی قسم کی تعلیم دیتے جائیے۔ بلا مزید سعی و کاوش وہ قوم خود بخود آپ کے ذہنی سانچوں میں ڈھلتی جائے گی اور یہ تبدیلی کچھ اس طرح غیر مرنی طور پر ظہور پذیر ہوگی کہ اس قوم کو پتا تک

بھی نہ چلے گا کہ ہم میں کوئی تبدیلی پیدا کی جا رہی ہے جب انگریز ہندوستان میں آیا تو اس نے محسوس کر لیا کہ مسلمان ہی وہ قوم ہے جو اس تغلب و استبداد کے راستے میں روڑ بن سکتی ہے چنانچہ اس نے اس قوم کو اپنے مطلب کے مطابق بنانے کے لئے وہی غیر محسوس لیکن تیر بہدف نسخہ استعمال کیا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس نے اس قوم کا نظامِ تعلیم بدل دیا اور اس ایک تبدیلی سے کھوڑے سے عصر میں پوری کی پوری قوم بدل گئی۔ یہ تھی قومِ غالب کی وہ سحر آفرینی جو قومِ مسلم کی تبدیلی احوال (یعنی تبدیلی ذہنیت) کا موجب بنی تھی اور اس کی پردہ کشائی اس مردِ مومن کے پیش نظر تھی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں :-

اک مرد فرنگی نے کہا اپنے پسر سے  
بچار کے حق میں ہے یہی سب بڑا ظلم  
مینے میں رہے راز ملو کا نہ تو بہتر  
تعلیم کے تیزاب میں ڈال سکی خودی کو  
تا تیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب  
منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر  
برے پہ اگر فاشس کریں قاعدہ شیر  
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر  
ہو جاتے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھر  
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

تعلیم بدل جانے سے نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور زاویہ نگاہ بدلنے سے اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ جب اقدار بدل جائیں تو دنیا کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔

نوع دیگر ہیں جہاں دیگر شود | اس زمین و آسماں دیگر شود

تعلیم بدل جانے سے قوموں کی ریل گاڑی کا کاناٹر جاتا ہے۔ کاناٹرنے سے جب ریل گاڑی پٹری بدلتی ہے تو دونوں پٹریوں میں غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے لیکن اگر کاناٹر موڑ دیا گیا ہو تو اس کے بعد پہلے کا ہر چکر گاڑی کو اس کی منزل مقصود سے دور لئے جاتا ہے۔

**تعلیم بدل دینے سے**

گاڑی کی حرکت بھی وہی ہوتی ہے اور رفتار بھی وہی لیکن جب آخر الامر دیکھا جائے تو گاڑی اور اس کی اصل منزل مقصود میں بُعد المشرقین ہوتا ہے۔ یہی وہ غلط تعلیم تھی جس نے اتنی سی مدتِ قلیل میں پوری کی پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کائنات کی ہر شے کی صحیح قیمت جانے اور پھر اپنا مقام پہچانے۔ انسان کائنات اور فائق کائنات کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اسی کا نام علم صحیح اور دینِ قیتم ہے۔ اگر یہ تعلق غلط خطوط پر متعین ہو جائے تو نظامِ انسانیت میں فساد ہی فساد برپا ہو جاتا ہے۔ مغرب نے خدا انسان اور کائنات کے اقنومِ ثلاثہ میں سے سب سے بڑا رکن (خدا) پہلے ہی الگ کر دیا۔ علمِ انسانی کا

منہی، تسخیرِ فطرت اور اس سے حاصل شدہ قوتوں کا اپنے تغلب و تسلط کے لئے استعمال قرار پایا، جب وہ اس تعلیم کو محکوم قوموں تک لائے تو تسخیرِ فطرت کے رموز و اسرار بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھ لئے۔ جو کچھ باقی رہ گیا وہ بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ مغرب کے تفوق و برتری کو ذہنوں پر مسلط کر دیا جائے اور اس جذبہٴ مرعوبیت کے ماتحت ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اپنی ہر قدر سے نفرت ہوتی جائے اور حاکم قوم کی ہر ادائیگی شانِ محبوبیت جھلکتی نظر آئے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ قوم کی حالت یہ ہو گئی کہ لَهِمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا زَا وَ لَهِمْ آعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا زَا وَ لَهِمْ اُذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا زَا۔ کان اپنے ہیں لیکن سنتے ان کی قوتِ سماعت سے ہیں۔ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے ان کی بصارت سے ہیں۔ دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے ان کی عقل کی روشنی سے ہیں۔ اُولَئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۷۱/۴۹) یہ انسان نہیں بلکہ انسان نما حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے، نتیجہ یہ کہ ذہنوں میں افکارِ مستعار دلوں کے مقاصد و سرور کے پیدا کردہ، نگاہوں کے زاپیے اور اس کے متعین کردہ، زبانِ ان کی ہے بات ان کی۔ چراغ ان کا ہے رات ان کی۔ یہ تھی وہ تعلیم جس کے نتائج سے مردِ حق آگاہ کے کلمے میں ہو کر اٹھتی تھی اور وہ اس آتشِ خاموش سے پھک کر جس نے اس کے مغزِ استخوان تک کو جلا دیا تھا، بے اختیار کہتا تھا کہ،

مکتب از مے جذبہ دیں در ربود از وجودش این قدر دائم کہ بود

شیخ مکتب کم سواد و کم نظر از مقام او نہ داد او را خبر

وہ نوجوانانِ ملت کی چلتی پھرتی لاشوں کو دیکھتا اور نم آلود آنکھوں سے کہتا کہ

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

وہ جب ان مدعیانِ علم و مہنر کو دیکھتا کہ ان جھوٹے نگوں کی مینا کاری نے ان کی نگاہوں میں کس قدر خیرگی پیدا کر رکھی ہے تو وہ ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ جو درحقیقت اس کا خندہٴ زخمِ نہاں ہوتا تھا۔ ان سے کہتا کہ فریبِ باطل پر یہ فخر و ناز کس لئے جب حقیقت یہ ہے کہ:

ترا وجود سراپا تجلی افرانگ کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی ہے

فقط نیام ہے تو زرنکار و بے شمشیر

احساسِ خودی اور خود نگہی یہی شرفِ انسانیت کی اساس و بنیاد ہے اور اس تعلیم سے اسی کو فنا کیا جاتا ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ حقیقت شناس نگاہ اس زہرِ بلاہل کو کس طرح تریاق سمجھ سکتی ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ:-

بہ آں مومن خدا کار سے نہ دارد  
کہ در تن جان بیدارے ندارد  
ازاں از مکتبِ یاراں گریزم  
جو آنے خود نگہدارے ندارد  
باسلوبِ دیگر :-

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا  
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات  
بہت سچے کہ بیچارے مولوں کی نظر سے  
پوشیدہ ہیں باز کے احوال مقامات

وہ مکتب کے اس کارگہ شیشہ نماں کو بہ ہزار عبرت و ناستف دیکھتے اور جب انہیں نظر آتا کہ ان نوجوانانِ نیک طینت و پاک سیرت کو جن کے فولادی جوہروں کو شمشیر بے نیام بنا تھا کس طرح "جاپانی کھولنے" بنایا جا رہا ہے تو وہ اک صدائے دردناک و الم انگیز سے کہتے ہیں کہ:-

شکایت ہے مجھے یارتِ خداوندانِ مکتب سے  
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

پھر اتنا ہی نہیں کہ تعلیم کے اس نظام سے محکوم قوموں کے افراد کی خودی ہی کو فنا کیا جاتا ہے بلکہ قیامت

بلالائے قیامت کہ قوتِ حاکمہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں  
رکھ کر محکوم قوم کے صالح عنصر کو اس درجہ پاج اور مفلوج بنا دیتی

## معاش کی دستِ نگر می

ہے کہ وہ معاش تک کے لئے ان کی دستِ نگر ہو جاتی ہے اور پھر اس کے بعد جو کچھ جی میں آئے ان سے آسانی کر لیا جاسکتا ہے۔ یہ انسانی ذلت و پستی کی وہ انتہا ہے جس کا احساس ہر قلبِ حساس کو طلسمِ پیچِ دتاب بنائے رکھتا ہے۔ اسی انسانیت کش منظر کو دیکھ کر اس حکیم امت کا خون کھولنے لگتا ہے اور وہ درد و کرب کی انتہائی بیتابیوں کے ساتھ آہ سرد بھر کر کہتا ہے کہ

جو آنے خوش گلے رنگیں کلا ہے  
نگاہ او چو شیراں بے پنا ہے  
بہ مکتب علم میشی را بیا مونت  
میتسر نایدش برگ گیا ہے

کس قدر قیامت ہے کہ ابنِ آدم کو خودی جیسی متاعِ بے بہا کے بدلے روٹی کا ٹکڑا تک بھی

یسترنہ ہو۔ اس کا سرمایہ کونین چھین لیا جائے اور اس کے معاوضے میں اسے دو کف جو تک نہ مل سکے۔  
 نوا از سینہ مرغ چمن بُرد ز خون لاله آل سوز کہن بُرد  
 بایں مکتب بایں دانش چہ نازی کہ ناں در کف نداد و جاں ز تن بُرد  
 اسی لئے وہ اس نظامِ تعلیم و تربیت کو ملک الموت قرار دیتے ہیں۔ ضربِ کلیم میں مدرسہ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے  
 دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا  
 اس جنون سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا  
 فیضِ فطرت نے تجھے دیدہ شاہیں بخشا  
 مد سے نے تیری آنکھوں سے چھپایا جن کو  
 قبض کی فرح تری دے کے تجھے فکرِ معاش  
 زندگی موت کا کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش  
 جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش  
 جس نے رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش  
 خلوتِ کوہ و سیاہاں میں وہ اسرا ہیں فاش

اور اس کی ذمہ دار صرف وہ تعلیم نہیں جو مدرسوں اور کالجوں میں کتابوں کے ذریعے دی جاتی ہے بلکہ وہ تہذیب ہے جو عصر حاضر کا طرہ اقلیاز ہے اور جس نے ساری دنیا کو یوں جہنم زار بنا رکھا ہے۔ اسی کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ

## تہذیبِ عصر حاضر

جو انماں را بد آموز است این عصر شبِ ابلیس را روز است این عصر

بد انشس مثالِ شعلہ پیچم کہ بے نور است بے سوز است این عصر

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال تہذیبِ مغرب کے اس قدر مخالف کیوں تھے۔ کیا یہ مخالفت ملاکی وہ قدامت پرستی تھی جس کی رو سے ہر نئی چیز دوزخ میں پھینک دینے کے قابل ہوتی ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ حضرت علامہ کے نزدیک ایک جوئے رواں ہے جس کا کسی مقام پر بھی تھم جانا اس کی موت ہے اس لئے جمود و تعطل ان کے نزدیک فطرت کے ضابطہ قوانین میں جرمِ عظیم ہے جس کی سزا مرگِ مفاجات ہے۔ بنا بریں وہ علمی عروج اور ذہنی ارتقار کے کس طرح مخالف ہو سکتے ہیں۔ لہذا تہذیبِ مغرب سے ان کی مخالفت اور نفرت کی وجہ قدامت پرستانہ تعصب نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیبِ مغرب باطل کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس لئے ہر نیک و حق شناس اس میں فسادِ آدمیت کا جہنم مضمون دیکھے گی اور اس کی مخالفت کرے گی۔ تہذیبِ مغرب کیا ہے اور یہ کس طرح

باطل کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ حق کی بنیادیں کیا ہیں اور ان بنیادوں پر کس قسم کا قصر تہذیب تعمیر ہو سکتا ہے۔ ان سوالات کا جواب تفصیل طلب ہے اس لئے اس مقام پر اس سے بحث نہیں کی جاسکتی۔ اس مقام پر صرف اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ کسی قوم کی تہذیب اور حقیقت اس کے فلسفہ زندگی اور تصویر حیات کی محسوس مظہر ہوتی ہے۔

## مغربی فلسفہ حیات

اس لئے جب ہم کسی قوم کی تہذیب سے بحث کرتے ہیں تو دراصل یہ بحث اس قوم کے فلسفہ حیات سے متعلق ہوتی ہے۔ تہذیب مغرب کی بنیاد زندگی کے میکانیکی تصور (MECHANISTIC

CONCEPT OF LIFE)

پر ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ زندگی مادہ کے طبیعی ارتقار سے کسی نہ کسی طرح ظہور میں آگئی ہے اور جسم انسان ایک

(PHYSICAL EVOLUTION).

مشینی حرکت سے اسے قائم رکھ رہا ہے۔ مرور زمانہ سے جب یہ حرکت بند ہو جائے گی تو زندگی ختم اور انسان نسیاً منیاً ہو جائے گی۔ وَ قَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُغَيِّرُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ج (۲۴/۲۵) اور یہ کہتے ہیں کہ یہی طبیعی زندگی ہے۔ ہم اب زندہ ہیں۔ عناصر کا شیرازہ بگڑ جانے سے مر جائیں گے اور اس طرح مرور زمانہ ہمیں ختم کر دے گا۔ لہذا نہ انسانی تخلیق کا کوئی مقصد ہے نہ اس کے سفر حیات کا کوئی منتہی۔

درزگا ہش آدمی آب و گل است کاروان زندگی بے منزل است

اس تصویر زندگی کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی عزائم و اعمال کا معیار انفرادی اغراض یا زیادہ سے زیادہ افراد کے مجموعہ یعنی قوم کے مفاد کا حصول قرار پا گیا۔ مستحسن اعمال وہ جن سے افراد کو دولت و حشمت اور اقوام کو غلبہ و تسلط حاصل ہو جائے خواہ اس کے لئے کیسے ہی حربے کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں۔ جائز و ناجائز کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں انسان اپنے اعمال کے لئے کسی اقتدار اعلیٰ (HIGH AUTHORITY) کے سامنے جواب دہ ہو۔ یہاں افراد زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے سامنے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک جائز وہ جس سے قومی مفاد کا تحفظ ہو۔ قوم اپنے سے اوپر کسی اقتدار اعلیٰ کے سامنے ذمہ دار نہیں ہوتی اس لئے وہاں جائز و ناجائز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نظام تمدن و معاشرت کا فطری نتیجہ جنگل کا قانون ہے کہ "جس کی لاکھی اس کی بھینس" اس نظام نے دنیا کو کیا دیا۔ اس کے لئے اب کسی تحقیقاتی کمیشن

کی رپورٹ کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے نتائج ساری دنیا کے سامنے ہیں اور اور تو اور خود اس تہذیب و تمدن کے علمبردار اس کے ہاتھوں اس قدر تنگ آچکے ہیں کہ وہ اس جہنم سے نکلنے کی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔ وَمَا هُمْ بِمُخْرِجِينَ مِنَ النَّارِ مشہور مفکر پروفیسر میتن (MASON) اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے کہ

ہم نے اپنے زمانہ کی ابتداء سائنس کی کاریگری سے کی اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقودوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل کچھ ایسے سہل نہیں۔

اور فرانسیسی مفکر (RENE GUENON) لکھتا ہے کہ

عہدِ حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزل کی طرف گرتی گئی ہے حتیٰ کہ یہ انسان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر رک گئی ہے۔ اس کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جاتے۔ یہ نصب العین خود ایک فریب ہے.... جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود انہی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں..... مغرب کے غرق ہو جانے کا خطرہ سر پر ہے۔ وہ خود تو ڈوبے گا ہی لیکن اپنے ساتھ تمام نوع انسانی کو بھی اپنے منتشر افکار و اعمال کے گرداب میں غرق کر دے گا۔

(THE CIVILIZATION OF THE MODERN WORLD)

غور کیجئے کہ اس تہذیب نو کے علمبردار خود اس کے ہاتھوں کس درجہ نالائاں ہیں اور پھر سوچئے کہ جس دانائے راز کی فراستِ ایمانی اور بصیرتِ قرآنی نے اس کے سامنے ان حقائق کو بے نقاب کر دیا تھا اس نے کس قدر صحیح کہا تھا کہ :-

بیا کہ سازِ فرنگ از نو ابر افتاد است درونِ پردهٔ او نغمہ نیست فریاد است

یہ نتائج جن کو دیکھ کر یورپ کے مفکر اور اربابِ سیاست و تمدن یوں چیخ اٹھے ہیں، کوئی ہنگامی حادثہ اور اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ فطری نتیجہ ہیں اس تہذیب کا جس کی بنیادیں باطل پر استوار ہیں۔ چنانچہ تاریخ

تہذیب کا مشہور عالم (BRIEFAUT) اپنی کتاب (THE MAKING OF HUMANITY)

میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی قانون جس کی بنیاد باطل کے اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم و ضبط اور ادھر ادھر کی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔

اس ہیج زندگی اور آئین حیات نے خود یورپ کے نوجوان طبقہ پر کیا اثر کیا، اس کے متعلق کسی مشرق کے دقیانوسی فرسودہ خیال کی زبان سے نہیں بلکہ مغرب کے مبصر ڈاکٹر جوڈ کے الفاظ میں سنئے وہ لکھتا ہے۔ ہمارا نوجوان طبقہ شاہراہ زندگی پر بلا تعین مقصد چلا جا رہا ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم چل ہی کیوں رہے ہیں۔ نہ ان کے سامنے کوئی ضابطہ زندگی ہے نہ آئین حیات، نہ اقدار ہیں نہ معیار۔

اس بلا مقصد و معیار زندگی کا نتیجہ کیا ہے۔ اس کے متعلق مشہور فلسفی پیکال (PASCAL) نے لکھا ہے کہ انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے اور اس طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے مجرت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جب اسے ایمان اور مجرت کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بے کار اور خراب مقصد پر رکھ جاتا ہے۔ خلاقیت کے کارخانے میں محال ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جاتے تو بُرے راستے آئے خوش آتے ہیں۔

جو کچھ یورپ کے نوجوانوں کے ساتھ ہوا اس سے کہیں بدتر ہمارے نوجوان مشفقانہ پیکار طبقہ پر گزری۔ یہ تھا وہ جہنم جس سے بچانے کے لئے حضرت علامہ نے نوہالان ملت کو پکارا اور اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر پکارا کہ وہ غمگسار ملت جانتا تھا کہ ان کی تباہی سے قوم تباہ ہو جائے گی اور ان کے سنبھلنے سے ملت کا مستقبل سنبھل جائے گا۔ اس لئے اس نے نہایت مجرت اور شفقت سے انہیں اپنے قریب بلایا اور کہا کہ

یوں چراغِ لادہ سوزم درخیابانِ شما  
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما



غوطہ باز دور ضمیر زندگی اندیشہ ام  
تا بدست آوردہ ام افکار پنهان ششما  
بہر وہ دیدم نگاہم برتر از پرویں گزشتہ  
ریختم طرح حرم در کافرستان ششما  
حلقہ گرد من زیندایے پیکر ان آب و گل  
آتشے در سینہ دارم از نیاگان ششما

انہوں نے کہا کہ میں اپنی قوم کی ہی ماتھی سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کے پاس نہ ساز و براق ہے نہ ذرائع و اسباب۔ لیکن یاد رکھو! قوم کی حالت نگاہ کی تبدیلی سے بدلا کرتی ہے۔ خارجی انقلاب ہمیشہ دل کے انقلاب کا رہین منت ہوتا ہے۔ اس لئے اسباب و ذرائع کی کمی اور متاع و منال کے فقدان سے مت گھبراؤ۔

اگر یک قطرہ نون داری اگر مشیت پر داری

بیامن بانو آموزم طریق شامبازی را

پہلے اپنی نگاہوں میں تبدیلی پیدا کرو۔ دل میں قوتِ ایماں، نگاہوں میں نورِ بصیرت، بازوؤں میں جوششِ کردار، سامنے حق و صداقت پر مبنی نصب العین اور دماغ میں اس کے حصول کا ولولہ۔ اس ساز و سامان کو لے کر نکلو۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَ فُرْدٰی (۲۴/۲۶) اپنے اللہ کے لئے ایک ایک دودو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور حالات و کوائف نے تمہیں جس منزل میں رکھا ہے وہیں سے حصولِ مقصد کی ابتدا کرو۔

خیز و برداغ دل لالہ چکیدن آموز

پاس ناموس چمن دار و خلیدن آموز

صفت سبزہ دگر بار د میدان آموز

در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

آفریدند اگر شبنم بے مایہ ترا

اگر خار گل تازہ رے سے ساختہ اند

باغبان گزرخیا بان تو بر کند ترا

تا کجا در تہ بال دگر اں می باشی

اس مردِ حقیقت شناس نے ان کے سامنے آئینِ فطرت کا یہ عظیم الشان راز فاش کر کے رکھ دیا کہ قوموں کی کامیابی اور کامرانی کا انحصار نوجوانانِ ملت کی سیرت (کی ریکڑ) پر ہے۔

ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی

قلندری مری کچھ کم سکندی سے نہیں

اس لئے کہ انہیں محکم یقین تھا کہ

اگر ہواں ہوں مری قوم کے حضور وغیور

وہ انہیں مصافحہ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کرنے کی تلقین کرتا تھا اور اس لئے انہیں متنبہ کرتا تھا کہ  
 نہیں ہنگامہ پیکار کے لائق وہ جوان جو ہو انا لہ مرغان سحر مدہوش  
 مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری اور عیار میں یورپ کے شکر پارہ فروش  
 وہ انہیں برملا کہتا تھا کہ قوموں کی تقدیریں سہل انگاری اور عافیت کوشی سے نہیں بدل جایا کرتیں سلطنتیں  
 ریزولیوشنز پاس کرنے سے نہیں بلکہ ریزولیوشن (عزمِ راسخ) پیدا کرنے سے ملا کرتی ہیں تاج و شکوہ  
 خسروئی کے معاملے چمن زاروں میں طے نہیں ہوا کرتے۔

تختِ جم و دار اسیرا بے نفر و شنند  
 باخون و دلِ خویشِ خریدن و گم آموز

وہ جانتے تھے کہ غلط تعلیم و باطل تہذیب کے اثرات نے ان جوانوں کے جوہر مردانگی کو سلب ان کے  
 افکار کو آوارہ ان کی نگاہوں کو پریشاں اور ان کے قوائے عملیہ کو مضحمل کر رکھا ہے۔ اس لئے وہ قوم  
 کے اربابِ مسانید و فتادہ اور صاحبانِ دعوت و ارشاد کی توجہ اس نقطہ ماسکہ کی طرف مبذول کراتے  
 اور ان سے بار بار تاکید کرتے کہ

وے پیر حرم رسم درہ خانقہ ہی چھوڑ  
 اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت  
 تو ان کو سکھا غارہ تنگانی کے طریقے  
 دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی  
 مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا  
 وے ان کو سبق خود شکنی و خود نگری کا  
 مغرب نے سکھایا انہیں فنِ شیشہ گری کا  
 دار و کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

اس لئے ان کی پریشاں نظری دُور ہو جانے سے ان کے سامنے وہ درخشندہ نصب العین حیات  
 بے نقاب ہو جائے گا۔ جس کا حصول ملتِ اسلامیہ کا فتنہ اور تکمیلِ شرفِ انسانیت کی معراج  
 ہے۔ نصب العین کی صداقت اور اس پر محکم یقین انسانوں کی خواہیدہ قوتوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس  
 سے اس کے جگر میں خونِ سنون میں حرارت اور حرارت میں وہ شعلہ صفتی پیدا ہو جاتی ہے جو باطل کے  
 ہر خس و خاشاک پر برقِ خاطر بن کر گرتی اور اُسے راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہی وہ عقابانی روح  
 ہے جس کی بیداری میں امتوں کی حیاتِ تازہ کا راز پوشیدہ ہے۔

عقابانی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں  
 نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہ ہو تو امید تو میدی زوالِ علم و عرفاں ہے امیدِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں!  
 نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں  
 حضرت علامہ نے اپنے کلام میں جہاں جہاں شاہیں کو مخاطب کیا ہے اس سے مقصود قوم کا جسور و غیور  
 نوجوان ہے۔ اس طبقہ کی صلاحیتوں سے وہ کبھی ناامید نہیں ہوئے۔ وہ سمجھتے  
**شاہین زادگان** تھے کہ ان کے ممکنات کی وسعتیں کس قدر حدود فراموش اور قیود نا آشنا  
 ہیں۔ دیکھتے۔ یہ امیدوں کا شاہزادہ کس قدر شگفتہ و شاداب انداز میں اس کا ذکر کرتا ہے جب  
 کہتا ہے کہ:-

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی  
 یہ نم کیا تھا۔ بس اسی میں اقبال کے پیغام کا سارا راز مضمحل ہے۔ مغرب اپنے موجودہ نظامِ تمدن و  
 معاشرت کے ہاتھوں جگر فگار ہے۔ لیکن چونکہ اس کے سامنے حقائقِ ابدی کا کوئی ضابطہ نہیں اس  
 لئے اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس غارت گرا من و عافیت و ریزن متاعِ شرفِ انسانیت۔ تہذیب کی  
 تخریب کے بعد نظامِ انسانیت کو کن جدید بنیادوں پر استوار کیا جائے لیکن حضرت علامہ کے سامنے  
 تو حقائقِ ابدی کا وہ ضابطہ آئین و دستور کھلا رکھا تھا جس میں شرفِ انسانیت کے تقاضوں کی  
 تسکین کا سامان موجود ہے۔ اس لئے انہیں امتوں کے مرضِ کہن کا علاج تجویز کرنے  
**علاج** میں کچھ دقت نہ تھی۔ انہوں نے مریض کی نبض پر انگلیاں رکھیں اور اپنے یقین کی نچتگی  
 کے ساتھ اعلان کر دیا کہ:-

وہی ویرینہ بیماری وہی نامحکم دل کی علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی  
 ملت کی کشتِ ویراں کا نم اسی آبِ نشاط انگیز سے حاصل ہونا تھا جسے شران کہتے ہیں۔ اسی لئے  
 انہوں نے ملت کے نوجوانوں سے پوری قوت اور شدت سے کہا کہ یورپ آوارہ نظر اور پریشاں نگاہ  
 ہے۔ اس لئے تمہیں اس کی تقلید سے کیا حاصل ہوگا۔ تمہارے صحنِ چین میں تہذیب و تمدن کا وہ شجر  
 طیب سایہ فگن ہے جس کی جڑیں حقائقِ ابدی کی گہرائیوں میں اور جس کی شاخیں ہکشاں گیر ہیں۔  
 شَجَرَةٌ طَيِّبَةٌ أَصْدُهَا ثَابِتٌ وَفِرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ جو زمان و مکان کی حدود سے  
 ماوراء اور مشرق و مغرب کی ثغور سے بے نیاز ہے۔ لا شرقية ولا غربية جس کے برگ بار

کی تازگی و شگفتگی پر ہزاروں جنتیں پنچا اور اور لاکھوں بہاریں تصدق ہیں اور جسے دیکھ کر باغبانِ فطرت فرطِ مسرت سے والہانہ انداز میں جھوم اٹھتا ہے اور عاسدوں کے دل پر سانپ لوٹنے لگ جاتے ہیں یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّادَ (۲۸/۲۹) تم اس سدا بہار شجرِ مقدس کی شاخ سے گر پڑے ہو تمہیں تو صرف اتنا کرنا ہے کہ پھر سے اسی شاخ سے پیوست ہو جاؤ۔ زندگی کی تمام تازگیاں تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائیں گی اور کامیابیوں کے پھول اور کامرائیوں کے خوشے اس کا ما حاصل ہوں گے۔

دگر بشاخِ گل آویز و آب و نم برکش پریدہ رنگ ز بادِ صبا چہ می جوئی

بس اس کے لئے کرنا یہ ہے کہ مغرب کی باطل افروز تہذیب اور انسانیت سوز نظریہ زندگی کا جو رنگ تمہارے قلب و نظر کو آلودہ کر چکا ہے اسے الگ کر دو۔ یہ حصہ لا الہ ہے۔ اس کے بعد اس یقین کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دے دو کہ قرآن تکمیل شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ حصہ الا اللہ ہے۔ لا اور الا کے اس مجموعہ سے تمہاری داستانِ حیات نئے سرے سے مرتب ہو جائے گی۔

اے اسیرِ رنگِ پاک از رنگِ شو مومن خود کافرِ افرا رنگ شو

اس ایمان سے تمہاری نگاہ کا زاویہ بدل جائے گا اور جب نگاہ کا زاویہ بدل جائے گا تو ساری دنیا بدل جائے گی۔ یہ ہے اقبال کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام۔ وہ پیغام جسے انہوں نے "پیامِ مشرق" میں پسند باز باز کچھ خویش کے استعارے میں ان الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ شاہین اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے کہ

تو دانی کہ بازاں ز یک جوہر اند	دل شیر دارند و مشیت پر اند
نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش	جسور و غیور و کلاں گیر باش
میامیز با کبک و تورنگ و سار	مگر این کہ داری ہوائے نثار
شداں باشہ نچر نچر خویش	کہ گیرد ز صید خود آئین دیش
نگہ دار خود را و نور سندی	دلیر و درشت و نومندی
چہ خوش گفت فرزند خود را عقاب	کہ یک قطرہ خون بہتر از لعل ناب
زدست کے طعمہ خود میگر	نکو باش و پند نکویاں پذیر

قوم کے جس نوجوان میں یہ سیرتِ فولاد پیدا ہو جائے وہی قوم کی امیدوں کا سہارا اور اس کے

آسمان مستقبل کا درخشندہ ستارہ ہے۔

وہی جوان ہے قید کی آنکھ کا تار  
اگر ہو جنگ تو شیران غائب سے بڑھ کر  
عجیب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز  
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی  
نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو  
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب کاری  
اگر ہو صلح تو رعنا غزال تا تاری  
کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری  
کہ اس کے فکر میں ہے حیدری و کتراری  
یہ بے کلاہ ہے سرمایہ کلاہ داری

لیکن اقبال نے یہ سب کچھ اس زمانہ میں کہا جب قوم کو حصول مقصد کے لئے تیار کیا جانا مقصود تھا۔ یہ مقصد کبھی وہی تھا جسے اس مرد مومن نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر قوم کے سامنے پیش کیا تھا اور جو بعد میں پاکستان کے درخشندہ و محبوب تصور کی صورت میں وجہ شگفتگی قلب و نگاہ ہوا۔ اس وقت قوم کے نوجوانوں کے ذمہ صرف یہ فریضہ تھا کہ وہ اس سرزمین کو جو ان کے لئے مقدس ہو چکی تھی، انگریز اور ہندو کے قبضہ سے نکال کر اپنے حیظہ اقتدار میں لے آئیں۔ وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ لیکن اب نوجوانان ملت کے سامنے اس سے بھی بلند و بالا اور اس شد و اہم فریضہ آگیا اور وہ فریضہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ خدا کی جو زمین انہیں اس طرح حاصل ہو گئی ہے۔ اس میں خدا کے پاس ابدی قانون کو رائج کریں جس کے اتباع میں شرف انسانیت کے ارتقار کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ کام قوم کے نوجوانوں کے ہاتھ سے سرانجام پائے گا۔ وہ پیران کہن جنہوں نے اپنی زندگیاں ایک خاص بیج و اسلوب پر بسر کی ہیں اور ان کی عادات و امیال انہی روشوں پر سختی حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے لئے مشکل ہی نہیں (بعض اوقات) ناممکن ہوتا ہے کہ وہ ان قابلوں کو ٹوڑ سکیں جس میں ان کے پیکر ڈھل چکے ہیں۔ دنیا کے نظام کہن کی جگہ جہان نو کی تعمیر قوم کے نوجوانوں کی قوت بازو ہی سے ممکن ہے۔ اس لئے اقبال کی روح آج پاکستان کے ہر نوجوان سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

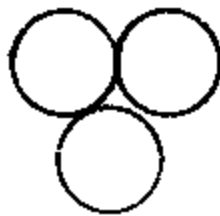
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اور جو سعادت مند اس کی اس دعوتِ حیاتِ بخش پر لبیک کہنے اس کے لئے پیغام یہ ہے کہ :-

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی رُخا  
پہلے اپنے سیکر خاکی میں جاں پیدا کرے  
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار  
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے  
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار  
تایہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے  
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب  
تا بدخشاں پھر وہی نعلِ گراں پیدا کرے

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار وہ  
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زہار وہ

( اپریل ۱۹۵۰ء )



# ضربِ الکلم

[ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مصر کے نہایت جلیل القدر اہل علم تھے۔ اقبال سے انہیں والہانہ عشق تھا۔ جب وہ بطور سفیر مصر پاکستان میں قیام پذیر تھے تو انہوں نے پرویز صاحب سے اقبال کا کلام لفظاً لفظاً سمجھا جتنا کچھ وہ سمجھتے تھے اسے عربی (نظم) میں منتقل کرتے چلے جاتے تھے۔ اسی بیج سے انہوں نے ضربِ کلیم کا منظوم ترجمہ مکمل کر لیا تو اس کا پیش لفظ بھی پرویز صاحب ہی سے لکھوایا۔ اس پیش لفظ کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے]

جس کتاب کا ترجمہ آپ کے پیش نظر ہے علامہ اقبال نے اس کا نام ضربِ کلیم رکھا اور خود ہی اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی۔

## اعلانِ جنگِ عصرِ حاضر کے خلاف

میرے نزدیک یہ الفاظ علامہ اقبال کی صرف ایک کتاب ضربِ کلیم ہی کے شارح نہیں بلکہ ان کے پورے پورے پیغام کے ایک عظیم حقے کے مفسر ہیں۔ اگر حضرت علامہ کے پورے پیغام کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو اہم حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ نفیرِ انقلاب ہے۔ اس "غیر منزل من اللہ" اسلام کے خلاف جسے عمی سازش نے نہایت سادگی اور پُرکاری سے وضع کیا اور دامِ بہرنگ زہین کی صورت میں عین اسلام بنا کر اس امت پر مسلط کر دیا جو ان غیرت آئی تصورات کو مٹانے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔ عجم کی یہ سازش درحقیقت انتقام تھی یہود و نصاریٰ و مجوس کی ان شکستوں کا جو انہیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی تیغِ حق کے مقابلے میں اٹھانی پڑیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ملتِ مجاہدین کی

قوت و سطوت کا راز قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہذا انہوں نے ایسی چال چلی کہ مسلمانوں کو قرآن سے یکسر بے گانہ بنا کر غیر قرآنی اسلام کے فریب میں الجھا دیا اور یہ کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوح مسلم اس سرابِ رنگ و بو کو سچ مچ کا گلستان سمجھنے لگ گیا۔ یونان کا خواب اور فلسفہ حشیشیں، مجوس کی علامتہ نسل پرستی، یہود کی قشری شریعت رسومات، رہبانِ نصاریٰ کی مرگ آفریں خانقاہیت ایک ایک کر کے اسلام کے لاینفک اجزا بن گئے اور اس طرح یہ ملت جو کبھی ذوقِ عمل سے شعلہ جوالہ تھی، کوتاہی عمل سے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اقبال کے پیغام کا ایک حصہ اسی "غیر منزل من اللہ" اسلام کے لئے پیامِ مرگ اور قرآنی اسلام کے احیاء کے لئے نشیدِ حیات تھا۔

علامہ کے پیغام کا دوسرا حصہ اس فتنے کے خلاف احتجاجِ مسلسل تھا جو تہذیبِ مغرب کے رنگ میں طوفانِ در طوفان اُٹھ چلا آ رہا تھا اور جس کی موج انگریز طغیانیاں تھیں۔ امتِ اسلامیہ کی نژادِ نو کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہی ہے۔ ضربِ کلیم اس تہذیبِ عصرِ حاضر کے جنودِ عساکر کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

سوال یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر کہتے کسے ہیں اور اقبال نے اس کی اس قدر مخالفت کیوں کی؟ اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے۔ جس شخص کے سامنے قرآن کے اوراق کھلے ہیں اس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ اسلام ایک ضابطہ حیات اور نظامِ زندگی ہے جسے اللہ تعالیٰ کی اصطلاح سے **اسلامی تہذیب** تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدودِ متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اختیار کا استعمال کر سکتا ہے۔ یہ نصب العین اور حدود و نوں غیر متبدل ہیں۔ انہی کو ابدی صداقتیں یا مستقل اقدارِ زندگی کہا جاتا ہے۔

قرآن کی رُو سے، اگرچہ حیات کی نمود مختلف پیکروں میں ہوتی ہے لیکن حیات کا سرچشمہ ایک ہے اور یہی سرچشمہ ان ابدی صداقتوں کی اصل ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ سرچشمہ حیات اور ابدی صداقتوں کے سرچشمہ کی وحدت کے عقیدے سے فطری طور پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ:



(د) ہر انسان من حیث الانسان زندگی کی ممکنات اپنی ذات میں مضمر رکھتا ہے جن کی نشوونما اور نمود زندگی کا مقصود ہے۔ ان جو ہر مضمر کی بختگی اور تابندگی سے انسان میں شانِ انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا تحفظ بقا اور تسلسل (بعد از ممات) انسانی جدوجہد کا حاصل ہے۔

(ب) تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی لسانی نسلی اور وطنی حدود سے متاثر نہیں ہوتی۔

(ج) تمام نوع انسانی کی فلاح کار از ایک ہی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے جو وحی کے ذریعہ مل سکتا ہے اور جو آج اس آسمان کے نیچے قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ان محکم اصولوں کی بنیاد پر اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں نوع انسانی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی شرفِ انسانیت کے سدرۃ المنتہی تک جا پہنچے۔ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:-

۱۔ اس میں افراد معاشرہ اپنے اندر ان صفاتِ خداوندی کو منعکس کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جنہیں قرآن اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے اور جو کائنات میں مستقل اقدار کا سرچشمہ ہیں۔

۲۔ ان افراد میں ایسا ضبط پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ان صفات میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اسماء کے لئے حسنیٰ کی شرط ضروری ہے اور حسن نام ہے تناسب کے اعتدال کا۔

۳۔ ان افراد کی نگاہوں میں ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ صحیح صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں قسم کے خارجی حادثہ کی صورت میں فلاں قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہونا چاہیے۔

۴۔ ان افراد پر مشتمل جماعت میں اشیاءِ فطرت کی تسخیر کی قوت اور ان کے حاصل کو فلاحِ انسانی کے لئے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۵۔ وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت اور وحدتِ استلافِ ملت کے محکم تصور سے انسان اور کائنات، انسان اور انسان اور خود انسان کے اپنی ذات کے تضادات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے جس سے انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں ملتتی چلی جاتی ہیں۔

۴. اس جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو خدا کی صفت رب العالمین کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ انسانیت کی رپوتیت کا کفیل بن جاتا ہے۔ اس طرح تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی بھی از خود پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کامل نشوونما کے اسباب و وسائل بھی یکساں طور پر میسر آتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی کی جوئے رواں ہنستی کھیلتی قہقہے کرتی شادیاں و فرحان اقطار التمنوت والارضین سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے مختصر سے الفاظ میں شرآنی تہذیب کا ماحصل۔ اس کے برعکس تہذیب عصر حاضر اس

**تہذیب مغرب** تہذیب کی یکسر نقیض ہے۔ اس تہذیب کی عمارت اس فلسفہ کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے کہ مادی عناصر کے محض اتفاقہ طور پر یکجا ہو جانے سے حیات وجود میں آگئی اور ان عناصر کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دنیا ہی مادی عناصر کی دنیا ہے جس میں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لہذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں نہ قانون مکافات عمل۔ خیر وہ ہے جس سے کسی فرد یا افراد کے گروہ یا قوم کو ذاتی مفاد حاصل ہو جائے (خواہ اس سے دوسرے افراد یا دوسری اقوام کی رگ حیات ہی کیوں نہ کٹ جائے) اور شر وہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کا ذاتی نقصان ہو۔ ہر فرد یا قوم کا نصب العین حیات منفعت خویش کا حصول ہے اور علم و عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس منفعت کے حصول کے لئے اسباب و تدابیر اور حیل و مکائد فراہم کرے۔ اس فلسفہ حیات (یا تہذیب عصر حاضر) کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر خود اہل مغرب کی تحقیق کے مطابق وہاں کی آبادی کا ہر چھٹا فرد ایسا ہے جسے عمر کا کچھ نہ کچھ حصہ پاگل خانے میں گزارنا ہو گا اور اجتماعی طور پر یہ عالم ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں یا تو باہمی کشت و خون میں مصروف پیکار رہتی ہیں یا اس کشت و خون کی تیاری میں مشغول۔

اقبال نے اقوام مغرب کے فلسفہ حیات اور نظریہ سیاست و عمرانیت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جس سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ فلسفہ حیات اور منہاج زندگی دنیا میں جہنم پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ دوسری طرف قرآنی بصیرت نے اس پر حقائق زندگی کو اس طرح واضح و آشکار کر دیا کہ وہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں اور ہواؤں میں مستور طوفانوں کو بے حجاب اپنے

سامنے دیکھ لیتا تھا۔ یہی تھی وہ شہ آنی بصیرت جس کی بنا پر اس نے ۱۹۰۷ء میں اقوامِ مغرب کو لٹکار کر کہہ دیا تھا کہ:-

تمہاری تہذیب اپنے پنجے سے آپ ہی خود کشی کرے گی  
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس وقت سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اقبالؒ اقوامِ مغرب کو بالعموم اور ملتِ اسلامیہ کو بالخصوص انذار و تنذیر کا نام ہے ضربِ کلیم جس سے اقبالؒ بتکدرہ عصر حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت، ہمانیت اور قارونیت ہی کے نگاہ فریب سحر کو نہیں توڑتا بلکہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کو قندیلِ قرآنی کی روشنی میں فاران و سینا کی ان محفوظ و بابرکت واویلوں میں لے جاتا ہے جہاں زمین سے فوز و فلاح کے چشمے اُبلتے اور آسمان سے رشد و سعادت کے من و سلوی اُترتے ہیں۔

پیامِ اقبالؒ کی خوش بختی ہے کہ وہ رفیقِ محترم، صاحبِ السعادة عبد الوہاب عزام بے کی "خاراشگانی" اور "جوائے شیر" کے تصدق تنگنائے اُردو سے نکل کر بحیرہ عرب میں بادِ باں کشا ہوتا ہے اور اس طرح اپنی اس افادیت کو جو اس وقت تک شہ مندرہ ساحلِ بھٹی بیکراں بنا رہا ہے اور خوش بختی ہے خود عربی بولنے والی ملتِ اسلامیہ کی جو اس پیامِ حیات بخش سے جو معنوی لحاظ سے ان سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود لفظی اعتبار سے اتنا دور تھا، شرفِ تعارف حاصل کر رہی ہے۔

خدا کرے یہ پیامِ انقلاب سرزمینِ عرب کے لئے پھر وہی تخمِ صالح بن جالے جس سے ایک مرتبہ پہلے وہ شجرِ بندوبال پیدا ہو چکا ہے جس کی رفتوں کے متعلق اَضْلٰهَا ثَابِتَةٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ کہا گیا تھا اور جس کی ہمہ گیر پہنائیوں کو لا شَرْقِيَّةٌ وَ لَا غَرْبِيَّةٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس شجرِ طیب و مبارک کی روئیدگی و بار آوری صرف قرآنی ماحول میں ممکن ہے اور یہی پیامِ اقبالؒ کا مقصود و منطوق ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن      نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

یہاں تک تو ضربِ کلیم کے متعلق ہوا۔ اقبال کے عمومی مطالعہ کے ضمن میں ایک چیز ایسی ہے جسے مد نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اقبال کی شاعری میں عربی اقبال کی اصطلاحات اور فارسی لغت کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جنہیں وہ ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ کلامِ اقبال کی خاص اصطلاحات ہیں۔ جب تک ان الفاظ کے اصطلاحی معانی سمجھ میں نہ آئیں اقبال کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ مثلاً علم و عشق، عقل و دل، ذکر و فکر، خبر و نظر، سوز و ساز، یاد و لیش، قلندر، مردِ سحر وغیرہ الفاظ اسی قبیل کے ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن وہ اصطلاح جو فکرِ اقبال میں محور کا حکم رکھتی ہے اور جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے خودی ہے۔ اقبال سے پہلے یہ لفظ ہمارے ہاں غرور اور تکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اقبال نے اسے بالکل جداگانہ معنی پہنا دیتے۔ اور یہ مفہوم اب اس درجہ رائج ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے قدیمی معانی بالکل نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

خودی — سے اقبال کا مفہوم کیا ہے اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دینا آسان نہیں۔ اس لئے کہ اقبال کا فلسفہ درحقیقت فلسفہ خودی ہے اور جب تک اقبال کا پورا فلسفہ سامنے نہ آجائے اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس تفصیل و اطناب کا یہ موقع نہیں ہے لیکن چونکہ ضربِ کلیم میں بھی یہ لفظ بار بار سامنے آئے گا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قلیل ترین الفاظ میں اس اصطلاح کا طائرانہ سا تعارف کرا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی انفرادیت، شخصیت یا انا کوئی مستقل حقیقت ہے یا محض فریبِ تخیل؟ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے مفکرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہ ہوگی۔ افلاطون اور اس کے اتباع میں حکمائے ایران اور ہند اس نتیجہ پر پہنچے کہ کائنات میں صرف حیاتِ کلی کا وجود ہے۔ اس لئے انسانی ذات (انا یا شخصیت) محض فریب ہے۔ یہ فریبِ عمل کے زور پر قائم رہتا ہے اور عمل کی بنیاد آرزو پر ہے۔ لہذا اس فریب سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ترکِ آرزو سے ترکِ عمل کرے اور اس طرح انسانی ذات کا حجاب ٹوٹ کر حیاتِ کلی کے بحر میں گم ہو جائے گا۔ اس (فنائے ذات) کا نام نجات ہے اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ یہی وہ فلسفہ حیات تھا جو ہمارے

ہاں نظریہ وحدت الوجود کے نام سے رائج ہوا اور جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل قوم کو خاک کے آغوش میں سُلا دیا۔

اقبال نے اس فلسفہ حیات کے خلاف مسلسل احتجاج کیا اور اس کے برعکس فلسفہ خودی پیش کیا۔ اس فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر یا کئی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے جس سے انسانیت کی شخصیت یا انفرادیت متشکل ہوتی ہے۔ لہذا انسانی زندگی کا مقصود فنا تے ذات نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے۔ اقبال کے نزدیک ہوں ہوں انسان اس فردِ کامل و نادر کی مانند ہونا جاتا ہے (جسے انا تے مطلق یا خدا کہتے ہیں) وہ خود بھی منفرد اور نادر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے۔ "خدا کی مانند" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس اور اس طرح اس انا تے مطلق کو اپنے اندر جذب کرتا جائے۔ خودی کے ضعف اور استحکام کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنے والے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مادہ شر ہے اور اس لئے قابلِ نفرت۔ مادہ شری نہیں بلکہ یہ زندگی کی خواہیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جب انسانی خودی موانعات پر غلبہ حاصل کرنے سے سچتہ ہو جاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس طرح انسانی زندگی دوام سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ بنا بریں ہر وہ عمل

## مراحلِ ثلاثہ

جس سے خودی میں استحکام پیدا ہو خیر ہے اور ہر وہ کام جس سے خودی کمزور ہو جائے شر ہے۔ اقبال کے نزدیک ارتقاء تے خودی کا پہلا مرحلہ تخلیقِ مقاصد یا تولیدِ آرزو ہے۔ آرزو عین حیات اور اصلِ قوت ہے۔ کیونکہ یہی عمل کی محرک ہوتی ہے۔

تخلیقِ مقاصد کے بعد دوسرا مرحلہ حصولِ مقاصد کے لئے جہدِ مسلسل ہے۔ حصولِ مقاصد کے لئے اس تپش و خلش کا نام اقبال کی اصطلاح میں عشق ہے۔ اس جہد و جہد کی کامیابی کے لئے تین شرائط ناگزیر ہیں۔ اول اطاعت۔ اطاعت سے مراد ہے قوانینِ خداوندی (قرآن) کا کامل اتباع جس کے لئے قرآنی معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے۔ اس اطاعت سے انسان کے اندر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے اور یہ دوسری شرط ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کا دباننا نہیں بلکہ امالہ یا کظامت (زائد قوتوں

کارخ دوسری طرف بدل دینے) سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے۔ اس توازن کی اکمل ترین شکل ذاتِ خداوندی ہے جس میں متضاد صفات کا باہمی توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔

اس تطہیرِ کرد و عمل اور تہذیبِ نفس سے انسان اس مقام تک جا پہنچتا ہے جسے اقبال نیابتِ الہیہ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تیسری شرط ہے۔ نیابتِ خداوندی سے اقبال کا مفہوم وہ قوتِ مجرہ ہے جو دنیا میں تو انہیں خداوندی (ضابطہ قرآنی) کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنتی ہے (نیابتِ الہیہ سے مراد یہ نہیں کہ انسان خدا کا قائم مقام یا جانشین بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ جانشینی صرف اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو)۔ یہ مقامِ مومن ہے اور یہی مقامِ اقبال کے نزدیک استحکامِ خودی کا آخری نقطہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان ساری دنیا پر غالب آجاتا ہے۔ دنیا اس پر غالب نہیں ہوتی۔ اس کیفیت کا نام اقبال کی اصطلاح میں فقر، درویشی یا قلندری ہے یعنی سب کچھ مستخر کر لینے کے بعد وہ استغناء جو اللہ کی صفتِ صمدیت اور غنی "عَنِ الْعَالَمِينَ" کا مظہر ہو۔ اس قسم کے افراد پر مشتمل جماعت کا نام امتِ مسلمہ ہے اور اسی جماعت کی نشاۃ ثانیہ، پیامِ اقبال کا منتهی و مقصود۔ وہ امت جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

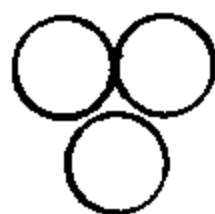
میانِ امتاں والا مقام است      کہ آلِ امت دو گیتی را امام است  
نیاساید ز کارِ آفرینش      کہ خوابِ و خستگی بردے حرام است

اور

بہاغاں عندی بے خوش صغیرے      براغاں جزہ بازے زود گیرے  
امیرا و سلطانی فقیکرے      فقیرا و بہ درویشی امیرکے

لتکونوا شهداء علی الناس و یکون الرسول

علیکم شہیداً



# مقامِ اقبال

صَدَدُ نَہَاکِ شَمَلَمُ کِی اِیْکُ تَقْرِیْرُ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کے الفاظ کو یاد رکھا اور اس طرح یاد رکھا کہ اس کی نظیر دنیا کی کسی اور قوم میں نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اس کے مفہوم و معانی کو جس طرح سے بھلایا ہے اس کی مثال بھی شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ صدیہ اول کے بعد جو مشران نگاہوں سے اوجھل ہونا شروع ہوا ہے تو رفتہ رفتہ وہ غیر اسلامی تصورات کے غلافوں میں اس طرح چھپ گیا جیسے چاند گہن میں آجائے۔ صدیاں اسی طرح گذر گئیں اور پھر یہ حالت ہو گئی کہ پہلی غیر اسلامی تخیلات عین اسلام بن گئے۔ اب مسلمانوں سے ان معتقدات کو چھڑانا جو انہیں اسلاف سے وراثت میں ملے ہیں، ان کی نگاہ میں انہیں دین سے بے گناہ بنانا تھا۔ ادھر یہ حالت تھی۔ ادھر یورپ کے میکانیکی تصور حیات کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ سے ماورائے عقل (یعنی وحی) کی ضرورت اور اس کے تاثرات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانا شروع کر دیا اور اس طرح ان کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا۔ مذہب پرست طبقہ اپنی جگہ نوحہ کنال تھا کہ نوجوان طبقہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہوتا جا رہا ہے۔ اور نوجوان طبقہ شکوہ سنج تھا کہ جس چیز کو ان کے سامنے حقیقت و بصیرت کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے اس سے ان کی فطرت ابا کرتی ہے۔ غرضیکہ — ”مسجدیں مرثیہ خواں تھیں کہ نمازی نہ رہے“ اور بے نمازوں کو شکایت تھی کہ نمازیوں میں — وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے۔ مذہب کے

مذہبیوں کو ہر مقام پر شکست ملتی تھی۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں تو یہ جو ہر موجود ہے کہ انسان علم و عقل اور تجارب و مشاہدات کی جن بندیوں تک جی چاہے اڑتا جائے قرآن اس سے بھی آگے نظر آئیگا۔ لیکن جن عجمی تصورات کو اسلام کہہ کر پیش کیا جا رہا تھا وہ تو انسانی دماغ کی کاوش ہی کا نتیجہ تھے۔ ان میں یہ صلاحیت کیسے پیدا ہو سکتی تھی کہ وہ زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے۔ غرضیکہ دنیائے اسلام عجیب بیچ و تاب میں تھی اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے کہ ایسے میں مہدار فیض کی کرم گستری نے ان میں ایک ایسی گراں مایہ ہستی کو پیدا کر دیا جس کی نگاہ دور رس نے انسانی تختیلات کے توہر توہر دوں کو قرآن کریم سے ہٹا کر عروسِ حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا اور وہ اسلام جو مدت ہائے دراز سے عجمی انہوں کی چیتاں بن چکا تھا پھر سے اپنی اصلی حالت میں پہچانا گیا۔ خدائے ذوالمنن کی موبہبت کبریٰ سے اس شخص کو دماغ ایسا عطا ہوا جو علم و حکمت کے بلند ترین مقام تک پہنچ چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی قرآن کی محبت نے اس کے سینے میں وہ قلب روشن رکھ دیا جسے صہبائے ایمان کا شفاف آئینہ کہنا چاہیے۔ ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی جو ہزار پرووں میں چھپی ہوئی حقیقت کو بھی بے نقاب دیکھ لے۔ اس ننگہ حقیقت شناس کا نام تھا اقبال۔

جب سے مسلمانوں میں مرکزیت فنا ہوئی تھی ان کے ہاں بھی وین اور دنیا دو الگ الگ شعبے قائم ہو چکے تھے، جس طرح عیسائیت میں کلیسا اور سلطنت اور ہندوستان میں گریہت آشرم اور سنیاں آشرم تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک بھی دنیا ایسی قابل نفرت شے بن چکی تھی کہ ہر مہر آبا و منبر سے یہ آواز بلند ہوتی تھی کہ دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا۔ اقبال نے آکر بتایا کہ یہ نظریہ بکسر غیر اسلامی ہے۔ قرآن اپنے ماننے والوں کے لئے ایک مکمل دستور حیات پیش کرتا ہے۔ ایک ایسا نظام زندگی مرتب کر کے دیتا ہے جو ان کی ہر قدم پر راہنمائی کرتا ہے۔ سیاست، مدنیت، عمرانیت، سب دین ہی کی شاخیں ہیں۔ یوں سمجھئے کہ دنیا کا ہر وہ کام جس کی بنا تقویٰ پر ہو، عین دین ہے۔ پھر اقبال نے اس حقیقت کو محض ایک نظری اور اجمالی حیثیت ہی سے پیش نہیں کیا بلکہ دنیا کے ہر نظام زندگی کے تجزیہ کے بعد بتا دیا کہ اس میں کیا خرابیاں ہیں اور اسلامی نظام



کس طرح انسانیت کو اس کی منزل مقصود تک پہنچانے کا واحد اور مکمل ذریعہ ہے۔

دین کے متعلق یہ غلط نظر یہ بھی رائج ہو چکا تھا کہ اس سے مقصود محض انفرادی نجات ہے۔ ملت

اجتماعی زندگی | کے اجتماعی معاملات "دنیا داروں" کے لئے ہیں۔ یہ عملی رہبانیت کا تصور

بتایا کہ انفرادیت کی زندگی کبھی اسلامی زندگی نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے

جس میں ہر فرد ملت کا ایک زندہ رکن ہے۔ انفرادی اصلاح اس لئے ضروری ہے کہ ان افراد کے

مجموعہ سے جو قوم بنے وہ از خود اصلاح یافتہ ہو۔ لیکن اگر افراد کے سامنے اجتماعی تصویر حیات نہیں تو

وہ لاکھ اصلاح یافتہ ہوں، مقصد زندگی سے بہت دور ہوں گے۔ اسلام جماعت ہے اور جماعت

نام ہے ایک نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا۔ یہ نظام مرکز سے قائم ہوتا ہے اور مرکز ملت وہ

ادارہ ہے جو قرآنی احکام کی تنفیذ و ترویج کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی کو خدا کی بادشاہت کہتے ہیں یعنی

قرآنی نظام مملکت۔

دین کے متعلق یہ تصور بھی ذہنوں میں جاگزیں ہو چکا تھا کہ عبادات و اعمال کے نتائج محض

آخری زندگی میں جا کر مرتب ہوں گے۔ ثواب نام رہ گیا تھا ایک ایسے مبہم تصور کا جس کی کوئی

محسوس توجیہ اس زندگی میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اقبال نے آکر بتایا کہ قرآن کی رو سے اعمال

صالحہ سے مفہوم یہ ہے (بلکہ یوں کہتے کہ اعمال کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے) کہ وہ انسان میں یہ صلاحیت

پیدا کر دیں کہ وہ موجودہ زندگی میں عزت و وقار، شوکت و حشمت، دولت و ثروت، حکومت و سلطنت

کی زندگی بسر کرے اور اس کے بعد کی زندگی میں وہ تمام کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب ہوں جو انسانی

آرزوؤں کا منتہی ہیں۔ اعمال و عبادات اگر یہ نتائج مرتب نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ اس طریق کار میں

کہیں نہ کہیں خرابی ضرور ہے۔ اور وہ خرابی یہ ہے کہ آج وہ نظام زندگی مفقود ہے جس کے اندر رہتے

ہوتے یہ اعمال حقیقی معنوں میں اعمال صالحہ بنتے تھے۔

پھر مذہب کے متعلق یہ عقیدہ پیدا ہو چکا تھا کہ مذہب جتنا کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا۔

اس کے بعد کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مذہب کے متعلق مزید تحقیق و اجتہاد سے مسائل زندگی کا ایسا حل تلاش کرے جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دنیا کہیں سے

## اجتہاد

کہیں پہنچ گئی لیکن مسلمان ایک ماضی پرست قوم بن کر زندگی کی دوڑ میں صدیوں پیچھے رہ گئے۔ اقبال نے یہ بتایا کہ دین کے مکمل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ضروریات زندگی کے متعلق سینکڑوں برس پیشتر ایک خاص ماحول اور خاص معاشرہ کے تقاضوں کے مطابق جو جزئیات مرتب ہوئی تھیں وہ ابدی طور پر غیر تبدیل رکھی جائیں گی۔ ختم نبوت اور اکملیت دین سے مقصود یہ ہے کہ اصولی طور پر انسانی تقاضوں کی تسکین کے لئے جو کچھ درکار تھا وہ وحی کے ذریعہ انسانوں تک آچکا ہے۔ اس میں کسی رد و بدل اور حک و اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اب ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جزئی مسائل کا حل ساتھ کے ساتھ مستنبط ہوتا رہے گا۔

یورپ اس لئے تباہ ہوا کہ اس کے پاس مسائل حیات کے حل کے لئے کوئی ایسا غیر تبدیل ضابطہ آئین نہ تھا جو وحی کی محکم بنیادوں پر قائم ہو اور مسلمان اس لئے تباہ ہوئے کہ انہوں نے بدلتے رہنے والے فرعی مسائل سے متعلق احکام کو بھی غیر تبدیل سمجھ لیا۔ ماضی سے تمسک اس لئے مفید ہے کہ جو عملی سرمایہ ہمارے اسلاف ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں اس کی مدد سے ہم اپنے مستقبل کو درخشندہ تابناک بنائیں نہ یہ کہ ماضی تو درخشندہ اور روشن رہے اور مستقبل تاریک سے تاریک تر ہونا چلا جائے۔

(۱)

ایک طرف اقبال نے مذہب پرست طبقہ کے سامنے دین کے وہ حقائق پیش کئے جن کی رو سے وہ اسلام جو ایک عرصہ سے متاعِ گم گشتہ ہو چکا تھا پھر سے آنکھوں کے سامنے آگیا۔ دوسری طرف انہوں نے یورپ کے مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے روکنے کی فکر کی۔ یورپ بزمِ خویشی ہر نظر پر علم و عقل کی روشنی میں پرکھنے کا مدعی تھا اور اس نظر فریب خوش آئند دعویٰ کے ماتحت وہ مسلمانوں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مذہب سے برگشتہ کئے جا رہا تھا۔ ہمارے مذہب پرست طبقہ کے پاس اس الحاد و بے دینی کا علاج سوائے فتاوائے کفر کے اور کچھ نہ تھا۔ کیونکہ نبی اکرم کا یہ ارشاد گرامی ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا کہ دشمن کا مقابلہ اس تسم کے ہتھیاروں سے کر دو جو اس کے پاس ہوں۔ اقبال حکمت و فلسفہ کی ان بندیوں تک پہنچ چکا تھا کہ خود اہل یورپ

اسے ائمہ فن میں سے تسلیم کرتے تھے۔ ان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس نے قرآن کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس طرح اہل یورپ کی مادہ پرستی کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھر دیں۔ اس نے بتایا کہ وہ دین جو قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے کس طرح عین علم و بصیرت ہے اور وہ ظن و قیاس جسے یورپ علم و بصیرت سمجھ رہا ہے کس طرح جہل و ظلمت۔ یورپ کی مادہ پرستی اسے اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی سلسلہ ارتقار کی آخری کڑی ہے۔ اس کے بعد فنا ہے۔ لہذا آخری زندگی کا عقیدہ ایک واہمہ ہے۔ اقبال نے نظریہ ارتقار کے مسلمات سے اس حقیقتِ علمی کو واضح کر دیا کہ موجودہ زندگی سلسلہ ارتقار کی آخری کڑی نہیں بلکہ ایک آنے والی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو بڑھتی چلی جائے گی۔ اقبال نے اس قرآنی نظریہ حیات کو علمی اکتشافات کی روشنی میں پیش کر کے صرف یورپ کی مادہ پرستی ہی کا ابطال نہیں کیا بلکہ تمام نوع انسانی پر اس کا احسان ہے کہ اس نے انسانیت کو اس کی صحیح قدر و قیمت سے متعارف کر اکر انسان کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا کہ وہی انسان جو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے بعد مٹی کا ایک ٹودہ بن کر رہ جاتا تھا اب ایک ایسی حیاتِ جاوداں کا پیکر بن گیا کہ موت اس کے نزدیک ایک شبِ تاریک کے بعد نورانی صبح کے طلوع کا نام ہو گیا جب زندگی کے متعلق یہ یقین ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے انسان میں اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس بھی بیدار ہو جاتا ہے اور یہی وہ احساس ہے جس سے دنیا میں عدل و انصاف قائم رہ سکتا ہے۔

یورپ کے نظریہ مادہ پرستی نے ایک اور بھی ہلاکت آفریں خرابی پیدا کر رکھی ہے۔ مادہ پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر شے کی قدر و قیمت مادیت کی میزان ہی سے متعین کرتا ہے جب کوئی کمزور و ناتواں کسی صاحبِ قوت سے امداد کا طالب ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کاروباری نقطہ نگاہ سے اس کمزور کی مدد کرنا زیادہ منفعت بخش ہے یا اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے ہڑپ کر جانا زیادہ سود مند۔ وہ دنیا کے ہر معاملہ کو اسی "کاروباری میزان" سے تولتا ہے اور جو شکل اسے زیادہ منفعت بخش دکھائی دیتی ہے اسے بلا تامل اختیار کر لیتا ہے۔ یورپ کا جدید "ضابطہ اخلاق" دکہ اگر اسے "اخلاق" کہا جاسکے، اسی اساس پر قائم ہے اور دنیا آج جس جہنم سے گزر رہی ہے وہ اسی اصل و اساس کا فطری نتیجہ ہے۔ اقبال نے آکر بتایا کہ یہ ضابطہ معاشرت ابلیسانہ مکر و فریب

کا جال ہے۔ وہی معاشرت دنیا کو جنت میں تبدیل کرنے کا موجب بن سکتی ہے جو وحدتِ خالق کے ایمان کی بنا پر وحدتِ خلق کی محکم اساس پر استوار ہو۔

مادہ پرستی کی اس لعنت سے ایک اور مصیبت شروع ہو جاتی ہے چونکہ مادیت سے انسان کی نگاہیں ہمیشہ محسوسات میں گھری رہتی ہیں اس لئے انسانوں کی تقسیم محسوس حدود و قیود کی رُو سے کی جاتی ہے اور زبان، رنگ، نسل یا وطن کی تفریق سے انسانی جماعتوں کی تشکیلیں ہوتی ہیں۔ یہ وہ جہالتِ کبریٰ ہے جو آج انسانیت کی امن سوزی کی سب سے بڑی ذمہ دار ہے۔ اقبال نے آکر دنیا کے سامنے قرآن کی اس بلند

### وحدتِ انسانیت

حقیقت کو پیش کیا کہ یہ "تقسیمِ انسانیت" کس درجہ تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اس نے بتایا کہ قرآن کی رُو سے تمام انسانوں کی تخلیق، نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے اور ان کی وجہ تکریم ان کے جوہر ذاتی ہیں نہ کہ نسبتی تعارف۔ لہذا، انسانی جماعت کی تشکیلیں اسی معیار کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس نے سیاستِ حاضرہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ساری دنیا سے پکار کر کہہ دیا کہ جب تک تمہارا نظریہ قومیت نہیں بدلتا دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی قرآنی نظریہ تقسیمِ انسانیت کی رُو سے اس نے ہندی مسلمانوں کی سیاست کا رخ لندن اور سومنات سے کعبہ کی طرف پھیر دیا اور نہایت بلند آہنگی سے برملا کہہ دیا کہ — ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے۔ اسی الگ نظریہ قومیت سے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا سوال پیدا ہوا جس نے آج پاکستان کی جیتی جاگتی شکل اختیار کر لی ہے (اللہ سے اپنوں اور بیگانوں کے ہر شتم و ارادہ سے محفوظ رکھے اور اسے قرآنی نظام کی ترویج و تنقیذ کا گہوارہ بنائے کہ یہی اس مردِ رویش کی آو سحری اور نالہ نیم شبی کا مقصود تھا)۔

یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک حقیقی اقبال کی۔ وہ اقبال جو اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا تھا بلکہ ہر مسئلہ کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرتا تھا۔ ہم اقبال کو نہ معصوم سمجھتے ہیں نہ اس کے فکروں اجتہاد کو منزہ عن الخطا۔ وہ قرآن کا ایک طالبِ العلم تھا اور ساری عمر طالبِ علم رہا۔ اس لئے اس کے فکری نتائج حرفِ آخر نہیں ہو سکتے۔ ہمارے نزدیک اس کی عظمت کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بروہِ عالم

کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اس تلاش میں وہ کسی غیر قرآنی فکر کا منت کش نہیں ہوتا تھا کہ اس کا مسلک یہ تھا کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افکنم

جب تک اقبال کا صحیح مقام متعین نہ کیا جاتے، سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اقبال کو فطرت نے کس مقصدِ عظیم کے لئے پیدا کیا تھا اور اس مقصد کو اس نے کس حد تک پورا کیا۔ وہ یہ دکھانے کے لئے نہیں آیا تھا کہ زمین شعر میں گلکاریاں کس طرح کی جاتی ہیں بلکہ وہ یہ بتانے کے لئے آیا تھا کہ یہ زمین کس طرح بدل سکتی ہے، یہ آسمان کس طرح بدل سکتا ہے اور مسلمانوں کو اس کی عظمتِ کم گشتہ پھر سے کیسے مل سکتی ہے۔ محسوسات کے خوگر انسان کی نگاہیں جب لطیف حقیقتوں کے حسنِ بسیط سے پورے طور پر بہرہ یاب نہیں ہو سکتیں تو وہ پردہ ہائے مجاز کی ان رنگینیوں میں جذب ہو کر رہ جاتی ہیں جو اس حقیقت کو مشہود بنائے ہوتی ہیں۔ شاعری دراصل وہ حسین و جمیل نقاب تھی جس کے اندر حقیقی اقبال چھپا بیٹھا تھا۔ عام لوگ ان پردوں کے نقش و نگار میں محو تماشا ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان کے اندر بیٹھا ہوا اقبال ان ظاہر ہیں نگاہوں کی فریب خوردگی پر ہنس دیتا اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہے۔

پوچھا جائے گا کہ اقبال نے کام کیا کیا تھا؟ یہ سوال پھر اس طبقہ کی طرف سے اٹھے گا جس کی نگاہیں محسوسات میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ وہ طبقہ جو غالب کے الفاظ میں "اوج طاع لعل و گہر" کے بجائے کسی کے "جوہر طرفِ کلاہ" کی طرف دیکھتا رہتا ہے جو کسی کی عظمت کا اندازہ اس سے لگاتا ہے کہ اس نے اینٹوں اور پتھروں کا کتنا بڑا انبار جمع کیا تھا۔ جو کسی کی شان و شوکت کے لئے صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس کی گاڑی کے آگے کتنے گھوڑے جلتے تھے اور کتنے ہاتھی اس کے جلوس میں نکلتے تھے یا آگے بڑھتے تو کتنا وسیع پنڈال اس کی آمد کی تقریب میں تعمیر ہوتا تھا۔ کتنے لاکھ انسان اس کے گرد پیشیں "زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے جو لوگ کسی کے اعمالِ حیات کو صرف انہی میزانون سے تولنے کے خوگر ہیں ان کے لئے اس سوال کا جواب فی الواقع بڑا مایوس کن ہوگا۔ لیکن جس کی نگاہیں محسوسات سے گزر کی حقائق کو پرکھتی ہیں وہ بلا تکلیف و کاوش دیکھ سکتا ہے کہ اقبال نے کیا کیا کسی کی دنیا بدلنے کے لئے یہ بہل ہوتا ہے کہ اس کے مکان کا نقشہ

بدل دیا جائے۔ ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ اس کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا جائے۔ اس کا نظریہ زندگی بدل دیا جائے کہ

اگر نگاہ تو دیگر شود جہاں دگر است

اقبال نے اپنے طریق کار میں اسی روش کو اختیار کیا جس سے ہنگامہ آفرینیوں اور غوغا آرائیوں کے بجائے چمکے چمکے دلوں کی بستیاں بدل جایا کرتی ہیں۔ اقبال نے کشتی کا رخ بدلنے کے بجائے پانی کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس نے اشیاء کا رنگ تبدیل کرنے کے بجائے نگاہوں کے چشمہ کا رنگ بدل دیا۔ اس نے جسموں کو نہیں چھوا بلکہ دلوں کو بدل دیا۔



# پیامِ اقبال

دو عالمِ راتواں دیدن بمینائے کہ من دارم  
کجا چشمے کہ بیند آں تماشاے کہ من دارم

قرآن آیا اور اس نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دیا جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی۔ استبدادِ ملوکیت کی انسانیت کش زنجیریں جو انسان کو حیوان کی سطح سے بلند ہونے ہی نہیں دیتیں۔ افسوں ہا مانیت (برہمنیت، پیشوائیت، ملائیت اور خانقاہیت) کی مرگ آور زنجیریں جو زندگی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہیں اور مکائدِ قارونیت (سراب پرستی) کی خوں آشام زنجیریں جو شجرِ انسانیت کے پتے پتے سے نمِ حیات چوس لیتی ہیں۔ اس نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ دیا تاکہ انسانیت آزادی کی فضائے بسیط میں برگ و بار پیدا کرے۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ اس شجرِ مقدس کی جڑیں پاتاں تک پہنچ چکی ہوں اور اس کی شاخیں بامِ عرش کو چھو رہی ہوں۔ اس طرح کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہا اس لئے کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہ رہا۔ اس نے کسی انسان کو یہ حق نہ دیا کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اطاعت و اتباع صرف ان قوانین کا رہ

**تکمیل دین** گیا جو انہوں کو خدا کی طرف سے دیئے گئے تھے۔ یہ قوانین ان غیر تبدیل اصولوں پر مشتمل تھے جن کی روشنی میں انسانی زندگی اپنے منتہی تک پہنچ سکتی ہے۔ لہذا ان

قوانین کے بعد کسی اور ضابطہ قوانین کی ضرورت باقی نہ رہی اور اس طرح دین مکمل اور نبوت ختم ہو گئی۔

تعمیل دین اور ختم نبوت کے بعد انسانی معاشرہ کو اس کی ارتقائی منازل طے کرانے کا طریق یہ متعین کر دیا گیا کہ جس جماعت نے ان اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کو صحیح راستہ پر ڈال لیا تھا۔ اسے اس ضابطہ قوانین کا وارث بنایا گیا تاکہ وہ اس سلسلہ کو آگے بڑھاتی جائے اور ہر دور کا انسان ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کا حل خود تلاش کرتا ہو اور ان زندگی کو اس متوازن راستے پر لے جائے جسے صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا گیا تھا۔

یہ قافلہ رُشد و سعادت ابھی تھوڑی دُور جانے پایا تھا کہ ملوکیت کے رہزنوں نے اپنی کمین گاہوں سے سر نکالا اور اس قافلہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ملوکیت بے ساز و یراق کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتی۔ وہ اپنی تائید میں پیشوائیت (PRIESTHOOD) اور غاصبانہ مفاد پرستی

(CAPITALISM) کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ دنیا کا کوئی فرعون، ہامان اور قارون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان غاصبانہ قوتوں کے راستہ میں قرآن ہی سب سے بڑی روک تھی۔ اس لئے انہیں اپنی کامیابی کے لئے اس سنگِ راہ کو سامنے سے ہٹانا ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا کچھ کیا گیا تفصیل اس کی طویل ہے اور غور سے دیکھتے تو مسلمانوں کی ساری تاریخ گویا اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ غیر شرآئی تصورات زندگی کے لئے ایک جامع اصطلاح ”عجمی تصورات“ ہے۔ ہماری تاریخ تفصیل ہے اس کوششِ مذموم و سعیِ مشوم کی کہ

**عجمی تصورات** | شرآن کی جگہ کس طرح عجمی تصورات کو مسلمانوں کے دل و دماغ پر مستولی کر دیا جاتے۔ یہ کوشش بڑی کامیاب رہی۔ ایسی کامیاب کہ اس ایک ہزار سال کے عرصہ میں قرآن عجمی تصورات سے بدل گیا۔ اور بایں انداز کہ یہ عجمی تصورات عین اسلام قرار پا گئے اور قرآنی تعلیم یکسر غیر اسلامی بن گئی۔ چنانچہ آج کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی کے سامنے قرآن لایا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کفر و بے دینی کی تعلیم دی جا رہی ہے اور وہ اس سے اس طرح بھاگتا ہے۔ کانہم حمر مستنفرۃ فرت من قسودۃ۔

ہزار برس سے مسلمانوں پر یہی حالت چلی آرہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دوران



میں اصلاح حال کی کوششیں بھی ہوئیں بہت سی سعید رجحوں نے قوم کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بہائے اور اس کے دکھ کی دوا ڈھونڈنے میں بڑی سعی و کادش سے کام لیا۔ لیکن یہ کوششیں علاماتِ مرض کے ازالہ سے آگے بڑھ کر علتِ مرض تک پہنچ سکیں اور مردِ زمانہ سے مرض ایسا مزمن اور مریض ایسا سقیم و ناتواں ہوتا گیا کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی اس کی زندگی سے مایوس ہونے لگ گئے۔ اسلام کے مستقبل کے متعلق یہی مایوسی تھی جو ایران میں بابت اور بہارِ اشد کی شریعتِ جدیدہ اور پنجاب میں توت فرنگ آفریدہ کی صورت میں نمودار ہوئی اور جس نے تہذیبِ مغرب سے مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیاتوں کو عام طور پر اپیل کیا۔ مذہب پرست طبقہ نے ان جدید توتوں کی تو مخالفت کی لیکن اسلام کے مستقبل سے مایوسی کا غیر شعوری اثر انہیں قومیت پرستی (NATIONALISM) کے آغوش میں لے گیا۔ چنانچہ ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی اور رفقاہم اس حقیقت کی زندہ مثالیں ہیں۔

مسلمان عالمگیر مایوسیوں کے اس خوفناک سیلاب میں نہ ہی چلا تھا کہ مبداء فیض کی گرم گتری نے ان میں ایک ایسا ویدہ ور پیدا کر دیا جس کی نگہ دور رس ہزار برس کے عجمی تصورات کے دبیز پردوں کو چیرتی ہوئی اس مقام تک جا پہنچی جہاں قرآن اپنی اصلی شکل میں دنیا کے پاس آیا تھا۔ وہاں سے اس نے نورِ بصیرت حاصل کیا اور روشنی کی اس کرن نے مایوسی کی

## نگہ بصیرت

ظلمت انگیز طغیانوں میں امیدوں کی ایک نئی لہر دوڑادی۔ اس نے تائب گور پہنچے ہوئے مسلمان کو پھر سے تھاما اور ایمان و ایقان کی بے پناہ توتوں کے ساتھ اس حقیقت کو اس کے سامنے واضح کیا کہ جس چیز کے مستقبل سے تجھے مایوسی ہو رہی ہے وہ اسلام نہیں، عجم کے وہ تصورات ہیں جنہوں نے اسلام کا نقاب اوڑھ رکھا ہے۔ اسلام قرآن کے اندر ہے اور قرآن اس خدا کا پیغامِ ابدی ہے جو ہمیشہ زندہ ہے اور جس پر موت تو ایک طرف نیند اور اونگھ تک طاری نہیں ہو سکتی۔ لہذا قرآنی ممکنات سے مایوسی زندگی کے حقائق سے چشم پوشی ہے، وہ بیس چالیس برس تک مسلسل و متواتر اس پیغام کو دہراتا رہا۔ اس پیغام کے انداز مختلف تھے۔ لیکن ہم ایک ہی کٹی اور وہ ہم یہ کٹی کہ اس ہزار سالہ عجمی اثرات کو پھٹک کر دو اور قرآن کو اپنی نگاہ سے دیکھو، بات واضح ہو جائے گی۔ قرآن کو اس طرح سمجھو گویا وہ خود تم پر نازل ہو رہا ہے۔ اگر تم نے قرآن کو اس طرح سمجھ لیا تو یہ تمہارے شعور میں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اور انقلابِ شعور سے خارجی دنیا میں خود بخود انقلاب

آجاتا ہے۔

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کهن کا چارہ

اقبالؒ یہ پیغام دے کر چلا گیا لیکن جو کچھ قرآن کے پیامبرِ اولین کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اس کے ساتھ ہوتا نظر آ رہا ہے۔ قرآن زندگی کا پیغام تھا اس لئے اس نے بار بار اس کا اعلان ضروری سمجھا کہ یہ شاعری نہیں شاعری ایک پیامبر کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتی۔ لیکن مسلمانوں نے ان تہذیبات کے باوجود قرآن سے ایسی شاعری کی کہ اسے چستان بنا کر رکھ دیا۔ مذہب کو شاعری کی فضا خوب راس آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا بیج پھوٹتا ہی شاعری کی زمین سے ہے اور اس کی پرورش بھی شاعری کی فضا میں ہوتی ہے۔ دین کا مدار حقائق پر ہوتا ہے۔ مذہب کا انحصار الفاظ پر۔ دین زندگی کا ضابطہ دیتا ہے، مذہب چند مہموم تصورات پیش کرتا ہے۔ دین کے مسلمات کی پرکھ محسوس نتائج سے ہوتی ہے، مذہب ذہنی اطمینان کا فریب دیتا ہے۔ یہی کچھ شاعری کرتی ہے۔ الفاظ کا الٹ پھیر، فنی قیود و شرائط کا شدت سے التزام اور ان سب کا نتیجہ کچھ وقت کی واہ واہ۔ اقبالؒ نے قرآن کا پیغام دیا اس لئے قرآن

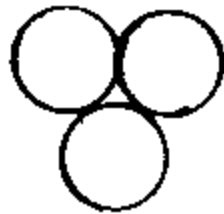
## شاعری

اسی کے اتباع میں وہ عمر بھر اعلان کرتا رہا کہ میرا پیغام شاعری نہیں، نہ شاعری میرے شایانِ شان ہے۔ لیکن قوم ہے کہ اس کی ان تمام تہذیبات کے باوجود آگے شاعر بنانے پر مُصر ہے۔ گانے والے اور گانے والیوں کی زبان پر کبھی داغ اور غالب کی غزلیں ہوا کرتی تھیں۔ اب ان کی جگہ اقبالؒ کے شعروں نے لے لی ہے۔ قوالی کہ جس کے زور پر تصوف زندہ رہتا ہے، اس کے سوا کیا ہے کہ عقل و بصیرت کو ماؤف کر کے ان کے سطحی جذبات میں بیجان پیدا کیا جائے۔ اقبالؒ نے اسی لئے اسے افیون سے تعبیر کیا تھا۔ آج وہی قوالی اقبالؒ کی سب سے بڑی نقیب ہے۔ جو ملک خود اقبالؒ کے شہرانی تصور کا عطیہ ہے اس میں اگر کسی چیز سے بعد اجنبیت، بلکہ بغض و عناد ہے تو اقبالؒ کے شہرانی پیغام سے۔ مذہب اور مفاد پرستی کا رشتہ پھر سے استوار ہو رہا ہے۔ وطنیت کی لعنت ذاتوں، برادریوں اور خاندانوں سے آگے گزر کر صوبائی تفریق کی محکم گیر صورت اختیار کر چکی ہے۔

حالات ہر چند نامساعد و ناموافق ہیں لیکن اس کے باوجود مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ قرآن جسے اقبالؒ کا پیغام ہمارے سامنے دوبارہ لایا، زندہ اور پائیدار ہے۔ دنیائے انسانیت کا مستقبل

صرف قرآن سے وابستہ ہے۔ جن لوگوں کے دل میں یہ حقیقت اقبال کی طرح ایمان بن کر سما گئی ہے ان پر لازم آتا ہے کہ وہ بھی اقبال کی طرح اس پیغام کے عام کرنے میں اپنی پوری عمر امید کی کرن | بسر کر دیں۔ مردہ پرست قوم زندہ انسانوں کی باتوں کو نہیں سنا کرتی۔ وہ زندہ افراد کا گلا گھونٹ کر انہیں مار دیتی ہے اور پھر ان کی قبروں پر اپنی ہوس مردہ پرستی کی تسکین کے بڑے بڑے عظیم القدر مقبرے تعمیر کیا کرتی ہے۔ لیکن جس طرح ان تمام نامساعد حالات کے باوجود اقبال نے اپنے پیغام کے عام کرنے میں کبھی ہمت نہ ہاری، اسی طرح اس پیغام کی نشر و اشاعت میں ان لوگوں کو بھی عزم و ثبات سے کام لینا ہوگا۔ قرآن کو انسانیت کا نصب العین بن کر رہنا ہے، اس کے سوا زندگی کے مسائل کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ سوال یہی ہے کہ یہ شرف کس قوم کے حصہ میں آتا ہے کہ وہ اس شمع ہدایت کی علمبردار بن کر انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلہ کو صحیح راستہ پر لے چلے۔

۱۹۵۰ء



# مشرق و مغرب

پچھلے دنوں ایک سنجی مجلس میں اقبالؒ کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ اقبالؒ کے ہاں "مشرق" اور "مغرب" کے الفاظ اکثر ملتے ہیں۔ معلوم نہیں ان سے اس کا مفہوم کیا ہے؟ آئیے دیکھیں کہ اقبالؒ کے ہاں ان اصطلاحات سے مراد کیا ہے؟

اقبالؒ کے ہاں مشرق یا مغرب سے مفہوم کوئی خاص خطہ زمین نہیں۔ ان کے مفہوم زندگی کے دو جداگانہ تصورات (IDEOLOGIES) ہیں۔ مشرق کو آپ دیکھتے تو اس میں آپ کو ایک چیز خاص طور پر نمایاں نظر آئے گی۔ شران نے جن انبیاء کرامؑ کا ذکر کیا ہے وہ سب مشرق میں پیدا ہوئے۔ بلکہ یوں کہتے کہ یہ سب کے سب سامی النسل تھے۔ قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ ان انبیاء کے علاوہ جن کا ذکر شران میں کیا گیا ہے مختلف اقوام میں اور انبیاء بھی آتے رہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ صرف مشرق کی اقوام ہی ہیں جو اپنی تعلیم کو انبیاء کی طرف منسوب کرتی ہیں یا یوں کہتے کہ اپنے ہاں کے نوشتوں کو آسمانی کتابیں کہہ کر پکارتی ہیں۔ مغرب کی کسی قوم کا یہ دعویٰ نہیں کہ ان کے ہاں کوئی نبی آیا تھا یا ان کے ہاں کوئی تعلیم ایسی ہے جس کا سرچشمہ ذہن **مشرق** انسانی سے ماورا رہو۔ ہم اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ ان اقوام میں فی الواقع کوئی رسول آیا تھا یا نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی تاریخ نے اپنے دامن میں کسی رسول کا ذکر محفوظ نہیں رکھا۔ نہ ہی وہ اقوام اپنی تعلیم کو کسی رسول کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ یورپ میں یہودیت

اور عیسائیت عام ہے لیکن ان دونوں مذاہب کے رسول مشرقی ہیں مغربی نہیں۔ لہذا مشرق کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وحی کی قائل ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب سر زمین مشرق ہی کی پیداوار ہیں۔ لہذا یوں کہتے کہ اقوام مشرق مذہب پرست ہیں۔ مذہب میں ایک طرف کسی بالا ہستی کا تصور ناگزیر ہے اور دوسری طرف کسی نہ کسی شکل میں موت کے بعد کی زندگی کا عقیدہ بھی۔

اس کے برعکس مغرب کو یحجتے۔ وہاں یا تو فلسفہ کار فرما رہا ہے اور یا عصر حاضر میں طبیعیات کی بنیادوں پر پیدائش شدہ تصورات زندگی، فلسفہ ہو یا طبیعیات دونوں کا سرچشمہ ذہن انسانی ہے۔

**مغرب** | یہ ماورائے سرحد ادراک کے قائل ہی نہیں۔ ان کے ہاں علوم کا دائرہ محسوسات میں گھرا ہوا ہے۔ وہاں تمام مسائل حیات کا حل تنہا عقل کی رُو سے تلاش کیا جاتا ہے۔ عقل ہمیشہ وقت کی مصلحتوں کے تابع چلتی ہے اس لئے مختلف اوقات اور مختلف حالات میں عقل کے فیصلے مختلف ہوتے ہیں۔ لہذا یوں کہتے کہ مغرب کی دنیا میں مستقل اقدار کا کوئی تصور نہیں۔ وہاں صرف تقاضائے مصلحت (EXPEDIENCY) فیصلے کا معیار قرار پاتا ہے۔

وہاں یا تو کسی بالا ہستی کا تصور ہی نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو صرف ایسے خدا کا جو کائنات کی مشینوں کو ایک دفعہ کوک دے کر الگ ہو بیٹھتا ہے اور اب یہ مشینری قوانین فطرت کے مطابق خود بخود چلے جا رہی ہے۔ اگر وہ لوگ اس سے ذرا آگے بڑھتے ہیں تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ خدا انہی قوانین فطرت کا نام ہے اور چونکہ قوانین فطرت دنیا کے محسوسات ہی سے متعلق ہیں اس لئے خدا بھی انہی چار دیواریوں میں گھرا ہوا ہے۔ زندگی مادی اجزاء میں ایک خاص ترتیب سے پیدا ہوتی ہے اور اسی ترتیب کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لہذا انسانی اعمال کا تعلق اسی دنیا سے ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔

یہ ہیں وہ متضاد تصورات حیات اور نظریات زندگی جن کی مظہر مشرق اور مغرب ہیں۔ اقبال جب مشرق کہتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہی تصورات زندگی ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ تصورات مختلف اقوام مشرق میں مشترک ہی کیوں نہ ہوں لیکن کہیں یہ بالکل خالص اور غیر ٹوٹا شکل میں ہیں اور کہیں ان میں ذہن انسانی کی آمیزشیں بھی ہو چکی ہیں۔ یہ اپنی اصلی اور غیر ٹوٹا حالت میں صرف قرآن کے اندر باقی رہ گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر مقام پر ان میں انسانی تصورات کی

آمیزش ہو چکی ہے۔ اس لئے اقبال جب مشرق کا نام لیتا ہے تو اس سے اس کا حقیقی مفہوم قرآن ہی کی تعلیم ہوتا ہے۔ اور یہی وہ تعلیم ہے جسے وہ مغربی تصوراتِ حیات کے مقابلے میں لاتا ہے اور انہیں چیلنج دیتا ہے کہ وہ اس کے مقابل میں انسانی زندگی کے مسائل کا حل پیش کریں۔ ایک مرتبہ ایک نجی

صحبت میں حضرت علامہ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ جب انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ تمام انبیاء مشرق ہی میں کیوں آئے مغرب

ہی میں کیوں نہ آئے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں فرمایا کہ بات یوں تھی کہ روزِ اول جب خدا اور ابلیس میں جھگڑا ہوا ہے تو ان دونوں نے اپنے اپنے ملک بانٹ لئے تھے۔ مشرق کو خدا نے لے لیا اور مغرب ابلیس کے حصہ میں آ گیا۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اقبال مغرب کے مقابلے میں ہمیشہ مشرق کی برتری ثابت کرتا ہے۔ یہ برتری درحقیقت عقلِ انسانی کے تراشیدہ نظا ہائے زندگی کے مقابلہ میں قرآنی نظامِ زندگی کی برتری کے مترادف ہوتی ہے۔ اقبال کا سارا پیغام اسی برتری کا نقیب ہے اور اسی کو عالم کرنے کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس کی فکر کا حاصل عقل کے مقابلے میں عشق کی فضیلت اور فوقیت ثابت کرنا ہے اور عشق سے اس کی مراد وحیِ خداوندی ہوتی ہے۔ عقل ہی کا دوسرا نام اس کے نزدیک تہذیبِ فرنگ ہے۔ دیکھئے کہ وہ "پیامِ مشرق" میں فرنگ کے نام کیا پیغام دیتے ہیں۔

عقل تا بالِ کشور است گرفتار تر است  
عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است  
آنچہ در پردہ زنگ است پدیدار تر است  
آہ زان نقدِ گراں مایہ کہ در باختہ

از من لے بادِ صبا گوتے بہ دانلے فرنگ  
برقِ را ایں بہ جگر می زنداں رام کند  
چشمِ ہرزنگ گل و لالہ نہ بیستہ ورنہ  
دانش اندوختہ دل ز کف انداختہ

ذرا آگے چل کر کہتے ہیں۔

بالِ بیلِ دگر و بازوئے شاہیں دگر است  
ایں سوئے پردہ گمانِ ظن و تخمین دگر است

عقلِ خود ہیں دگر و عقلِ جہاں ہیں دگر است  
دگر است آں سوئے نہ پردہ کشادنِ نظرے

اے خوش آن عقل کہ پہنائے دو عالم با دوست

نورِ فرشتہ دسوزِ دلِ آدم با دوست

لیکن اقبال کے ہاں مشرق و مغرب سے ایک اور مفہوم بھی ہے اور اس مفہوم کے لئے بھی اقبال نے ان اصطلاحات کو جا بجا استعمال کیا ہے۔ مشرق کو تعلیم تو دوحی کے ذریعہ سے ملی لیکن اس نے اس تعلیم کو اس درجہ مسخ کر دیا کہ ان کی نگاہوں سے زندگی کا مقصود ہی اوجھل ہو گیا۔ ان کے ہاں حقائق کی جگہ اشخاص پرستی نے لے لی۔ دین کے نظام زندگی کی جگہ دھرم (مذہب) کی رسومات آگئیں۔

**مذہب پرستی** | عقل و فکر کی جگہ اندھی تقلید نے لے لی۔ قولے فکر یہ کے ساتھ ہی ان کے قولے عملیہ بھی مفلوج ہو گئے۔ دنیا کی زندگی کو قابل نفرت سمجھ کر انہوں نے اپنی توجہ کو اپنے ذہن کی تراشیدہ "اخروی زندگی" پر مرکوز کر دیا اور اس زندگی سے مفہوم اپنی موہوم امیدوں کے علاوہ کچھ نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ کہ تمام اقوام مشرق رفتہ رفتہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئیں۔

ان کے مقابل میں مغرب نے ہر سامنے آنے والے معاملہ کو علم اور عقل کی رُو سے جانچا اور اس کا عملی حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ قوانین فطرت کے مطالعہ اور اشیائے فطرت کے مشاہدے سے انہوں نے قولے فطرت کو ایک ایک کر کے مسخ کر لیا انہوں نے زمین پر جال بچھا دیئے۔ پانیوں پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ وہ فضا کی پہنائیوں پر مستط ہو گئے اور اپنی قوتوں سے ساری دنیا پر چھا گئے۔ ان کے ہاں کمی رہ گئی تو فقط یہ کہ ان کے پاس مستقل ضابطہ حیات ایسا نہ تھا جس سے انسانی معاشرہ میں توازن قائم رکھ سکتے۔

اقبال کے ہاں مشرق سے دوسرا مفہوم وہی پڑمردگی اور افسردگی، بے کسی اور بے بسی، محکومی اور ناامیدی، تقلید و جمود اور بے حسی اور بے عملی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغرب سے مفہوم بیاک قوتیں اور بے ضبط طاقتیں ہوتا ہے۔ اس مقام پر وہ مشرق اور مغرب دونوں پر سخت تنقید کرتا ہے۔ وہ بر ملا کہتا ہے کہ

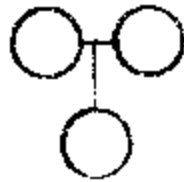
مشرق ہما افسانہ مغرب ز تو بے گانہ وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی  
اقبال کے پیغام میں جہاں جہاں مشرق کی تنقیص ہے وہ اس تصویر حیات پر تنقید ہے جس نے ان سے زندگی کی حرارت چھین کر ان کی دنیا کو مردوں کی بستی بنا رکھا ہے۔ اقبال کے نزدیک نہ مشرق کے یہ

اندازہ صحیح ہیں نہ مغرب کا وہ اسلوب۔ اس کے نزدیک صحیح نظام زندگی عقل اور عشق کے امتزاج کا نام ہے۔ یعنی دنیا کو وحی کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے دیکھنے کا نام۔ اس کے لئے وہ مشرق اور مغرب دونوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

خیز و نقشیں عالم دیگر بہ عشق را بازیر کی آمیزدہ

اور یہ قرآن کے پیغام کی صحیح تفسیر ہے۔ اس کے نزدیک مردانِ مومن کی تعریف یہ ہے۔ اُولَ الْاٰلْبَابِ الَّذِيْنَ يٰذٰكُرْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قَعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ يَعْنٰى اربابِ عقل و دانش جو اٹھتے بیٹھتے بیٹھتے ہر وقت اپنے سامنے وحی کے محکم قوانین رکھتے ہیں اور انہی کی روشنی میں اپنی عقل سے کام لے کر اپنے زمانہ کے تقاضوں کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اقبال و نیا ہیں اسی قسم کے انسان دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ مغرب والوں سے کہتا تھا کہ وہ مشرق سے وحی کا تصور لے لیں اور مشرق والوں سے کہتا تھا کہ وہ مغرب والوں سے عقل کی باتیں سیکھیں۔ اقبال کا جہان نو وہی تھا جس میں ہر کام عقل اور وحی کے اس حسین امتزاج سے طے پائیں اور اس طرح مشرق اور مغرب کی حدود مٹ کر الارضِ ربّہ کا منظر عام ہو جائے۔ اسی میں وہ فوز و فلاح انسانیت کا راز دیکھتا تھا اور اسی میں وہ قیام آدمیت کا امکان پاتا تھا۔

۱۹۵۱ء





# حضرت علامہ اقبال سے آخری ملاقات

نوشتہ ۱۹۳۹ء

۳۸ء اور ۳۹ء کی درمیانی شب گزشتہ سال کی ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ گزری ہوئی کہانیاں ایک ایک کر کے سامنے آرہی تھیں۔ جس طرح کوئی چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا چاند کے سامنے گزرے تو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ چاند دوڑ رہا ہے یا بادل اسی طرح دن گزرتے جاتے ہیں اور یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں یا زمانہ ڈائری کے اوراق سے بعض بھولے ہوئے افسانوں کی یاد یوں تازہ ہوتی جا رہی تھی جس طرح عرق لیموں سے لکھے ہوئے حروف کاغذ کو آگ کے سامنے رکھنے سے خود بخود ابھرتے چلے آتے ہیں۔ ابھی چند ورق لٹنے پایا تھا کہ ۱۰ جنوری کے صفحہ ایک ایسا واقعہ مندرج پایا جس نے نگاہوں کو وہیں روک لیا اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ کسی واقعہ کی یاد نہیں بلکہ ایک مضرب ہے جس نے میرے بربط ہستی کی تاروں کو یوں چھیڑ دیا ہے کہ ان کے اندر سوتے ہوئے المیہ نغمات پھر سے بیدار ہو رہے ہیں اور شعلہ ریز دپک کے سردوں میں تمام کائنات پر چھائے جا رہے ہیں۔ واقعہ کی تمبیدیوں ہے کہ ۹ جنوری کو دہلی کا "قافلہ" زیر امارت مولانا محمد اسلم صاحب جیرا چپوری بتقریب "اقبال ڈے" لاہور پہنچا۔ رات تک مصروفیت رہی۔ اس اجلاس کا تذکرہ بھی ڈائری میں لکھا پایا۔ لیکن ۱۰ جنوری کی صبح کے واقعہ کی تفصیل جو ڈائری کے کئی ایک صفحات پر پھیلی ہے کچھ ایسی وجدانگیز ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بزم طلوع اسلام کو بھی اس حظ و کیف میں

شریک کروں بہتر ہو کہ اسے ڈائری کے الفاظ ہی میں سنیتے :-

10 جنوری بروز سوموار | صبح ۹ بجے جاوید منزل واقع میور وڈ پر حاضر ہوئے۔ نذیر نیازی صاحب

حسب وعدہ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ حضرت علامہ پنک پر استراحت فرما رہے تھے۔ لحاف اوڑھے بلکہ لحاف کے ساتھ ایک کمبل بھی ملفوف تھا۔ حقہ سامنے تھا۔ جو ہمیشہ سامنے رہتا ہے۔ نیازی صاحب نے بتایا کہ جب پچھلے دنوں لارڈ لوٹھین ملنے کے لئے آیا تو بھی آپ اسی انداز میں لیٹے لیٹے ملے تھے۔ آواز ابھی تک صاف نہیں ہوئی۔ اس طرح بولتے ہیں جیسے کسی کی گھنگھی بندھ رہی ہو۔ مولانا صاحب کی وجہ سے سلسلہ گفتگو اردو میں چھڑا لیکن آپ کے لب و لہجہ سے حسب معمول پنجابیت صاف نمایاں تھی جسے وہ کسی تکلف کے پردے میں چھپانا نہیں چاہتے۔ عمر قریب ساٹھ برس سمجھتے۔ لیکن اس دفعہ کمزور ہو رہے تھے۔ بایں ہمہ اس کمزوری اور بڑھاپے میں بھی دبدبہ اور عظمت کی وہی شان تھی۔ لیکن سادگی اتنی کہ اگر کسی کا پہلے تعارف نہ ہو تو وہ شاید ہی سمجھے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کے سامنے بیٹھے ہیں۔ پہلے متفرق سلسلہ کلام شروع ہوا۔ آپ کی باتوں میں ہلکی سی ظرافت کی چاشنی جسے ظرافت کی بجائے شگفتگی کہنا زیادہ موزوں گا ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ لیکن آج کل آپ کی علالت کی وجہ سے یہ ضرورت بھی رہتی ہے کہ سنجیدہ گفتگو کو یہاں وہاں سبک رد کر دیا جائے۔ ضمناً ایک بات سامنے آگئی۔ فرمایا کہ جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آ رہے تھے تو مولوی شفیع (مرحوم) بھی ساتھ تھے۔ میں عرشہ جہاز پر کانفرنس کی روٹیاں دیکھ رہا تھا کہ کتاب ہاتھ سے گر گئی۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر عرب لڑکے جہاز کے ساتھ ساتھ آ رہے تھے مولوی صاحب کو عربی آتی نہیں تھی، گھبراہٹ میں آواز دی کہ یا شیخ! اذکذا! الکتب لا ریب فیہا۔ وہ سمجھ گئے اور کتاب جو اتفاق سے ایک کشتی میں جاگری تھی اٹھا لائے۔

جاوید نامہ کے متعلق کچھ ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ دربار فرعون کے ساحر جن کی قوت ایمانی استبداد فرعون کا دندان شکن جواب ہے، انہیں جاوید نامہ میں ضرور جگہ ملنی چاہیے تھی۔ فرمایا کہ جاوید نامہ میں تو بہت سی چیزیں لکھنے سے رہ گئیں۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سید احمد (بریلوی) اور سید احمد (دہلوی) (سرسید کی روحوں کو بھی اکٹھا کر دوں۔ یہ بھی نظر انداز ہو گیا اور کبھی بہت سی

باتیں ہیں نے نوٹ کر کے رکھی تھیں۔ اب کسی اور موقعہ پر ان کو لکھوں گا۔

میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں اس منزل کے بعد دوسری منزل کے لئے جہاں ایک طرف  
**اگلی منزل** انسانوں کے متعلق یہ ہے کہ والی ربہم ینسلون (وہ اپنے رب کی طرف  
 دوڑتے ہوئے جائیں گے)۔ دوسری طرف خدا کے متعلق بھی ہے کہ وجاء ربك  
 و الملك (کہ تیرا رب اور فرشتے صاف در صفا آئیں گے) گویا خدا خود اس زمین پر آئے گا اور اشقت  
 الارض بنور ربہا (زمین اس کے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ  
 ابھی یہ ڈراما کچھ اور سین اسی اسٹیج پر دکھائے گا۔ فرمایا کہ یہ درست ہے لیکن ارض و سما پستی و  
 بلندی کا تصور تو موجودہ شعور کے تابع ہے۔ جب شعور بدل جاتا ہے تو زمان و مکان (TIME AND  
 SPACE) کے تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ اگلی منزل میں شعور بدل جائے گا۔ کیا معلوم  
 ارض کیا ہو اور سما کیا ہو یا دونوں ایک ہی ہوں۔ اسی لئے تو فرمایا کہ یوم تبدل الارض  
 غیر الارض و السموات (جس دن یہ ارض و سموات بدل جائیں گے) شعور کی ارتقائی منازل کا  
 تقاضا ہے کہ زمان و مکان کے بعد باقی نہ رہیں۔ خواب میں دونوں چیزیں باقی نہیں رہتیں۔ نہ وقت کوئی  
 شے رہتا ہے نہ مکان ایک سیکنڈ کے خواب میں ایک شخص بارہ برس امریکہ بھی رہ آتا ہے۔ یہ محض ایک  
 مثال ہے ورنہ کیا معلوم کہ دوسرے شعور میں کیفیت و کمیت کا کیا عالم ہو۔

فرمایا کہ جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو (TIME) کے نظریہ پر ایک مقالہ لکھ کر اپنے استاد  
 (MACTAGGART) کے پاس لے گیا۔ اس نے کہا کہ یہ کیا لکھ دیا؟ اس پر لوگ ہنسیں گے۔ میں  
 نے اسے ضائع کر دیا۔ ایک عرصے کے بعد جب برگستان کے نظریے شائع ہوئے تو ان میں ٹائم  
 کے متعلق وہی کچھ تھا جو میں نے لکھا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے مقالہ کے ضائع کر دینے کا بڑا افسوس ہوا  
 اس لئے کہ میرے مقالہ سے قرآن کریم کی حقیقت ثابتہ سامنے آجاتی تھی۔

برگستان اور نیٹشے | اس کے بعد برگستان اور نیٹشے اور اپنے فلسفہ کے اختلافات کی  
 توضیح فرماتے رہے اور بتایا کہ وہ فلسفہ جس کا سرچشمہ علیم الہی  
 ہو کس طرح ایک یقینی شے بن جاتا ہے اور وہ فلسفہ جو محض انسانی دماغ کا رہین منت ہو

کس طرح ظن و قیاس کی وادیوں میں سرگرداں رہتا ہے اور جب کبھی اُسے یقین کا رتبہ حاصل ہوتا ہے تو ہونہیں سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہو، آپ یہ کچھ بیان فرما رہے تھے اور ہمیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نئی دنیا میں ہیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ذہن انسانی کی وسعتیں کس قدر حد و نما آشنا ہیں اور یہ ہستی جسے دنیا نے محض ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانا ہے، علم و ادراک کی کن بند یوں پر ہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سر سے پاؤں تک دماغ ہی دماغ ہے اور دماغ بھی ایسا جو ثریا سے ورے کی بات ہی نہ کرتا ہو۔ بڑے بڑے اہم حقائق اور ادق مسائل کو دو دو جملوں میں واضح کرتے جاتے تھے۔

پھر قرآن کے متعلق ذکر آگیا۔ فرمایا کہ جب میں ایف۔ اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل حتم کر چکا ہوتا کبھی جاری ہوتی۔ ایک دن آکر پوچھتے ہیں کیا پڑھتے تھے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آگیا کہ چھ مہینے ہو گئے اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھتا ہوں۔ پھر یہ سوال کیسا نہایت نرمی سے سے فرمایا کہ میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ بھی آتا ہے۔ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا اور کہا کہ کچھ عربی جانتا ہوں کہیں سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک دن لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بیٹا قرآن کریم اسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔ میں حیران تھا کہ کیا نبی اکرم کے بعد قرآن کریم کسی کی سمجھ میں آ نہیں سکتا۔ فرمایا کہ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآن کریم حضور کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ میں پھر حیران تھا؛ فرمایا کہ انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمد کی صورت میں پیش کر دیا گیا۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک ہر ایک نبی محمد ہی کے مختلف مدارج تھے۔ وہ سلسلہ گویا تکمیل محمد کے منازل تھے۔ بنیادی اصول ہر

(MOHAMMAD IN THE MAKING)

جگہ ایک تھا۔ البتہ شعور انسانی کے ارتقار کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی۔ سنی کہ "محمد" مکمل ہو گیا۔ باب نبوت بند ہو گیا۔ انسانیت اپنے معراج کبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب ہر انسان کے سامنے معراج انسانیت کا نمونہ محمد ہے۔ کوئی انسان جتنا محمدیت کے رنگ میں

رنگا جاتا ہے اتنا ہی قرآن کریم اس پر نازل ہوتا جاتا ہے۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا کہ قرآن کریم اسی کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

یہ تو تھی قرآن کریم کے قلب کے راستے سمجھ میں آنے کی صورت۔ دماغ کے راستے سے

**قرآن فہمی** | سمجھ میں آنے کے متعلق حضرت علامہ نے فرمایا کہ قرآن فطرت اللہ ہے یعنی دنیا میں مختلف اوقات میں مختلف حقائق ظاہر ہوتے۔ کوئی یہاں کوئی وہاں ہر حقیقت فطرت اللہ ہوتی ہے۔ ان حقائق کے منتشر اوراق ایک جگہ جمع کر دیتے۔ اس مجموعہ کا نام ہے قرآن کریم۔ اب بھی جہاں کہیں کوئی حقیقت ظاہر ہوگی، وہ لینن کے الفاظ میں ہو یا سنوسی کے قرآن ہی کی کسی آیت کا ترجمہ ہوگا۔ اس لئے کہ حیات انسانی کے لئے جس قدر حقائق کی ضرورت تھی وہ سب کے سب اس کے اندر آچکے ہیں۔ اب قرآن کریم کو اس طرح سمجھنا چاہیے جس طرح یہ دنیا کو ملتا چلا آ رہا ہے۔ کبھی ایک حقیقت کسی زرتشت کو ملی تھی، کہیں کسی بدھ کو وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے پہلے ان تمام مذاہب کو دیکھئے۔ وہاں نظر آجائے گا کہ حقائق کون کون سے ہیں اور افسانے کون کونسے۔ حالانکہ اس مذہب والے ان افسانوں کو بھی حقائق ہی سمجھتے ہوں گے۔ ان کے حقائق قرآن کریم میں موجود ہوں گے اور ان کے افسانوں کی تردید ہوگی۔ یہ افسانے انسانی دماغ کے وضع کردہ ہوں گے جب تک ان افسانوں سے واقفیت نہ ہو معلوم نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم کس چیز کی تردید کر رہا ہے۔

مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ ہم نے ارض و سما کو لاجعین (IN SPORT) کھیل کو وہیں پیدا نہیں کیا۔ ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ تمام کائنات ایشور نے ایک "لیلا" رچائی ہے۔ چنانچہ ان کے ایک خدا کا نام نر اجن "کھلاڑیوں" کا بادشاہ ہے۔ اس کی مورتی بھی ایسی ہے کہ وہ رنگ راگ میں مصروف ہے اور دنیا پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس افسانہ کی تردید لاجعین کے اندر ہے۔ یا مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ لا تاخذنا سنة ولا نوم (خدا کو اونگھ یا بند نہیں آتی)۔ ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ سب کائنات پر ماتا کا خواب ہے۔ جب وہ بیدار ہو جائے گا تو یہ خواب بھی پریشان ہو جائے گا۔ خود ہمارے ہاں بھی بعض صوفیا میں اس قسم کا تصور موجود ہے۔ اس افسانہ کی تردید قرآن کریم نے ان الفاظ میں کی ہے۔ لہذا قرآن کریم سمجھنے کے لئے پہلے اس قسم

”افسانوں“ کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ غالص حقائق اب تشریح کریم کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتے۔

**رسالت** | رسول کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق فرمایا کہ ایک رسول میں اللہ کی طرف سے یہ شعور پیدا کر دیا جاتا ہے کہ وہ امتدادِ زمانہ (LENGTH) کو سمیٹ کر ایک حال (PRESENT) کے اندر مرکوز کر لے۔ لہذا جو باتیں دوسروں کے نزدیک دو ہزار برس بعد آنے والی ہوتی ہیں وہ رسول کے سامنے زمانہ مستقبل کی نہیں بلکہ حال کی ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنی وحی میں اس قدر محکم یقین رکھتا ہے کہ اس کی سچائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ وہ ان کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں شک و ریب کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

سیاستِ حاضرہ کے متعلق بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ فرمایا مجھے تو نظر آتا ہے کہ انہی عوام میں سے کوئی صاحبِ ایمان کھڑا ہو جائے گا اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر لے آئے گا۔ اس کی عملی شکل ان کے سامنے وہی ایک اسلامی ریاست (پاکستان) کا تصور ہے۔ فرمایا کہ اس کے سوا ہندوستان کی سیاست کا کوئی اور عملی حل سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ سب کچھ اقبال کے دماغ کے متعلق تھا لیکن حقیقی اقبال ان پردوں کے پیچھے قلب کی انتہائی گہرائیوں کے اندر چھپا رہتا ہے۔ ہر چند نیازی صاحب نے کہہ رکھا تھا کہ کسی جذباتی چیز کا تذکرہ نہ چھیڑنا کیونکہ اس کا ان کی صحت پر بے حد مضر اثر پڑتا ہے۔ لیکن ایک بات غیر ارادی طور پر ایسی آگئی جس سے ہمیں حقیقی اقبال کی ایک جھلک دیکھنی بھی نصیب ہو گئی۔ مولانا صاحب نے دریافت کیا کہ آج کل کوئی تازہ کلام کہا گیا ہے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ زخم کس تار پر جا لگے گا۔ فرمایا کہ گزشتہ چھ ماہ سے جب سے حج کا ارادہ ہوا ہے، صبح سے شام تک مدینہ ہی کے راستے میں رہتا ہوں۔ جو کچھ کہتا ہوں وہ بھی کچھ وہیں کی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ یہ کہا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

طبیعت کچھ سنبھلی تو فرمایا، بہت کچھ دل میں ہے کہ حضور کے آستانہ اقدس پر پہنچوں تو یہ بھی عرض کرونگا وہ بھی۔ راستہ طے کر لیتا ہوں لیکن جب وہاں پہنچتا ہوں تو طبیعت قابو میں نہیں رہتی۔ نیازی صاحب سے فرمایا کہ تازہ کلام سے کوئی شعر ان کو سناؤ۔ انہوں نے ایک شعر سنایا تو فرمایا کہ ہاں ایک شعر یاد آگیا۔ کعبۃ اللہ میں پہنچ کر یہ حضورِ حق یہ عرض کیا ہے کہ:-

تو باشس این جا و با خاصاں بیامیز!

کہ من دارم ہوائے منزل دوست!

**جذبِ کیف** پہلا مصرعہ تو آسانی سے پڑھ دیا لیکن دوسرے مصرعہ میں "منزل دوست" تک پہنچے تو ایک عجیب کیفیت سامنے آئی۔ دیکھا کہ تمام جسم پر ایک ارتعاشی حالت پیدا ہو گئی ہے۔ لیٹے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ یوں محسوس ہوا کہ سارا کلیجہ اُمنڈ کر مُنہ میں آگیا ہے۔ گلا پھول گیا۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اسے بڑی مشکل سے یوں دبایا جیسے کسی چیز کو حلق سے نیچے لیجا رہے ہیں۔ بڑے کرب و اذیت کے بعد انتہائی اضطراب کے عالم میں بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رٹنے لگے۔ غش کی سی حالت ہو گئی اور نڈھال ہو کر لیٹ گئے۔

مہم ششدر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یا اللہ! یہ کیا ہو گیا۔ ایک ہیبت سی طاری ہو گئی۔ سارے کمرے میں سناٹا تھا۔ ہمیں رہ رہ کر افسوس آتا تھا کہ ہم نے کیوں اس مضمون کو چھیڑ دیا۔

کچھ دیر اور بیٹھے کہ ان کی طبیعت سنبھل جاتے۔ اجازت چاہی تو مولانا صاحب سے فرمایا کہ ایک دن اور کھڑنے کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی! ہماری دفتر کی پابندیاں اس کی کب اجازت دیتی تھیں! طوعاً و کرہاً رخصت ہوتے۔ دیکھا تو بارہ بج چکے تھے۔ تین گھنٹے گزر گئے اور یوں معلوم ہوا کہ شاید پانچ منٹ ہوتے ہیں۔

بعض اوقات زندگی میں چند لمحات حاصل زندگی بن جاتے ہیں۔ یہ چند لمحات اسی قسم کے تھے۔ اب کچھ سمجھ میں آیا کہ اقبال کہاں پہنچ چکا ہے۔ دماغ ہے تو عرش کی بلندیوں پر اور قلب ہے تو عشقِ رسول میں خاک تر اے کاش مسلمانوں کی سمجھ میں آجانا کہ انہیں فطرت کی کرم گتھی نے

کس قدر بیش بہا نعمت عطا فرمائی ہے!

مرقومہ ۱۲ جنوری ۱۹۳۸ء

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس ملاقات میں جتنی باتیں ہوئیں اور جس طرح ہوئیں، میں نے وہ سب اس یادداشت میں لکھ لی تھیں۔ بہر حال یہ نکتے وہ تاثرات جو میرے ذہن میں باقی تھے جنہیں میں نے محفوظ کر لیا۔ اس وقت اس کی بھی کیا خبر تھی کہ یہ ملاقات آخری ہوگی اور اس کے بعد عالمِ اسلامی کی یہ جلیل المرتبت ہستی ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے پنہاں ہو جائے گی۔ اس کمی کو کچھ دہی محسوس کر سکتے ہیں جنہیں کبھی حضرت علامہ کی خدمت میں بازیابی کی سعادت حاصل ہوئی ہو۔ آج تو اس قسم کی یادداشتوں کے اوراق ہیں اور دلِ حراما نصیب کی حسرتیں کہ

وگر دانائے راز آید کہ ناید!





## ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

علامہ اقبال کے "یومِ وفات" پر تقریر

بیسویں صدی کا آغاز ہے مشرق کی تہذیب و تمدن کے ٹمٹانے والے آخری چرخ بھی گل ہو چکے ہیں۔ مغرب نے ایک نئے نظامِ تمدن کی طرح ڈالی ہے جس کی درخشندگی اور تابناکی نے بڑے بڑے دیدہ و روں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا بھر کی قومیں اس تہذیبِ جدید کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہیں۔ جلیل القدر دانایانِ روزگار اس نئے تمدن کو انسانیت کے مصائب و نوائب کے لئے مسیحا سمجھ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑے مفکر انسانی دانش و بینش کے اس اوجِ کمال پر نازاں و فرماں دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف سے اس نئی روشنی کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جا رہے ہیں۔ چاروں سمت سے تحسین و تبریک کے غلغلے بلند ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے اس نسخہٴ کیمیا کی برکات کے معترف ہیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے، گویا انسان نے اس فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پالیا جس کی تلاش میں اس نے ساری عمر وشت پیمائیوں اور صحراوردیوں میں گزار دی تھی۔ نئے انداز کی سیاست، نئی وضع کی معاشرت، معیشت کے طور طریق نرالے، تعلیم کے ڈھب انوکھے، تمام نظام ہمارے کہنہ کی بنیادیں تک اکھیڑی جا چکی ہیں۔ اور نئے نقشے کے مطابق بالکل جدید بنیادوں پر اس تہذیبِ نو کے قصرِ فلک بوس کی عمارت اوپر کو اٹھتی چلی جا رہی ہے جس کی رفعت و بلندی، نقش و نگار آئینہ بندی، حریر و طلّس

کے نگاہ فریب پر دے بجلی کے قمقمے اور ان قمقموں کی عالمتاب روشنی میں ایک رنگین دنیا بر  
 دیکھنے والے کی نگاہ کو حیرت کدہ بنا رہی ہے کہ اتنے میں مشرق کے تیرہ وتار ویرانوں کا ایک تیس  
 سالہ نوجوان اس طلسم خانہ ہوش ربا میں جا نکلتا ہے۔ وہ تہذیب نو کے اس جہان رنگ و بو میں  
 کھویا کھویا ادھر ادھر پھرتا ہے۔ ہر شے پر ایک غائرانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ ہر چیز کو متجسسانہ نظر سے  
 پر لھتا ہے۔ کہیں رکتا ہے تو پیروں کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا خاک کے ذروں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا  
 رہتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے تو دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ ہونہار ایسا ہے کہ بڑے  
 بڑے مفکرین اسے مستقبل کا درخشندہ ستارہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے اس کمال ہوش میں  
 کچھ ایسے غیر محسوس سے جنون کی آمیزش ہے جو اسے دوسرے ہوش مندوں سے یکسر الگ کئے ہوئے  
 ہے۔ وہ فکر و نظر اور ہوش و جنون کے اس نرالے امتزاج سے تہذیب جدیدہ کے اس طلسم کدہ  
 کے ایک ایک عنصر کو دیکھتا ہے اور عین اس وقت جبکہ ساری فضا اس نظام تمدن کی توصیف  
 ستائش میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کے لبوں پر خفیف سی ہنسی اور اس کی آنکھوں میں ہلکے سے  
 تبسم کی موج کے ہلکورے نظر آتے ہیں۔ وہ اس پورے تماشے کو اپنی نگاہوں کے دامن میں سمیٹ  
 کر لوٹتا ہے اور لب ساحل ایک اونچی سی چٹان پر کھڑا ہو کر سچھے مڑ کر دیکھتا اور بلند آواز سے پکارتا ہے کہ

ویا مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے  
 کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زبر کم عیار ہوگا!

اور یاد رکھو کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی  
 جو شاخ نازک پہ اشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سننے والوں نے سنا اور اسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر ایک فلک بوس قہقہہ لگایا اور اس کے بعد پھر اسی  
 کیف و مستی کی دنیا میں جذب ہو گئے۔ یہاں پہنچنے پر پوچھنے والوں نے پوچھا کہ کہو بھائی! ہجرت خانہ  
 مغرب کی سیر تو کی، وہاں تہذیب نو کے "پری محل" کو بھی دیکھا، کیا خیال ہے؟ اس نے اپنے مخصوص  
 انداز میں نگاہوں کو اوپر اٹھایا اور کہا کہ ہاں دیکھا! چمک دیک تو بڑی ہے لیکن  
 پیر میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوان فرنگ سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ شیشہ گران فرنگ اپنے کاخ تہذیب کی آئینہ بندی میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور انہماک سے مصروف رہے۔ دنیا سے بدستور خدا کی رحمت تصور کرتی رہی۔ انسانیت اسی طرح اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی تا آنکہ ۱۹۱۴ء میں ایک عالمگیر دھماکہ محسوس ہوا۔ دھماکہ زلزلہ کی صورت اختیار کر گیا اور چار برس تک متواتر بھونکیاں ویرانوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ میدانوں کا ذرہ ذرہ انسانی خون کی ارزانی کی زندہ داستان بن گیا۔ لیکن مغرب نے اس کے بعد پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اس قصر جدید کی تزئین و آرائش اور حفاظت و صیانت میں پہلے سے بھی زیادہ جوش اور سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔ سطح ہیں نگاہوں نے اس "ہوشمند دیوانہ" سے پھر پوچھا کہ اب کیا کہتے ہیں آپ؟ آپ کی وہ پہلی پیشین گوئی تو غلط ثابت ہوئی۔ اس مردوانا کی آنکھوں میں پھر تبسم کی لہر دوڑی اور اب کے پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو کر دوڑی اپنے مخصوص انداز میں سراٹھایا اور کہا کہ میری آنکھوں نے غلطی نہیں کی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا حرف حرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ مغرب کو یہ فطرت کی طرف سے پہلی تنذیر ملی تھی۔ وہ اس سے عبرت حاصل کرتے تو بچ جاتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور میری آنکھیں پھر دیکھ رہی ہیں کہ

فتنہ را کہ دو صد فتنہ در آغوشش بود

دخترے ہست کہ در مہدِ فرنگ است ہنوز

سننے والوں نے اُسے سنا اور سن کر ان سُستی کر دی۔ مغرب کے قہقہوں کی روشنی اپنی خیرگی میں اور بھی بڑھتی گئی۔ اب ساری دنیا اس کی نقال تھی اور اس نقالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ پوچھنے والوں نے پھر اس "مجذوب زیرک" سے پوچھا کہ فرمائیے! آپ کیا کہتے ہیں۔ اب تو اس قصر بلند کی رفعت کہکشاں تک جا پہنچی ہے۔ اس نے پھر ایک سیلابِ تبسم سے پوچھنے والوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ

کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی برقی

نہ کر افرنک کا اندازہ اس کی تابناکی سے

حقیقت ہے نہیں میسجی کی تخلیق کی خلاق

الٹ جائیگی تدبیریں بدل جائیگی تقدیریں

دنیا نے اس پر ایک قہقہہ لگایا اور مغرب اپنی شیشہ گری اور مشرق اس کی نقالی میں پھر مصروف ہو گیا۔

اور وہ مرد زیرک پھر اپنی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مغرب نے زمین پر جال بچھایا۔ مغرب نے آسمان پر قابو پایا۔ اس نے پانی پر اپنا تسلط جما لیا۔ اس نے خشکی اور تری کو مسخر کر لیا۔ اس نے اپنی حفاظت کے پورے سامان مہیا کر لئے۔ ادھر یہ ہوتا گیا اور ادھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس دانائے راز پر کچھ عجیب سر اسیمکی کا عالم طاری ہو رہا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے اس طرح چونک اٹھتا جس طرح ایک حسین و معصوم بچہ خواب میں دہشت ناک عفریتِ خونخوار کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے۔ وہ تصور ہی تصور میں کچھ دیکھتا اور یوں ڈر کر سہم جاتا جیسے آگ اور خون کا کوئی سیلاب بلا بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ وہ پہاڑی کی چوٹی پر دُور افق سے اُس پار کچھ دیکھتا اور بے ساختہ چلا اٹھتا کہ

شفق نہیں مغربِ افق پر یہ جوئے خوں ہے! یہ جوئے خوں ہے  
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوشس و امروزیہ ہے فسانہ!  
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو  
اسی کی بیتاب بھلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

وہ دیکھو!

جہان نوہور ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے  
جسے فرنگی مقاموں نے بنا دیا ہے قمار خانہ  
وہ راتوں کی تنہائیوں میں اکیلا دیوانہ وار ادھر ادھر پھرتا۔ کبھی آسمان کے خاموش ستاروں سے  
باتیں کرتا۔ کبھی ندی کی ساکت روانیوں سے محو تکلم ہوتا۔ وہ جنگل کے ویرانوں سے شہر کی اس  
محفلِ شعروشرب کی چکا چوند کو دیکھتا جسے بڑے بڑے ہوشمندوں نے باعثِ گرمی کائنات  
سمجھ رکھا تھا تو ایک ٹھنڈی سانس بھرتا اور اپنے سینے کے داغوں کو نمایاں کر کے پکار  
اٹھتا کہ

وہ بزمِ عیش ہے جہان یک نفس و نفس      چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے اباغ  
دلوں میں ولولہ انقلاب ہے پیدا      قریب آگتی شاید جہان پیر کی موت  
وہ کبھی کسی نخلستان کے قریب کھجوروں کے ٹھنڈے کے سایہ میں وجد و مستی میں رقص کرتا اور مطرب

فطرت کی نئے نوازی کی ہم آہنگی میں والہانہ انداز میں گاتا نظر آتا کہ

زمانہ کے انداز بدلے گئے      نیاراگ ہے ساز بدلے گئے  
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ      کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ  
پرانی سیاحت گری خوار ہے      زمیں میر و سلطان سے بزار ہے  
گیا دورِ سرمایہ داری گیا      تماشا دکھا کر مداری گیا!

ایک حجازی قافلہ پاس سے گزر رہا تھا۔ سالارِ کارواں نے اس تماشے کو حیرت سے دیکھا اور کہا کہ بابا! یہ کیا کہتے ہو۔ آؤ تمہیں دکھائیں کہ اس تہذیبِ نو نے ہمارے عروقی مُردہ میں کس طرح ایک نیا خونِ زندگی دوڑا دیا ہے۔ اس نے اس سادہ لوح میرِ کارواں کی بات سنی اور منہس کر کہا کہ اے نادان! زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

اس نے پوچھا کہ پھر ہو گا کیا؟ بتایا کہ

آنچہ بود است و نباید میاں خواہد رفت      آنچہ بالیست و نبود است ہماں خواہد بود

اس نے پوچھا کہ اس کے لئے کرنا کیا چاہیے؟ جواب ملا کہ

اگر در دل جہانِ تازہ داری بروں آور  
کہ از فرنگ از جراحتِ تلے پنهان سمل افتاد است

اس نے پوچھا کہ کیا دنیا نے سچیت پھر کسی صلیبی جنگ کے ارادے کر رہی ہے؟ اس مردِ دانا نے کہا کہ نہیں۔

من از بلال و چلیپا و گرنیندیشم      کہ فتنہ دگرے در ضمیر آیام است

اس نے کہا کہ مغرب کے آہنی پنجے تو زمین و آسمان کو اپنی قابری گرفت میں لئے بیٹھے ہیں۔ اس چنگل سے رستگاری بھلا کیسے ممکن ہے! مردِ قلندر ہنسا اور اس نے کہا کہ اس گرفت کی شدت بجا اور درست۔ لیکن

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی بے مسخر      کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے

دیکھا ہے لو کیتِ افزنگ نے جو خواب      ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

لیکن یہ باتیں اس پوچھنے والے کی سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یورپ جو اس قدر

بے پناہ قوتوں کا مالک ہے کبھی تباہ و برباد ہو سکتا ہے، وہ شوکت و سطوت، غلبہ و تسلط، استیلا و قہر بانی کے اس بجز موج کو دیکھتا اور کانپ کھٹتا۔ وہ بھلا کیسے باور کر لیتا کہ کہنے والا سچ کہتا ہے لیکن کہنے والا کچھ ایسے حزم و یقین سے کہہ رہا تھا گویا اس کے سامنے سینما کا ایک فلم چل رہا ہے جسے یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بتاتا جاتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اس پوچھنے والے سے کہا کہ تیری حیرت اور استعجاب درست! لیکن جو کچھ میں کہتا ہوں وہ بھی غلط نہیں۔

تو نے دیکھا سطوت، فتارِ دریا کا عروج      موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب نے بخیر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گرد و خاک پاس      سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں

آینو الے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

سننے والے نے سننے کو تو سنا کہ ان باتوں میں لذت و جاذبیت بہت تھی۔ لیکن اسے محض شاعری سمجھا اور دادِ سخن دے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جاتے جاتے بھی اس مردِ قلندر نے اُسے آواز دی اور کہا کہ میری باتوں کو شاعری نہ سمجھ۔ یہ حقیقت ہے۔

چشم بکشتائے اگر چشم تو صاحب نظر است      زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

لیکن سننے والے نے اسے پھر بھی شاعری ہی سمجھا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس مردِ دانائے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ      وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

دنیا اپنی روش پر بدستور چلی جا رہی تھی۔ تہذیبِ مغرب اپنے پورے شباب پر تھی۔ نظامِ افرنک کی رعنائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ فقیر کج کلاہ برابر اپنی پکار کو دہرائے جا رہا تھا کہ

حذلپے چیرہ دستاں سخت میں فطرت کی تعزیریں

کسی کی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آتا تھا کہ اس ویدہ در کو کیا نظر آ رہا ہے جس کی بنا پر یہ اس شدت و اصرار سے اپنی بات کو دہرائے جا رہا ہے لیکن کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے یہ معنی آتشِ نفس، خلوت و جلوت، بستی اور ویرانہ میں ہر جگہ اپنے پیغام کو پہنچاتے جا رہا تھا۔

بایں بہانہ دریں بزمِ محکمے جویم غزلِ سدا یم و پیغامِ آستانِ گویم  
 بخلوئے کہ سخن می شود حجابِ آجا حدیثِ دل بزبانِ نثارِ می گویم

جب پوچھنے والے زیادہ اصرار کرتے تو وہ ایک ہلکے سے معنی خیز تبسم سے اتنا کہہ دیتا کہ  
 آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں  
 موحیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

اس سے ان کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی اور زیادہ کاوش سے بات کریدنے کی کوشش کرتے تو یہ جملہ  
 حجاز کا متوالا یا رانِ میکدہ سے کہہ دیتا کہ

بگرداں جام و از ہنگامہ افرنک کم تر گو

ہزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانہ پے درپے

متجسسِ قلوب سے تو وہ اس شانِ دل ربانی سے باتیں کرتا لیکن اگر کوئی ضد اور کد سے ان حقائق  
 کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اس سے ذرا کھلے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتا اور بر ملا کہہ دیتا کہ

گفت اے گندم نماتے جو فروش از تو شیخ و برہمن اندر خروش

حکمتے کو عقدہ اشیا کشاد با تو غیر از فکر چن گیزی نداد

مرگ تو اہل جہاں را زندگی است باش! تا بلنی کہ انجام تو چیت

وہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتا لیکن اس کی باتوں میں کچھ ایسی حلاوت تھی کہ ہر ایک کا جی چاہتا کہ اس  
 سے ذرا اور قریب ہو کر اس کی باتیں سنی جائیں۔ لوگ قریب تر ہوتے تو وہ ذرا اور دُور ہو جاتا کہ  
 اپنا محرم راز کسی کو نہ پاتا۔ وہ اپنی باتیں اپنے دل سے زیادہ اطمینان سے کرتا۔ لیکن غیر سے کرتا یا اپنے  
 آپ سے آنے والے انقلاب کے تصور سے اس کا دل طلسمِ بیچ و تاب بنا رہتا۔ وہ رات کی  
 تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور دعائیں مانگتا کہ

یا بخش ورسینہ من آرزوئے انقلاب

یا دگرگوں کن نہاد ایں زماں و ایں زمیں

یا چنناں کن یا چنیں!

وہ زمانہ کی بے کیف گردشِ دولابی سے گھبرا اٹھتا اور خالقِ فطرت سے اپنے عجیب محبوبانہ انداز

میں کہتا کہ

طرح نوافگن کہ ماجدت پسند افتادہ اہم  
 این چہ حیرت خانہ امروز و فردا ساختی  
 زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے نواز کی نوا میں تلخی اور نئے میں سوز بھی زیادہ ہوتا  
 گیا۔ وہ اب حقائق کو زیادہ نکھکے ہوئے الفاظ میں بیان کرنے لگ گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو چیزیں  
 اس کے عالم تصور میں دھندلے سے خواب کی صورت میں متشکل تھیں اب محسوس پیکر اختیار کر رہی  
 ہیں۔ اب وہ کھلے کھلے الفاظ میں کہتا کہ

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیا تے دوں  
 ساکنانِ عرشِ اعظم کی تناؤں کاخوں  
 اس کی بربادی پر آج آمادہ ہے وہ کار ساز  
 جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کافِ نوا

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ ارمغانِ حجاز آخری تصنیف)

ابلیس کے ایک دوسرے مشیر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

زایغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرخ  
 کتنی سرعت بدلتا ہے مزاجِ روزگار  
 چھا گئی آشفقت ہو کر وسعتِ افلاک پر  
 جس کو نادانی سے ہم سمجھتے تھے اک مشتِ غبار  
 فتنہ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج  
 کانپتے ہیں کو ہزار و مرغزار و جوتبار  
 میرے آقا وہ جہاں زیرِ زبر ہونے کو ہے  
 جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

غرضیکہ وہ صاحبِ خرد و جنوں اس تہذیب کے آل سے دنیا بھر کو آگاہ کئے جاتا رہا۔ لیکن دنیا کی  
 وہی حالت رہی کہ اس کی باتوں کو سنا اور اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئے۔ زمانہ یونہی گزرتا  
 گیا کہ ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ یہ مردِ درویش کچھ اس انداز سے مضطرب و بیتاب  
 ہے جس طرح بعض پرندے طوفان آنے سے پیشتر اضطراب و سرسیمگی میں ادھر ادھر اڑتے  
 اور چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ بابا خیر ہے! آج یہ بے کلی اور بے چینی کیوں ہے؟  
 کہا کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ اگر عافیت چاہتے ہو تو اب بھی اپنے آپ اور اپنی نسلوں کو خدائے  
 قوی و مقتدر کی حفاظت میں لے آؤ۔ ورنہ یاد رکھو کہ طوفانِ بلا انگیز میں خس و خاشاک



کی طرح بہ جاؤ گے۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے فرنگِ رنگِ سبیل بے پناہ میں ہے  
 بستی والوں نے سنا اور حسبِ دستور ایک خفیف سی ہنسی سے اس کا استقبال کیا۔ رات کو معمولاً  
 محفلِ رقص و سرود میں موجود رہے۔ آخر شب آنکھ لگی تو محسوس ہوا کہ گوباززلزلہ کے جھٹکے  
 آرہے ہیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ دیوانگی میں ادھر ادھر بھاگے۔ دیکھا تو اس قصرِ مشید کی  
 بنیادیں تک ہل رہی ہیں جس کے متعلق کبھی تصور میں بھی نہ آتا تھا کہ متزلزل ہو سکے گا۔ آندھی اور  
 جھکڑ کا طوفان، زلزلے کے جھٹکے، یہ مکان گرا وہ دیوار ٹوٹی، باہر تند و تیز بارش، اندر تباہی و بربادی  
 سامنے ڈنرگ کی پہاڑیوں کو دیکھا تو آتش فشاں چوٹیوں سے لاوے کا سیلاب اُمتد اچلا  
 آ رہا ہے اور جو کچھ سامنے آتا ہے اسے اپنے ہییب شعلوں کی لپیٹ میں لیتے بربادیوں کے جہنم میں  
 دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ بستی والوں کو اپنے پرانے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ  
 مرد وانا کیا کہتا تھا۔ اس سراسیمگی میں اٹھے اور اس فقیہ کی کٹیا کی طرف پلکے کہ اسی دانائے راز  
 سے پوچھیں کہ اس سیلابِ فنا سے بچنے کی کوئی صورت بھی ہے۔ بھاگے بھاگے گئی پر پہنچے  
 لیکن دیکھا تو کٹیا خالی ہے۔ وہ مرد ورویش کہیں چلا گیا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ اب کوئی تدبیر سچائی  
 نہیں دیتی تھی۔ کٹیا کے اندر عین وسط میں نورِ قرآنی کی قندیل جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ ایک طرف  
 ایک کدوئے کبندہ میں عشقِ محمدی کی شراب کوثرین چھلک رہی تھی اور سامنے دیوار پر جبریل کے  
 پروں سے لکھا تھا کہ

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید؟  
 نیے از حجاز آید کہ ناید؟  
 سرآمد روزگار این فقیرے  
 دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

○

بستی والوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو ایک طرف ایک کشکول دکھائی دی جس پر عربی حروف

میں لکھا تھا۔

## بحضورِ ملت

دیکھا تو اس میں کاغذ کے کچھ ٹکڑے نہایت ترتیب سے رکھے ہیں۔ سب سے اوپر ۱۹۰۴ء کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب ملتِ بیضا کا انحطاط اپنی انتہائی پستی تک پہنچ چکا تھا اور کہیں کسی طرف سے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ عین اس مایوسی اور بے کسی کے ماحول میں اس امیدوں کے شہزادے نے گرتی ہوئی قوم کا بازو کھاما اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ کیوں گھبراتے ہو۔ کیوں خوف کھاتے ہو؟

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا  
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا  
سفینتِ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناناواں کا  
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

لوگوں نے سنا اور معنی نیز تبسم سے اس کا استقبال کیا کہ انحطاط کا یہ عالم اور اس پر یہ ”موہوم“ امیدیں! اس کے نیچے ۱۹۱۲ء کا ایک پرزہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب جنگِ بلقان میں ملتِ اسلامیہ کے ترکش کا آخری تیر بھی نشاۃِ خطا کر کے ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ سطوتِ اسلامیہ کے ابھرنے کی بظاہر کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ مایوسیوں کی تاریکی نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اس ظلمتِ تاریکی میں وہ شمعِ بروارِ کاروانِ حجاز اٹھا اور اپنی مخصوص لے میں پکار کر کہا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ آ۔ اور۔ جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ۔ دیکھ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کہ کس طرح

اور ظلمتِ رات کی سیماب پا ہو جائیگی  
نہکتِ خوابِ بدہ غنچے کی نوا ہو جائیگی  
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائیگی  
موجیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

آسمان ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش  
اس قدر ہو گی ترنم آفریں بادِ بہار  
آملیں گے سینہ چاکانِ چین سینہ چاک  
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

اس کے ساتھ ہی ایک اور ٹکڑے پر یہ لکھ رکھا تھا۔  
 دیکھ کر رنگ چمن ہونہ پریشاں مانی کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی  
 خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں غانی گل بر انداز ہے خون شہدار کی لالی  
 رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عتابی ہے  
 یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے  
 (جواب شکوہ)

اُدھر یورپ کے میدانوں میں خونِ مسلم کی یوں ارزانی ہو رہی ہے اور ادھر ہندوستان میں ان ہی دونوں ایک ایسی تحریک کی ابتدا تھی جو آتشِ خاموش کی طرح وحدتِ ملت اور عالمگیریتِ اسلام کو اندر ہی اندر جلا کر رکھ کا ڈھیر بنا دینے والی تھی۔ اس مردوانا کی نگاہِ دور رس اگر ایک طرف لالہ زارِ مغرب کے آتشیں منظر پر محوِ خونناہ نشانی تھی تو دوسری طرف اس تحریکِ جدید کی ہلاکت سامانیوں سے بھی غافل نہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب یہ چیز کسی کے جیٹہ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ قومیت پرستی (یعنی وطن کو وجہِ جامعیت قرار دے کر متحدہ قومیت کی تشکیل) میں بھی مسلمانوں کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ ہے۔ بڑے بڑے وردمندانِ ملت اپنی وطن پرستی پر فخر کرتے نظر آتے تھے لیکن ان سب میں اکیلا یہ مردوانا تھا جس نے بلند آہنگی سے پکار کر کہا کہ

اس دور میں مے اور ہے جامِ اوسے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطفِ مستم اور  
 مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیر بن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ وہ زمانہ تھا جب تہذیبِ مغرب کی تقلید میں نیشنلزم گویا وطن کا فیشن بن رہی تھی۔ ہند بھونے کا ثبوت یہ تھا کہ انسان نیشنلسٹ ہو۔ عین اُس زمانہ میں اس دیدہ ور کی نگاہوں نے دیکھ لیا کہ یہ نیا فتنہ کس قدر اسلام کے بنیادی خطوط سے متضاد و متباہن ہے۔ اس نے قوم کو جھنجھوڑ کر کہا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی  
 ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا اور جمعیت کہاں اور جمعیت ہوتی رخصت تو ملت بھی گئی

اس لئے کہ۔

نرا لاسائے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا  
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے!

اس کے بعد ایک اور ورق ملا۔ یہ اس زمانہ کا لکھا ہوا تھا جب ہندوستان میں جدید اصطلاحات کا دور دورہ تھا جس کی رو سے یہاں مغربی انداز کے جمہوری نظام کی طرح ڈالی گئی تھی۔ یہ وقت وہ تھا کہ مغربی جمہوریت کو نوعِ انسان کی تمام مصیبتوں کا حل بتایا جاتا تھا۔ اسی میں اصل آزادی کا راز مضمر سمجھا جاتا تھا۔ تمام ہندوستان نے جمہوری نظام کی طرف ان اصلاحی اقدام کا خیر مقدم کیا حتیٰ کہ مسلمانوں کی طرف سے بلند آہنگی سے نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے اور کسی نے یہ نہ سمجھا کہ اس جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں کس قدر بعد المشقین ہے۔ یہ جمہوریت وہ تھی جس کی رو سے قانون سازی کا اختیار انسانوں کی ایک جماعت کو تفویض کر دیا جاتا تھا اور یوں اقلیت پر اکثریت کے فیصلوں کی پابندی لازم تھی۔ ادھر ساری دنیا اور ہندوستان کے مسلمان ان جمہوری اصطلاحات پر چراغال کر رہے تھے اور ادھر یہ مردانا نہیں متنبہ کر رہا تھا کہ یاد رکھو!

ہے وہی سازِ کبن مغرب کا جمہوری نظام  
دیو استبداد جمہوی قبا میں پائے کو ب  
مجلس آئین و اصلاح و رعایاتِ حقوق  
جسکے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری  
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری  
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستان سمجھا ہے تو  
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اس ورق کے دوسری طرف لکھا تھا۔

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شود  
کہ از مغزِ دو صد خرف فکرِ انسانے نمے شود

ان ہی دنوں کا لکھا ہوا ایک اور ورق ملا۔ زمانہ وہ تھا جب یورپ کے گدھ، ترک کی کے مرد بیمار کی لاش

پر منڈلا رہے تھے۔ عرب و عجم میں مسلمانوں کی رہی سہی قوتیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ (پہلی جنگِ عظیم کے بعد کے اثرات سے ملتِ اسلامیہ کا جسمِ ناتواں نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ زمانہ جس میں

لے گئے تھلث کے فرزند میراثِ علیل  
خشتِ بنیاد کلیسا بن گئی خاکِ حجاز  
ہو گیا مانند آبِ ارزاں مسلمان کا لہو  
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں وائے راز

اس عالمگیر مایوسی میں جب کہیں سے شعاعِ اُمید جلوہ افروز نظر نہیں آتی تھی، اس مردِ مومن نے اپنی قرآنی فراست سے دیکھا کہ مایوسیوں کے ان خوفناک بادلوں کے پیچھے اُمید کی سنہری کرن بھی موجود ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈوبتی ہوئی قوم کو حوصلہ دیا کہ وجہِ اضطراب کچھ نہیں۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی  
افق سے آفتاب بھرا گیا دورِ گراںِ خوابی  
عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا  
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی!

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونیوالا ہے

شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

اس کے نیچے لکھا تھا۔

سرسنگِ چشمِ مسلم میں ہے نیستال کا اثر پیدا  
خلیل اللہ کے دریا میں ہونگے پھر گہر پیدا  
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے  
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگِ بر پیدا

ادھر اس قدر تابناک اُمیدوں کی قندیل کو روشن کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی یورپ کی ہمسائیگی میں بسنے والے ترکوں کو اس سے بھی آگاہ کر دیا کہ یاد رکھو کہیں تم بھی تہذیبِ مغرب کے فریب میں نہ آجانا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی  
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے  
وہ حکمتِ ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو  
ہوس کے پنجہ خون میں تیغِ کارزاری ہے

تدبیر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا

جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب روس کا بالشویکی نظام عالمگیر حیثیت اختیار کئے جا رہا تھا۔ اور چونکہ یہ نظام سرمایہ داری کا ردِ عمل تھا اور گھبرایا ہوا انسان یہ سمجھ رہا

تھا کہ بس وہ تریاق ہاتھ آگیا جو زمانہ حاضر کے ہر قسم کے زہر کا مداوا ہے۔ اسی لئے اپنے مرکز سے ہٹا ہوا مسلمان بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ ہاں! یہ نظام عین اسلامی نظام ہے۔ اس عالمگیر غلغلہ اندازی میں اس مردوانا نے اس نظامِ اشتراکیت کا تجزیہ کیا اور فریب خوردہ مسلمان سے کہا کہ یاد رکھو تو میں صرف تخریب (ال) سے زندہ نہیں رہا کرتی۔ اس کے ساتھ تعمیر (ال) کی بھی ضرورت لایفک ہوتی ہے۔ نظامِ اشتراکیت پر غور کرو۔

فکر اور ژئند بادِ لا بساند      مرکبِ خود را سوائے اَلَا نراند  
آیدش رُزے کہ از زورِ جنوں      خویش را زیں تند بادِ آرد بروں  
در مقامِ لانیاساید حیات      سوائے اَلَا می خرامد کائنات  
لَا و اَلَا ساز و برگِ امتاں  
نفی بے اثباتِ مرگِ امتاں

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب یورپ نے بین الاقوامی معاملات کے تصفیہ کے لئے مجلسِ اقوام کی طرح ڈالی تھی اور دنیا خوش تھی کہ اب نزاع اور جھگڑوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ جنگ نابود ہو گئی۔ اب کمزوروں پر ظلم و استبداد روا نہیں رکھا جائے گا۔ ہر ایک کی داد رسی ہوگی۔ دنیا خوش اور مطمئن تھی لیکن اس مردوانا نے سر ہلا دیا اور کہہ دیا کہ

برفتد تا روشِ رزمِ دریں بزمِ کہن      ورد مندانِ جہاں طرح تو انداختہ اند  
من ازیں پیش ندانم کہ کفنِ دزدے چند      بہر تقسیمِ قبورِ انجمنے ساختہ اند  
اس کے نیچے لکھا ہے ے

نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد      از "کفنِ وزداں" چہ امید کشاد  
در جنیوا چیت غیر از مکر و فن      صید تو این میش و آن پنجر من  
نکتہ ہاکومی نگنجد در سخن      یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن

ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر ہندوستان میں وطن پرستی، متحدہ قومیت کا وام ہمنگ زمین وسیع

سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا اور بھولا بھالا مسلمان بلا سوچے سمجھے اپنے ہاتھوں اس دام کے حلقے کتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ دانائے راز برابر پکارتا چلا جا رہا تھا کہ یاد رکھو یہ سرابِ رنگ و بو ہے۔ یہ تمہاری غلامی کی نئی زنجیریں ہیں۔ وطن کی بنا پر قومیت کا تصور تمہیں دورِ اسلام سے نکال کر عہدِ جاہلیت کی طرف لے جائے گا۔

ایک کانگریس کے پُرزے پر اس بحری تار کی نقل تھی جو گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے نمائندوں کے نام بھیجی گئی تھی کہ دیکھنا کہیں مخلوط انتخاب کو تسلیم نہ کر لینا۔ یہ تمہاری جمعیتِ اسلامی کی بنیادیں اکھیر کر رکھ دے گا۔ ایک یادداشت کا تھوڑا سا ٹکڑا موجود تھا جس پر نہرو رپورٹ کی مخالفت کی تلقین تھی۔ ۱۹۳۰ء کی لکھی ہوئی ایک لمبی چوڑی دستاویز ایک حریطہ کے اندر سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ اس میں بڑے کام کی باتیں تھیں۔ ایک مقام پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ ریاست کا قیام اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

بستی کے لوگ کشکول کی ان دستاویزوں کو کھول رہے تھے اور فقیر کی ہیبت ان کے دلوں پر چھائے جا رہی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے گویا وہ ابھی تک کٹیا کے اندر ہی ہے۔ ان دستاویزوں کا انداز کچھ ایسا لاہوتی سا تھا کہ وہ اس زمین کی باتیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔

پھر کچھ اور متفرق بادواشتیں ملیں۔ کسی میں افسردہ دل صوفی سے کہا گیا تھا کہ

حرم کے درد کا دریاں نہیں تو کچھ بھی نہیں  
تری خودی کے نگہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی

یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور

کہیں خطا پرست مٹا سے سخا طرب تھا کہ :-

فقیر شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور  
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بستہ  
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی  
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست  
کہیں اس زمانہ کے جھوٹے مدعیانِ امامت و نبوت سے خطاب کیا تھا کہ  
فقہ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی  
جو مسلمانوں کو سلاطین کا پرستار کرے  
کہیں افرنگ زدہ مسلمان سے کہا گیا تھا کہ  
ترا وجود سراپا تجلی افرنگ  
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی ہے  
کہیں اربابِ فنونِ لطیفہ کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ  
اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن  
شاعر کی نوا ہو کہ معنی کا نفس ہو  
کہیں فلسفہ دانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ

سُن مجھ سے یہ نکتہ دل افروز

انجامِ خورد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری

بستی والے ان یادداشتوں کو دیکھتے تھے اور حیران ہوتے جاتے تھے کہ یہ مردِ قلندر کس مقامِ بلند پر تھا  
کہ اس کے سامنے ہر شے اپنی اصلی شکل میں بے نقاب ہو جاتی تھی اور وہ ان تمام چیزوں کے  
محاسن و معائب کو کس طرح کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر دیتا تھا اور یہ سب کچھ اس چھوٹی سی کٹیا  
کے اندر بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہ کس طرح

یک چین گل، یک نیستاں نالہ، یک خم خانہ سے

اپنے دامن میں رکھتی تھی کہ زندگی کا کوئی شعبہ اور علم و سائنس کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس کو یہ محیط نہ  
ہو۔ ایک پرزہ دیکھا تو اس پر گویا آتشیں حروف میں چند شعر لکھے ہوئے ملے۔

عجم ہنوز نداندر موز دیں ورنہ  
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوا بھجی است  
سر و بر سر منبر کہ ملت از دطن است  
چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است  
بمصطفیٰ برسائے خویش را کہ دیں ہمراہ است  
اگر با و نرسیدی تمام بولہبی است



پڑھنے والوں میں سے ایک نے کہا کہ جن صاحب کا نام لیا گیا ہے یہ تو سنا ہے کسی دینی مکتب کے صدر مدرس تھے۔ ایک گوشے میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو واقعی صدر مدرس تھے لیکن اس فقیر دانا کو تم کیا سمجھتے ہو۔ اس کی شکل و صورت اور وضع قطع پر نہ جاؤ۔ اس کے لگے کا عالم ہم نے تو اپنی زندگی میں دیکھا نہیں۔ بستی والے یہ سب کچھ دیکھ اور سُن رہے تھے اور بیٹھے سرپیٹ رہے تھے کہ ہم نے اس دانا کے کچھ قدر نہ کی۔ یہ تو بیٹھے ہی بیٹھے دنیا کو کچھ سے کچھ کر گیا ہے۔ بستی والوں نے اس مرد بزرگ سے پوچھا کہ سائیں بابا! یہ تو بتاؤ کہ یہ مرد دانا اس قسم کی باتیں کہتا کس طرح سے تھا! یہ تو ہمیں کسی اور ہی دنیا کا انسان نظر آتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگوں کی یہی تو بھول ہے۔ یہ مرد دانا اسی دنیا کا انسان تھا۔ اس نے نہ (معاذ اللہ) نبی ہونے کا دعویٰ کیا نہ مہدی کا۔ نہ وہ مجددیت کا مدعی ہوا نہ امامت کا۔ اس نے اپنے آپ کو سیدھا سادا مسلمان کہا اور بس۔ بستی والوں نے پوچھا کہ ہماری بات تو وہیں کی وہیں رہی کہ جب اس نے کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا تو پھر وہ ایسی باتیں کس طرح کہتا تھا۔ مرد بزرگ نے کہا کہ میں نے خود اس سے یہ سوال کیا تھا جس کے جواب میں مرد دانا نے اپنے مخصوص تبسم سے کہا تھا کہ اس میں "کراہات" کی کوئی بات نہیں اپنی آنکھیں جن پر کسی بیرونی اثر کا رنگین چشمہ نہ ہو اور قرآن کریم کی روشنی۔ اس سے وہ فراست پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہر شے کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

میان آب و گلِ خلوتِ گزیدم ز افلاطون و فارابی بریدم

نکروم از کسے در یوزہ چشمم جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم

"میری صہبائے بصیرت" (مرد دانا نے کہا) خمکدہ حجاز سے سر بہر آجگینوں میں آتی ہے جس میں خالص قرآن ہوتا ہے۔ یہ کہا اور مرد دانا کی آنکھوں میں آنسو ڈھب آئے۔ فرمایا کہ کیا آپ نے میری وہ دعا نہیں سنی جو آہِ سحر گاہی اور نالہ نیم شبی کے حقیر سے نذرانے کے ساتھ میں نے بحضور خواجہ کوئین پیش کی ہے۔ سنئے کہ میں نے کیا درخواست پیش کی ہے۔

گردلم آئینہ بے جوہر است در بحرِ نم غیر قرآنِ مضمراست

پردہ ناموسِ فکرم چاک کُن ایں خیاباں را ز خام پاک کُن

روزِ محشر خوار و رسوا کُن مرا بے نصیب از بوسہ پاک کُن مرا

آخری مصرع پڑھا اور پڑھتے ہی وہ مردوانا بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا سر سے پاؤں تک قلب ہی قلب ہے۔ جو سوز و گداز و تپش و خلش کا نازک آبگینہ ہے۔ بستی والے اس مرد بزرگ کی باتیں سن رہے تھے۔ ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں طلسم اضطراب موجزن تھا۔ انہوں نے دیکھا تو ایک پُزرے پر لکھا تھا۔

پس از من شعر من خوانند مے یا بند و می گویند

جہا نے را دگر گوں کرد یک مرد خود آنگاہے

بستی والوں نے اس شعر کو دیکھا اور بلک بلک کر رونے لگ گئے۔ جب ذرا سنبھلے تو کہا کہ اے کاش! ہمیں یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ بالآخر اب ہم کیا کریں۔ دیکھا تو ایک ورق پر لکھا تھا۔

لے اسیر رنگ پاک از رنگ شو      مومن خود کافر از رنگ شو

رشتہ سود و زیاں در دست تست      آبروئے خاوراں در دست تست

ایں کہن اقوام را شیرازہ بند      رایت صدق و صفار کن بلند

اہل حق را زندگی از قوت است      قوت ہر ملت از جمعیت است

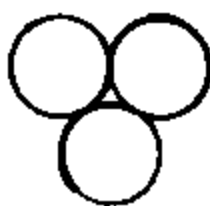
راتے بے قوت ہمہ مکر و فسوں

قوت بے راتے جہل است و جنوں

بستی والے افسردہ و غمگین کٹیا سے باہر آگئے۔ ہر ایک کی آنکھیں مثل شیشی اور قلب متمتی تھا کہ اے کاش وہ مردوانا کہیں سے پھرتا پھرتا ایک مرتبہ پھر ادھر آنکلی۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ انہوں نے سنا کہ دُور پہاڑی کے دامن میں میٹھے میٹھے سروں میں کوئی گاجا رہا تھا کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے موتا ہے چمن میں دیدہ و پر پیدا



# اقبال کی کہانی خود اقبال کی زبانی

یومِ اقبال ۱۹۵۱ء کی تقریر

یہ کہانی "سوانح عمری نہیں جس میں ترتیب واقعات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے" یہ صرف اقبال کے قلب و دماغ کی مختلف کیفیتوں کا مطالعہ ہے جسے زبان و مکان کی قیود سے الگ ہٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ لہذا اس "کہانی" کو اسی زاویہ نگاہ سے دیکھئے۔

برادران عزیز!

علامہ اقبال نے اپنے آخری کلام "ارمغانِ حجاز" میں کہا ہے کہ

چورختِ خویش بر بستم ازیں خاک ہمہ گفتند باما آشنا بود  
 و لیکن کس ندانست این مسافر چہ گفت و با کہ گفت داز کجا بود

جب کیفیت یہ ہے کہ خود اقبال کے اپنے اندازے کے مطابق کوئی شخص اقبال کی حقیقت سے کما حقہ واقف نہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقی اقبال کی جھلک دیکھی کہاں سے جاتے؟ اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں اس لئے کہ اقبال خود اپنے متعلق اتنا کچھ بتا گیا ہے کہ اس سے اقبال کی پوری تصویر نگہ تجسس کے سامنے آجاتی ہے۔ میرے لئے تو یہ مشکل ہے کہ اس مختصر سے وقت میں اس پوری تصویر کے تمام گوشوں کی تفصیل آپ کے لئے جنتِ نگاہ بنا سکوں۔ اس وقت صرف اتنا ہو سکے گا کہ اس کے اُبھرے ہوئے نقش و نگار اور نمایاں خط و خال سامنے لائے جاسکیں۔ اس

مرقع نگہ تاب اور پیکرِ خوش انداز کی تفصیلی گل کاریوں اور جلوہ طرازیوں کو میں نے اپنی اس تصنیف کے لئے اٹھارہ کھابے جو "پیامِ اقبال اور قرآن کریم" کے عنوان سے برے پیش نظر ہے اور جسے میں حضرت علامہ کے ان احسانات کی بنا پر "جن سے میری نگہِ شکر ہمیشہ نگوں سار ہے" اپنے ذمہ ایک قرض سمجھتا ہوں، خدا مجھے اس قرض سے سبکدوش ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

اس وقت میری دوسری مشکل یہ ہے کہ حضرت علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے اور اس قسم کا مخلوط مجمع فارسی زبان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مجھے فوراً ان کے اردو کلام ہی پر اکتفا کرنا ہوگا اور فارسی اشعار صرف ان مقامات پر پیش کئے جائیں گے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ اب سنئے اقبال کی کہانی، خود اقبال کی زبانی۔

انیسویں صدی کے آخر شب کے ستارے جھلملا رہے ہیں اور بیسویں صدی کی نازنینہ سحر انگڑائیاں لے رہی ہے۔ قلبِ زندہ ولانِ پنجاب یعنی لاہور کی کیفیت بارِ فضا میں، شبابِ دشر کی نگہتوں اور رنگ و لعط کی نزہتوں سے دامنِ باغبان و کعب گل فروش کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ گورنمنٹ کالج کی درس گاہ اپنے معیارِ تعلیم کی پابندی کے ساتھ ساتھ دولت مند خاندانوں کے عشرت پسند نونہالوں کی لالباہیوں کے لئے دورِ دور تک شہرت حاصل کر چکی ہے کہ اتنے میں سیالکوٹ کے ایک متوسط خاندان کا نہایت ذہین طالب العلم اس حیرت کدہ علم و تماشائیں آنکلتا ہے۔ شروع شروع میں جہاں وہ نوجوان اس فضا کو اپنے لئے غیر مانوس پاتا ہے وہاں خود وہ فضا بھی اس نودارد کو اجنبی سا محسوس کرتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ نوجوان طالب العلم اپنی سحر طرازیوں سے اس پوری فضا پر چھا جاتا ہے اور جس محفل میں شریک ہو جاتا ہے اسے تبسمِ فشان و قبہ بار بنا دیتا ہے۔ تعلیمی منازل میں اس کا یہ عالم ہے کہ اساتذہ اس کا معلم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دوستوں کی مجالس میں یہ کیفیت کہ ہر شخص اس قریب تر ہونے میں ایک خاص نشاطِ روح محسوس کرتا ہے۔ اس کی شرکت سے شعر و سخن کی محفلوں میں ایک تازہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ حقوڑے ہی دنوں میں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ

اس سے پیشتر لاہور محض ایک پکیر آب و گل تھا اور اس میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ پہلے پہل ابھی مسکراتی ہے لیکن اس کے باوجود اس نوجوان کی حالت یہ ہے

## کان لاج کا زمانہ

کہ وہ اس محفل طرب و نشاط کے کسی ساز کو اپنا ہم آہنگ اور اس گل کدہ حسن و تماشا کے کسی پھول کو اپنا ہم رنگ نہیں دیکھتا۔ اسے ہر ایک اپنا ہمنوا اور اپنا ہم ذوق سمجھتا ہے لیکن وہ کسی کو بھی اپنا ہم صیغہ و ہم نگاہ نہیں پاتا۔ اس کی شرکت سے اجڑی ہوئی محفلوں پر بھی بہار آجاتی ہے۔ لیکن یہ بھری محفلوں میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کسی شے کی جستجو ہے جس نے اسے سراپا اضطراب بنا رکھا ہے۔ کوئی غلش تجتس ہے جو اسے کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اپنی تشنگی ذوق کی تسکین کے لئے ہر دور سے نظر آنے والے چشمہ کی طرف طرف لپکتا ہے لیکن اسے سراب پا کر مضطرب و بیقرار واپس آجاتا ہے۔ وہ کبھی اس تسکین خاطر کے لئے لارنس گارڈن میں جانکتا ہے لیکن اس جہان رنگ و بو کی جمال افروز شادابی و شگفتگی بھی اس کے لئے جاذب نگاہ نہیں بنتی۔ وہ ایک حسین شاخ پر مسکرانے والے گل رنگیں کو نہایت غور سے دیکھتا ہے اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

تو شناسائے خراش عقدا مشکل نہیں  
لے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں

زیب محفل ہے شریک شورش محفل نہیں  
یہ فراغت بزم ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چین میں میں سراپا سوز و ساز آرزو

اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

سوز بانوں پر کبھی خاموشی تجھے منظور ہے  
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے

میری صورت تو بھی اک برگِ یاض طور ہے  
میں چین کے دور ہوں تو بھی چین کے دور ہے

مطمئن ہے تو پریشاں مثل بورتتا ہوں میں

زخمی شمشیر ذوق جستجو رہتا ہوں میں

ہو سکتا تھا کہ وہ اس غلش پیہم اور سوز مسلسل کے ہاتھوں تنگ آکر اپنی زندگی کا رخ بدل لے لیکن کوئی بے صوت صدا ہے جو چپکے ہی چپکے اس کے کان میں کچھ کہہ دیتی ہے اور وہ بکا راٹھتا ہے کہ نہیں مجھے گھبرانا نہیں چاہیے۔ کہیں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو      یہ جگر سوزی چراغِ خانہٴ حکمت نہ ہو  
 ناتوانی ہی مری سرمایہٴ قوت نہ ہو      رشکِ جامِ جم مرا آیتِ نہ حیرت نہ ہو

یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے  
 تو سنِ ادراکِ انساں کو خرامِ آموز ہے

یہ تجسس اسے پھر آمادہٴ تجسس کر دیتی اور وہ ہلاکِ ذوقِ جستجو پھر اسی تپش و غلش کے لئے سیما پیا  
 ہو جاتا ہے جب اس سے پوچھا جاتا کہ بالآخر اس سوزِ پیہم اور غلشِ مسلسل کی وجہ کیا ہے، ہر شخص نے  
 اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصود متعین کر رکھا ہے اور اس کا دل اس سے مطمئن ہے لیکن ایک تم ہو کہ تمہیں  
 کسی پہلو قرار ہی نہیں۔ کوندے کی لپک کی طرح یہاں سے وہاں اور شعلے کی تڑپ کی طرح وہاں سے یہاں۔  
 وہ سب کچھ سنتا اور ایک آہ بھر کر کہہ دیتا کہ

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقامِ درن سازد      دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زار سے  
 چون نظرِ سرگرد بہ نگارِ خوب روئے      تپداں زماں دلِ من پئے خوب نگارے  
 ز شررِ ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے      سرمنزلے ندارم کہ میرم از قرار سے  
 طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد      بہ نگاہِ ناشکیبے بدلِ امید وائے

اس کی فطرت کی یہی سیما بیت اور ذوقِ جستجو کی اضطرابیت تھی جو اسے ہر محفل میں دیوانہ وار لئے لئے  
 پھرتی تھی۔ کبھی حکمت و فلسفہ کی خشک گھاٹیوں میں اور کبھی شعر و ادب کی شاداب وادیوں میں کبھی  
 مسجد و خانقاہ کی خلوتوں میں اور کبھی محفلِ رنگ و چنگ کی جلوتوں میں۔ اور یہ سب کچھ اس بیابانہ  
 اعتراف کے ساتھ کہ

مدتے بالالہ رویاں ساتم      عشقِ بامرغولہ مویاں بافتم  
 بادہ با با ماہِ سیما یاں زدم      بر چراغِ عافیتِ اماں زدم

چنانچہ اس کی یہ ہر رہ نوری اور ہر منزل نشینی کی کیفیت جسے قرآن نے فی کل داد یہی ہون  
 کی شاعرانہ نفسیاتی کیفیت سے تعبیر کیا ہے، دیکھنے والوں کے دل میں اس کے متعلق عجیب و غریب  
 خیالات پیدا کیا کرتی۔ اسی کیفیت کو ایک مولوی صاحب کی زبان سے سینے جو اس زمانہ میں اقبال  
 کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ اقبال کے الفاظ ہیں:-

اقبال کہ ہے قمری شمشادِ معانی  
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی  
مقصود ہے مذہب کی نگر فاک اڑانی  
عادت یہ ہمارے شعر ار کی ہے پرانی  
اس رمز کے اب تک نہ گھلے ہم یہ معانی  
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا  
پابندیِ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟  
سمجھا ہے کہ ہے راگِ عبادات میں داخل  
کچھ عار اُسے حسنِ فردشوں سے نہیں ہے  
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلادت  
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے

میں نے بھی سنی اپنے احسا کی زبانی  
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی  
یہ آپ کا حق تھا زورِ قربِ مکانی  
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمدانی  
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی  
کی اس کی جدائی میں بہت اشکِ فشانی

اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی تھکب میں  
اک دن جو سہرا راہ ملے حضرتِ زاہد  
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے  
اگر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت  
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا  
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

کچھ اس میں تسخیر نہیں، واٹھ نہیں ہے

واعظ کو اس قسم کے مسلک سے وجہ شکایت بجاتی تھی۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس باب میں  
زندگیاں میسکہ بھی کچھ کم گلہ طراز نہ تھے۔ اس کی بھی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ اقبال ہے کیا؟  
وہ بھی یہ کہتے تھے کہ

رونقِ ہنگامہٴ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے  
کچھ تیرے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے  
اے تلون کیش! تو مشہور بھی ہے سو ابھی ہے

ہے عجب مجموعہٴ اضداد اے اقبال تو  
عینِ شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدیز  
ہے حسینوں میں و فانا آشنا تیرا خطاب

لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سباب تو

تیری بیتابی کے صدقے ہے عجب بیتاب تو

یہ سنکر اقبال مسکراتا اور کہتا کہ

عشق کی آشفستگی نے کر دیا صحراب سے  
مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبار کہتا ہوں میں  
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے  
مظہرِ بناں اول سکوں نا آشنا کہتا ہوں میں

فیض ساقی شبنم آسا طرفِ دل دریا طلب  
تشنہِ دائم ہوں آتشِ زیرِ پار کہتا ہوں میں

خاش آرزو سے اقبال کی یہ آشفستگی روز بروز بڑھتی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے سینہ  
شعلہ سا ماں و آذر فشاں میں جو شہرِ بیا ہو رہا ہے اسے اپنے ہم جلیس احباب کو کس طرح دکھائے؟  
یہی وجہ تھی کہ وہ بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا اور یہ تنہائی اسے رہ رہ کر ستاتی تھی۔ حتیٰ کہ  
وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ

لطف مر نے ہیں ہے باقی نہ مزہ جینے میں  
کچھ مزہ ہے تو اسی خونِ جگر پینے میں  
کتنے بیتاب ہیں جو مرے آئینے میں  
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں  
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

اسے تلاش تھی کسی ایسے محرمِ راز کی جو اسے کی سنتا اور اسے سمجھتا لیکن اسے کہیں ایسا رفیق ہمنوا نہیں ملتا  
تھا حتیٰ کہ وہ اپنی تلاش میں کھٹک کر کہہ اٹھتا کہ

یہاں کہاں ہم نفس میسر یہ دیس نا آشنا ہے اے دل  
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخ کہن نہیں ہے

اسے اس تنہائی کا احساس آخر تک رہا اس لئے کہ وہ جس دیس کی بولی بولتا تھا اسے سمجھنے والا یہاں  
کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ ہر راہرو سے کہتا کہ

غریب شہر ہوں میں شن تو لے مری فریاد  
کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد  
مری نوائے غم آلود ہے مستراحِ عزیز  
جہاں میں علم نہیں دولتِ دلِ ناشاد  
گلہ ہے مجھ کو زمانہ کی کورڈوتی سے  
سمجھتا ہے مری محنت کو محنتِ فریاد  
صدائے تیرے کہ بر سنگی نذر دگر است  
خبر بیکر کہ آواز تیرے جو گراست



یہ تنہائی بعض اوقات اس قدر شدت اختیار کر جاتی کہ وہ سمجھتا کہ وہ کسی اور دنیا کا انسان ہے جو بھولے بھٹکے یہاں چلا آیا ہے۔ وہ راتوں کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور خدا سے کہتا کہ

دریں میخانہ لے ساقی ندارم محرے دیگر

کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

لیکن اس تنہائی کے باوجود کسی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش تھی جو اسے ہر وقت گوشہ بگوشہ لئے لئے پھرتی تھی۔ تلاشِ حقیقت کی یہی غلشِ بے پایاں تھی جو اسے دانشکدہ فرنگ میں لے گئی۔ وہاں پہنچ کر ایک اور کشمکش شروع ہو گئی یا پو

## دانشکدہ فرنگ

کہیے کہ اس کی دیرینہ کشمکش کی نوعیت متعین ہو گئی۔ اقبال کی کیفیت یہ تھی کہ ابتدائی تعلیم و تربیت کے اثر سے ایمان اس کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔ اس کے تحت الشعور میں اس کے نقوش بہت گہرے تھے۔ لیکن دماغی طور پر وہ ابھی تک فلسفی تھا۔ فلسفہ سے اسے شغف بھی خاص تھا۔ مغرب میں پہنچے تو وہاں کے فلاسفر کی صحبت اور تعلیم نے اس شغف کو اور گہرا کر دیا۔ لیکن اس سے ہوا یہ کہ جو کچھ قلب کی گہرائیوں میں بلا دلیل و برہان جاگزیں تھا فلسفہ اس کی تائید نہیں کرتا تھا اور جو کچھ فلسفیانہ دلائل و براہین سے ثابت ہوتا تھا اس کی گواہی دل نہیں دیتا تھا۔ دل اور دماغ کی یہی وہ کیفیت تھی جو آگے چل کر مشرق اور مغرب کی کشمکش کے نام سے ابھری۔ یہی وہ کشمکش ہے جو اقبال کے سارے پیغام میں مختلف اصطلاحات سے سامنے آتی ہے۔ عقل و عشق

دل و دماغ، خرد و جنوں، علم و حضور، خیر و نظر، ذکر و فکر، رازی درومی، ابلیس و جبریل، مصطفیٰ و بلوہب، اہرمن و یزداں، یہ سب تقابل و حقیقت ادراک و جذبات کی اسی کشمکش کے منظر تھے۔ مغرب میں میکائیلی تصویریات نے انسان کو ایک پیکر آب و گل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی تھی۔ اس تصور کی رُو سے زندگی مادی تبدیلیوں سے وجود میں آجاتی تھی اور انہی اجزاء کے پریشان ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اس کے برعکس ایمانی تصویریات کی رُو سے حیات انسانی کا سرچشمہ مادہ سے ماوراء تھا اور موت اس کی آخری حد نہیں تھی بلکہ زندگی کی جوئے نغمہ خواں اس کے بعد بھی مسلسل رداں و دواں رہتی تھی۔ مغربی سائنس کی رُو سے علم کا دائرہ محسوسات کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس کے برعکس ایمانیات کی رُو سے علم حقیقی کا سرچشمہ وحی

تھا جو سرحدِ ادراک سے ماوراء تھا۔ مغربی معاشرے کی بنیادیں تنہا عقل پر استوار تھیں جن کا تقاضا ہر فرد کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایمانیات کی رو سے معاشرے کی اساس ان مستقل اقدار پر رکھی جاتی تھی جو تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر نفع و نقصان اور خیر و شر کی میزان ہوتی ہیں۔ عقل کا تقاضا دوسروں کا سب کچھ چھین کر اپنا آپ بنانا تھا۔ لیکن عشق کا تقاضا دوسروں کی ربوبیت سے اپنے نشو و ارتقا کا سامان ہم پہنچانا تھا۔ عقل انسانی زندگی کو سمٹا کر انفرادی دائرہ میں محبوس کر دیتی تھی، عشق اسے پھیلا کر ساری دنیا پر محیط کر دیتا تھا۔ عقل خود ہیں تھی، عشق جہاں ہیں۔ عقل من و تو کے امتیاز سے درخت کو شاخوں اور پتوں میں منقسم دیکھتی تھی، عشق کو ہر ذرہ میں آفتاب پنہاں نظر آتا تھا۔ عقل محوِ ماشائے لبِ بامِ رہتی تھی، عشق آتشِ نورد میں بے خطر کود پڑنے کا متقاضی تھا۔ عقل بولہبی جیلہ جو تیاں سکھاتی تھی اور عشق روحِ مصطفویٰ کا پیامبر تھا اور یہ حقیقت ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے ناموز چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی  
عقل و عشق کی یہی کشمکش تھی جس نے دانشکدہ مغرب میں اقبالؒ کے سینے کو وقفِ اضطراب کر دیا  
اور اس سے دن کا چین اور رات کا آرام چھین لیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ  
اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں  
کبھی سوزِ مسازِ رومی کبھی بیچ و تابِ رازی  
یہی وہ ددِ در تھا جسے یاد کر کے وہ بعد میں کہا کرتے تھے کہ

مجھے وہ درسِ فننگ آج یاد آتے ہیں کہاں حضور کی لذت کہاں حجابِ دلیل  
اقبالؒ کی زندگی میں یہ مقام بڑا مشکل اور یہ دور ایسا بڑا فیصلہ کن تھا۔ اگر اس کشمکش میں دماغِ دل پر غالب آجاتا۔ اگر مملکتِ عشق میں عقل کی حکمرانی ہو جاتی۔ اگر فلسفہ کی دیلیں ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتیں۔ اگر زندگی کی سوداگرانہ مصلحت کو شیاں متاعِ فقر و قلتِ رسی کو خرید لیتیں، تو اس کے بعد نہ صرف یہ کہ اقبالؒ اقبالؒ نہ ہوتا بلکہ نہ دنیا کے نقشے پر پاکستان کا وجود ہوتا اور نہ ہم آپ آج عشق و محبت کے ان جگر سوز افسانوں کو اس طرح دہراتے۔ نہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا اپنا کوئی مستقر و مقام ہوتا اور نہ آج یہاں ایمان و شہدائے ان کے انسانیت ساز تصورات کے چرچے ہوتے

اس نازک وقت میں خود اقبال پر کیا گزر رہی تھی اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر کبھی یہ کیفیات خود وارد ہوئی ہوں۔ جب عقل و حکمت کی فسوں سازیاں اس کے لئے فریب نگاہ بننے کی کوشش کرتیں تو عشق و مستی کی زندانہ جرات فرماتیاں عروس حقیقت کے حسین چہرے سے ذرا نقاب سرکا دیتیں۔ وہ حقیقت کی اس ایک حلیمنی جھلک سے فریب عقل سے جھنجھلا کر منہ موڑ لیتا اور اثر درد میں ڈوبی ہوئی نوائے جگر گداز سے کہتا کہ

الہی عشقِ نجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھائے  
اسے ہے سو دوائے بنجیہ کاری مجھے سر پیرن نہیں ہے

اور کبھی بے تاب ہو کر دعائیں مانگتا کہ

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر      شریکِ زمرة لایخزوں کر  
خرد کی گتھیاں سلجا چکا ہیں      مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

مبدا و فطرت کا یہ انداز عجیب ہے کہ جب تلاشِ حقیقت کی تڑپ و خلش انتہائی شدت اختیار کر لیتی ہے تو حقیقت اپنے چہرے سے خود آپ نقاب اٹھا دیتی ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں نبی اکرم سے فرمایا گیا کہ **وَ جَدَاكَ ضَالًّا فَوَدَىٰ**۔ ہم نے تمہیں تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو منترِ حیات کی طرف راہ نمائی کر دی۔ چنانچہ جو شخص بھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا ہے فطرت کا غیر مرنی ہاتھ اس کی راہ نمائی کر دیتا ہے۔ عام انسانوں کی صورت میں یہ راہ نمائی سہل (پگڈنڈیوں) کی طرف ہوتی ہے۔ **وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا** (۲۹/۴۹) لیکن رسول کی راہ نمائی صراطِ مستقیم یعنی زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف ہوتی ہے۔ پگڈنڈیوں پر چلنے والے اگر اپنا رخ اس صراطِ مستقیم کی طرف کر لیں جس پر رسول کا مزن ہوتا ہے تو ان کی پگڈنڈیاں بھی اسی شاہراہِ حیات سے جا ملتی ہیں ورنہ ان کا روانِ حیات فضائے عقل و خرد کے بیچ و خم میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب تلاشِ حقیقت میں قلبِ اقبال کی تپش و خلش بھی شدت تک پہنچ گئی تو اس فیصلہ کن لمحہ میں مبدا فیض کی گرم گستری سے اس کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھ گیا۔ جب عقل کی شررا نگیزیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر کہا کہ اس طلسمِ بیچ و تاب سے نکلنے کی راہ کون سی ہے تو وہ گھبرا یا لیکن ایک ثانیہ میں اس کا دل پُرسوز پکارا اٹھا کہ

چارہ این است کہ عشق کشادے طلبیم پیش ادسجدہ گزاریم و مرادے طلبیم  
اس جواب سے اقبال کا وہ قلب بیتاب جو اس کشمکش خرد و جنوں سے سرپا اضطراب بن رہا تھا،  
ایمان دیقین کی طمانیت بخش آسودگی سے قرار و سکون کی جنت بن گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کی یاد میں  
وہ اس کیف و مستی سے پکارا ٹھٹھا تھا کہ

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ  
جس جو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بسل مجھے  
خوبی قسمت سے آخر گل گیا وہ گل مجھے

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں  
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی  
اہل گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں  
دل کے مٹ جانے سے میر گھر کی آبادی ہوئی  
ضو سے اس خورشید کی اختر میرا تابندہ  
چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر گروی و آدابِ فتا آموستی  
اے غنک روزے کہ خاشاکِ مراد رسوستی

اس سے اقبال کے دل کو کس قدر یکسوئی نصیب ہو گئی اس کی نحیف سی جھلک اس نے اپنی اس نظم  
میں دکھائی ہے جو "حسن و عشق" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں شامل ہے۔ مضمون کے علاوہ اس  
نظم میں حسنِ شعریت، تراکیب کی ندرت، تشبیہات کی موزونیت اور استعارات کی برجستگی  
دیکھتے اور پھر اندازہ لگاتے کہ ابتداء ہی سے فطرت نے اس حقائق شناس قلب کو اسلوب  
بیان بھی کس قدر حسین و دلکش عطا فرمایا تھا۔ یہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیانی دور کی نظموں  
میں سے ہے، کہتے ہیں۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر  
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا آنچل لیکر  
نور خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر  
چاندنی رات میں ہمتاب کا ہنرنگ کنول  
موجہٴ نہکتِ گلزار میں غنچے کی شمیم  
جلوہٴ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم

لے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس سے اقبال کا اشارہ کسی اور طرف ہے لیکن جہاں تک میرے مضمون کا تعلق ہے

خواص کو مطلب ہے گہر سے نہ صدف سے

بے ترے سبیلِ محبت میں یونہی دل میرا  
 ہے مرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار  
 میکرے تیرا تخت کو دیا تو نے قرار  
 جب آباد تر عشق ہوا سینے میں  
 نئے جوہر ہوتے پیدا مرے آئینے میں  
 حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تھرک کمال  
 تجھ سے سرسبز ہوتے میری امیدوں کے نہال  
 قافلہ ہو گیا آسودہ منزل میرا

یہ عشق کی پہلی منزل تھی جس میں قرار و سکون ہی مدعاۓ حیات سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ منزل آئی جس میں شورش و حرارت مقصودِ کائنات نظر آتا ہے۔ عشق کی ان بلا انیگز شورشوں میں وہ لذت تھی کہ اقبال اس حظ و کیف کے لئے قدم قدم پر ہل من مزید کی دعائیں مانگتا اور عجیب رقص و مستی میں پکار اٹھتا تھا کہ

گیسوتے تابدار کو اور بھی تابدار کر  
 ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر!  
 عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی حجاب میں  
 یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آستکار کر!

جب اقبال کو اس کشمکشِ پیہم سے اس طرح فراغ نصیب ہو گیا تو اس نے عقل و خرد کے اس تمام دفتر بے معنی پر جو اپنے آپ کو وجہ قیام کائنات سمجھے ہوئے تھا ایک تبسم ریز نگاہ ڈالی اور اس سے اپنے مخصوص انداز میں کہہ دیا کہ

تیری متاعِ حیات، علم و ہنر کا سرور  
 میری متاعِ حیات، ایک دلِ ناصبور  
 فلسفہ نے یہ سنا تو اقبال سے پوچھا کہ ذرا یہ تو بتائیے کہ اس آشفٹہ سامانی اور چاک گریبانی کی منطقی  
 توجیہ کیا ہے۔ اقبال نے ہنس کر کہا کہ

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے  
 وراثے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں  
 چلتے چلتے طبیعیات کی جھاڑیوں نے اس کا دامن الجھایا اور کہا کہ ذرا ٹھہریئے کہ آپ کو آغازِ حیات  
 کا راز بتاؤں۔ اقبال نے سنا اور قلندرانہ استغناء کی شان سے جواب دیا کہ

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے

کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

فلکیات نے کہا کہ میری رصدگاہوں سے فضائے آسمانی کی مجیر العقول پہنائیوں اور ان میں تیرے والے

تجربہ ایگزیکٹو کروں کا تماشا نظر آئے گا۔ اس مردِ دانہ نے سنا اور ایک خندہ زیر لبی سے جواب دیا کہ اب یہ لا انتہادِ سعیتیں میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام  
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں



اقبال کے سامنے جب مقصودِ حیات اس طرح واضح ہو گیا تو اس نے اپنے لئے مستقبل کا راستہ متعین کر لیا۔ اس کے سامنے عشق کے اس زندگی بخش پیغام کو تمام **منزل کا تعین** دنیا کے انسانوں میں عام کرنا تھا۔ یاد رکھتے جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا عشق سے اقبال کی مراد وہ نظامِ ربوبیت تھا جو وحی کی بنیادوں پر استوار ہوتا تھا اور جس کا مقصود نوعِ انسانی کی فطری صلاحیتوں کا کامل نشو و ارتقا تھا۔ یہ نظام تمام انسانیت کے لئے تھا۔ لیکن اس کی ابتداء کسی ایسے خطہٴ زمین اور ایسے گروہ سے کی جاسکتی تھی جو اس پیغام کی عملی تشکیل کے لئے اولین خمیر بن سکے۔ اس نے جب اپنی قوم پر نگاہ ڈالی تو اسے یکسر راکھ کا ڈھیر پایا۔ بایں ہمہ اسے اس راکھ کے ڈھیر کے نیچے سے کچھ سلگتی ہوئی چنگاریاں بھی دکھائی دیں۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی آتش نوائی سے اس راکھ کے ڈھیر کو شعلہٴ جوالہ بنا کر اس سے نوعِ انسانی کے لئے زندگی کی حرارت کا کام لے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے رفقاء کو اس پر دو گرام سے آگاہ کر دیا۔

بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں  
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں  
سنگِ امروز کو آئینہ فردا کر دیں

عبدالقادر مرحوم کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں :-  
اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاں پر  
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط  
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق

شمع کی طرح جنیں بزمِ گہ عالم میں  
خود جلیں ویدہ اغیار کو بینا کر دیں

بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح اور متعین انداز سے کہ  
گتے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرانوردیوں کا  
جہاں میں مانندِ شمع سوزاں میں محفل گداز ہو جا

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستی قوم ہے حقیقی فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زینِ طلسم مجاز ہو جا

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا

بچا کے وامن ہوں سے اپنا غبارِ رہِ حجاز ہو جا

ان آرزوؤں اور دعاؤں، ان ولولوں اور تمنائوں کو دل میں لے کر اقبال ہندوستان واپس آ گیا۔ گیا تو ایک مجموعہ اضراد تھا واپس آیا تو ہمہ تن یک رنگ و یک آہنگ گیا تو دل میں شکوک و شبہات کی ہزاروں پھالیں لٹے ہوئے، آیا تو اسے سکون و طمانیت کی جنت بناتے ہوئے گیا تھا

فلسفی بننے کے لئے، آیا تو نوعِ انسانی کے لئے پیامبر بن کر گیا تھا سازِ **یورپے واپسی** عقل لے کر آیا سوزِ عشق خرید کر اور اس متاعِ سوز و ساز اور سرمایہٴ پیش

گداز کو لے کر آیا۔ اُس برفِ آلود سرزمینِ مغرب سے جہاں عشق و ایمان کی رہی سہی چنگاریاں بھی بجھ جایا کرتی ہیں، گیا تھا تو وہ انداز تھا اور واپس آیا تو اس شان سے کہ کیفِ ہستی کی فصاحتوں میں جھوم رہا ہے اور وجد و رقص کے عالم میں گنگنا رہا ہے کہ

کافر ہندی ہوں میں، دیکھ مرادِ ذوق و شوق

شوقِ مری لے میں ہے شوقِ مری نے میں ہے

لیکن عشق و جنوں کی ان واویلوں میں پہنچ کر اقبال نے عقل کو تیاگ نہیں دیا۔ اس لئے کہ عقل و خرد کو

تیاگ دینا قرآن کا پیغام نہیں، رہبانیت کا مسلک ہے۔ قرآن کی رُو سے عقل اور وحی کا تعلق ایسا

ہی ہے جیسے انسان کی آنکھ اور روشنی کا تعلق ہے۔ جو شخص اپنی آنکھ سے کام نہیں لیتا اس کے لئے

روشنی کا عدم وجود برابر ہے اور آنکھ بغیر روشنی کے بیکار ہے۔ لہذا قرآن کا پیغام، عقل کو وحی کے

تابع رکھنا اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنا ہے۔ چنانچہ عقل و عشق، خرد و جنوں

ذکر و فکر، خبر و نظر، علم و حضور کے اس حسین امتزاج کا نام تھا اقبال جس نے کہا کہ

خرد نے مجھ کو عطا کی نظرِ حکیمانہ

سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ نداء

اور مشرق کو مغرب دونوں کو یہ پیغام دیا کہ

شرقیوں را عشقِ رازِ کائنات

کارِ عشقِ از زیر کی محکم اساس

غربیوں را زیر کی سازِ حیات

زیر کی از عشقِ گردِ دحقِ شناس

عشق چوں بازیر کی ہمیر شود      نقش بندِ عالمِ دیگر شود  
 غیر و نقشِ عالمِ دیگر بنہ      عشق را بازیر کی آمیزدہ

مغرب نے تنہا عقل کی ابلہ فریبیوں سے ساری دنیا کو قمار خانہ بنا رکھا تھا۔ مشرق میں مُلا اور صوفی کی کم نگہی نے اسلام جیسے انقلاب در آغوشِ نظامِ حیات کو بے نتیجہ رسوم کا مجموعہ اور محکومی و نا اُمیدی کے مسلک گو سفندی کا نقیب قرار دے رکھا تھا۔ اقبال کے پیشِ نظر مشرق اور مغرب کے ان دونوں تصوراتِ زندگی کے خلاف جنگ کرنا تھا۔ چونکہ فطرت نے اقبال سے یہ بڑا کام لینا تھا اس لئے اسے اس مقصدِ عظیم کے لئے خاص طور پر تیار کیا گیا۔ فرشتوں کے نام خدا کے پیغام میں ہے کہ

تہذیبِ نوی کارگِ شیشہ گراں ہے      آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دوا  
 اور انہی آداب و جنوں کا اثر تھا کہ اس نے تہذیبِ حاضر کے اس نگاہِ فریبِ طلسم کو توڑ کر رکھ دیا۔  
 فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی      مری اکیسے شیشے کو بخشی سختیِ خارا

لیکن تہذیبِ نو کے اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہلاکت انگیز خود اپنے ہاں کے مکتبِ مفانقاہیت کی تعلیم تھی جس کے خلاف اقبال کو مسلسل بہاد کرنا تھا۔ اس کے لئے اس نے متلاشیانِ حقیقت کو پکار کر کہا کہ

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادہ باب      نندر سے میں باقی نہ خانقاہ میں ہے

وہ ان سے بار بار کہتا کہ

رو و رسمِ حرمِ نامحرمانہ      کلیسا کی ادا سودا گرانہ

تبرکے ہے مرا پیراہنِ چاک      نہیں اہل جنوں کا یہ زیانہ

اس نے دیکھا کہ مدعیانِ علمِ شریعت انسانی زندگی کے ابتدائی مسائل تک سے ناواقف ہیں اس لئے ان کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ مقامِ کبریا کو پہچان سکیں۔ اس نے مُلا سے بر ملا کہا کہ

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو      تری ننگے سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال      تری ازاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام



جب اربابِ شریعت و طریقت کی سطح بین نگاہیں اس کے حقیقت رس پیغام پر تنقید کرتیں تو وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا اور بے نیازانہ کہہ دیتا کہ یہ بیچارے معذور ہیں اس لئے معاف کر دینے کے قابل۔ یہ نہیں جانتے کہ میں کیا کہتا ہوں اور کس مقام سے کہتا ہوں۔

کیا صوفی و ملا کو نمبر میسر جنوں کی ان کا سروا من بھی ابھی چاک نہیں ہے لیکن جاننے والی نگاہیں جانتی تھیں کہ یہ دانستہ اسرار حقیقت کیا کہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے اور اعتراف کرتے کہ

رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے ہیں اس کی گفتگو کے اندازِ محرمانہ

وہ جانتا تھا کہ ہماری مرتبہ شریعت اور طریقت دونوں کے مستعار تصورات اسلام کے عجمی ایڈیشن ہیں جن پر صرف ڈسٹ کور (DUST COVER) قرآن کا ہے۔ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ عجمی نظریات زندگی فکرِ اسلامی کے شجرِ طیب پر اکاس بیل کی طرح مسلط ہیں۔ جب تک اس اکاس بیل کو الگ نہیں کیا جائے گا، شجرِ طیب کبھی سرسبز و شاداب نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے وہ پوچھنے والوں سے کہتا کہ

کتے ہیں فاش روزِ قلندری میں نے کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

ظاہر ہے کہ ایسے انقلاب آفریں پیغام کی ہر طرف سے مخالفت ہونی تھی۔ لیکن اس نے اس کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی آتش نوائی کو مسلسل جاری رکھا اور اس طرح رفتہ رفتہ فضائے ملت اس کی آہِ شبی اور نالہِ سحری سے اثر پذیر ہوتی چلی گئی۔ اسی حقیقت کے پیش نظر اس نے کہا تھا کہ

مری نواسے ہوئے زندہ عارفِ عامی دیلے میں نے نہیں ذوقِ آتشِ شامی

لیکن اس کے باوجود اس کی قوم جس خوابِ گراں میں سو رہی تھی اسے اس سے جگانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ہزار برس سے گاڑی زندگی کی صراطِ مستقیم چھوڑ کر دوسری پٹری پر چلی جا رہی تھی۔ اسے اس مقام سے واپس لا کر پھر سے صحیح لائن پر ڈالنا آفتابِ مغرب کی طنائیں کھینچ کر اسے سوئے مشرق لانا تھا۔ اسے خدا سے شکایت ہی یہ تھی کہ

میں بندہ نادان ہوں مگر شکر ہے تیرا رکھتا ہوں نہا خانہ لاہوت کے پیوند

اک دلولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو  
 لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند  
 تاثیر ہے میرے نفس کی کہ خزاں میں  
 مرغانِ سحرِ خواں میری محبت میں ہیں خور  
 لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے  
 جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ ضامنند

واضح رہے کہ اقبال کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں تھا کہ انگریزوں کی بجائے حکومت ہمارے  
 ہاتھ میں آجائے۔ بلکہ یہ کہ اس خطہ زمین کے مسلمان انسانوں کے بنائے  
 ہوئے قوانین کی بجائے ضابطہ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔

## آزادی کا پیغام

اسی مقصد کے لئے اس نے ملتِ اسلامیہ کو پاکستان کا تصور دیا تھا۔ لیکن قوم نے اس وقت  
 اس تصور کو ایک شاعر کا افسانوی تخیل سمجھ کر اس پر غور و فکر کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک طرف اپنی قوم  
 کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف مخالف قوتیں برقی رفتاری کے ساتھ چاروں طرف سے هجوم کر کے  
 اُمنڈے چلی آ رہی تھیں۔ حالات ایسے نامساعد تھے۔ لیکن بایں ہمہ وہ اس سیلابِ بلا انگریزوں میں روشنی  
 کے مینار کی طرح کھڑا تھا کہ زمانہ کی تلاطم انگریزوں میں آئیں اور اپنا سر بھوڑ کر واپس چلی جائیں۔ یہی  
 تھے وہ حالات جن کے متعلق اس نے کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند دتیز لیکن چراغ اپنا جلارہا ہے  
 وہ مرد درویش جس کو حق نے دیتے میں اندازِ خسروانہ

ان ناموافق حالات میں ہمرانِ سُست عناصر سے ایوسیوں کے چھلاوے سے ڈرتے اور ٹھنڈی  
 سانس بھر کر کہتے کہ

بہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے  
 قصہ گل ہمنوایان چمن سنتے نہیں  
 سینہ سوزاں ترافراو سے معمور ہے  
 اہل محفل تیرا پیغام کہن سنتے نہیں  
 زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں  
 شمع سے روشن شبِ ووشینہ ہو سکتی نہیں

تو اس کا چہرہ تمنا اٹھتا۔ پیشانی جوشِ حمیت سے شفق آلود ہو جاتی۔ وہ امتیادوں کی ایک دنیا اپنے جلو  
 میں لئے اٹھتا اور حزم و یقین کی پوری قوتوں سے کہتا کہ

ہنشیں! سلم ہوں میں توجید کا حامل ہوں میں  
 اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں

نبض موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے  
حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا  
میری ہستی پیر بن عسیرانی عالم کی ہے  
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے  
ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں  
یا و عہد رفت میری خاک کو اکسیر ہے

اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے  
اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا  
میں کھٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے  
ہے بھر و سہ اپنی ملت کے تقدیر پر مجھے  
اہل محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں  
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

سامنے رکھتا ہوں اس دور نشاط افزا کو میں  
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں سدا کو میں

وہ جانتا تھا کہ نا اُمیدیوں کے چھلاوے سے ڈرانے والے وہ ہیں کہ مدت ہائے دراز سے تقلید اور  
بے عملی کے حیات سوز اثرات ان کی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر چکے ہیں اور وہ اپنی زندگی  
میں نحیف سی تبدیلی کے تصور تک سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ وہ ان پیران کہن سے کوئی توقع نہیں رکھتا  
تھا۔ اس لئے وہ اپنے پیغام کا حقیقی مخاطب ان نوجوانوں کو سمجھتا تھا جن کے قلب و نگاہ کی تبدیلی  
توموں کی تقدیریں بدل دیا کرتی ہے۔ انہی کو وہ اپنی متاع سوز و گداز کا وارث سمجھتا اور انہی کے لئے  
راتوں کو اٹھ اٹھ دعائیں مانگا کرتا تھا کہ

شراب کہن پھر پلا سا قیا  
خرد کو غلامی سے آزاد کرا  
تڑپنے پھر کئے کی توفیق دے!  
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر!  
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے  
مرے دیدہ تر کی بے خوابیاں!  
مرے نالہ نیم شب کا نیازا!  
امنگیں مری، آرزو میں مری!  
یہی کچھ ہے ساتی متاعِ فقیر!  
وہی جام گردش میں لاسا قیا  
جوانوں کو پیروں کا استاد کرا!  
دل مرتضیٰ، سوزِ صدیق دے!  
زمینوں کے شب زندہ واروں کی خیر!  
مرا عشق میری نظر بخش دے  
مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں!  
مری خلوت و انجمن کا گداز  
امیدیں مری جستجو میں مری!  
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!

مرے قافلے میں لٹا دے اسے!

لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!

ملت کے مستقبل کا یہی غم پنہاں تھا جس نے اقبال پر راتوں کی بیند حرام کر رکھی تھی۔ علی بخشش کا بیان ہے کہ جن دنوں آپ کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ ایک رات پچھلے پہر میں نے سنا کہ پتنگ سے سسکیوں کی آواز آرہی ہے۔ چپکے سے قریب گیا تو دیکھا کہ آپ تکیہ پر کہنیاں ٹیکے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ رو رہے اور گنگنا رہے ہیں کہ

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا  
اسی غزل کے دو شعر اور بھی سنئے۔ فرماتے ہیں:-

تھم لے رہو کہ شاید پھر کوئی شکل مقام آیا  
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بنے پیام آیا  
وہ محل اٹھ گئی جس دم تو مجھ تک دور جام آیا  
ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی  
چل اے میری غزبی کا تماشہ دیکھنے والے

علی الصباح حسب معمول حکیم صاحب آئے۔ دیکھا تو رنگ معمول سے زیادہ زرد ہے اور چہرہ پہلے سے زیادہ افسردہ۔ آنکھیں سوج رہی ہیں اور کمزوری بڑھ گئی ہے۔

کیفیت مزاج پوچھی تو آنکھوں میں آنسو ڈھبڈبا آئے اور بمشکل اتنا کہہ سکے کہ  
کس سے کہوں کہ زہرے میکلے مئے حیات  
کہنہ بزم کائنات تازہ ہیں میکر و اردت

حکیم صاحب نے ہلکے سے تبسم سے کہا کہ آپ تو دنیا بھر کے مسائل کا حل دو سردوں کو بتاتے رہتے ہیں، اپنی مشکل کا حل کیوں نہیں تلاش کر باتے۔ انہوں نے بھی اسی انداز کے تبسم زیر لپی سے فرمایا کہ کیا کہوں!

مقام ہوش سے آساں گزر گیا اقبال  
مقام شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ  
حکیم صاحب نے پوچھا کہ بالآخر وہ کونسی بات ہے جس کا غم آپ کو اس طرح نڈھال کئے جا رہا ہے۔ کہا  
کہ حکیم صاحب آپ دیکھتے نہیں کہ

لے اقبال کافدائی جو دنیا میں عام طور پر اقبال کے ملازم کی حیثیت سے متعارف ہے لیکن جو درحقیقت اقبال کا عاشق تھا اور اس عشق کو آج تک زندہ رکھے ہوئے ہے۔ (اب اس کا بھی انتقال ہو چکا ہے)۔

خلوتیانِ مدسہ کو رنگاہ و مددہ فوق  
 جلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو  
 میں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ  
 میری تمام سرگذشت کھوئے ہوں کی جستجو  
 حکیم صاحب نے کہا کہ آپ کا مرض زیادہ تشویشناک ہونا جا رہا ہے۔ آپ کو کچھ دنوں کے لئے ان تفکرات کو چھوڑنا  
 ہوگا۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب! میں جانتا ہوں کہ  
 پھونک ڈالا ہے مری آتشِ نوائی نے مجھے

لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ

اور میری زندگی کافی کا یہی سماں بھی ہے

اتنے میں ڈاک آگئی۔ دیکھا تو اس میں ایک خط ایسے فلسفہ زدہ نوجوان کا تھا جس کے والد سے آپ  
 کے دیرینہ مراسم تھے۔ اس نے، جیسا کہ فلسفہ کے ابتدائی مراحل میں، جب کہ طالب علم کے افکار میں  
 ہنوز پختگی نہیں آتی، اکثر ہوتا ہے، نفسِ انسانی، وحی، حیات بعد الممات، مستقل اقدار و غیرہ  
 تصورات پر نہایت طنز آمیز اعتراضات کئے تھے۔ آپ نے خط پڑھ کر پینسل اٹھائی اور اس کی پشت  
 پر لکھ دیا کہ :-

میں اصل کا خاص سو مناتی	آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد	میری کفِ خاک برہن زاد!
ہے فلسفہ میکے آب و گل میں	پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے	اس کی رگ رگ سے بانہر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز	سُن مجھ سے یہ نکتہ دل افروز
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت	ہیں ذوقِ طلب کے واسطے موت
دیں مسلکِ زندگی کی تقویم	دیں سرِ محبت و ابراہیم
دل در سخنِ محبت ہی بند	اے پور علیؑ ز بو علی چند

ابھی اس خط کا جواب ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ لاہور کے ایک مشہور روزنامہ کے مدیر جن کا شمار آپ  
 کے حلقہ ارادتِ مندان میں ہوتا تھا، اندر آگئے۔ خیریت مزاج کے بعد کہا کہ آپ نے دیکھا ہے کہ آپ  
 کے حالیہ بیان پر فلاں اخبار کے ایڈیٹر نے کیسے رکیک جملے کئے ہیں۔ آپ مسکرائے اور کہا کہ میں نے

دیکھا تو نہیں، کل شام فلاں صاحب سے شہنازور تھا۔ انہوں نے جھکتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ کوئی جواب لکھیں گے۔ آپ نے اس کی طرف مُڑ کر دیکھا اور کہا کہ بھائی! میں ان جھمیلوں میں کبھی نہیں الجھتا۔ آپ مجھے جانتے ہیں کہ ..

درویشِ خدا مست نہ شرفی بنے غربی  
کہتا ہوں وہی بات جھتا ہوں جسے حق  
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں میگانے بھی ناخوش  
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش  
پُرسوز و نطفِ بازو و کوبین و کم آزار  
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم

گھر میرا نہ دلی نہ صفا ہاں نہ سمرقند  
نے ابدۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند  
میں زیرِ بلا ہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند  
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانہ اسپند  
آزاد و گرفتار وہی کیہ و خورسند  
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

حتیٰ کہ میرا تو یہ عالم ہے کہ

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال  
کتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

صحافی نے کہا کہ درحقیقت یہ ایک سازش ہے دو قوموں کے اس نظریہ کے غلاف جس کا تصور آپ نے پیش کیا ہے اور جس کی رُو سے مسلمانانِ ہند کو اپنے مستقبل کے لئے ایک واضح اور درخشندہ نصب العین مل گیا ہے۔ آپ نے پھر مسکرا کر فرمایا کہ سازش ہے تو ہو اگرے مجھے اس کی کیا پرواہ ہے؟

رہے ہیں اور میں فرعون میری گھات میں تنگ  
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا

بعد سے پھر حسبِ معمول پھر ملنے والوں کا اجتماع ہوا۔ دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک صاحب

نے کہا کہ (مولانا) حسین احمد مدنی نے آپ کے اشعار کے جواب میں جو بیان دیا ہے وہ آپ کی نظروں سے گزرا۔ فرمایا کہ ہاں میں نے دیکھا

**معرکہ دین و وطن**

ہے۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب نے قوم اور ملت کے متعلق جو لفظی بحث چھیڑی ہے، آپ اس کا کچھ

جواب دیں گے؟ فرمایا کہ

فقہہ شہرقاروں ہے لغتِ اے حجازی کا  
نہ کر خارا اشکافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

قلندِ جزو دو حرفِ لا الہ کچھ بھی نہیں کہتا

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو

پھر حقہ کا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ..

کہاں تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ دلہنشی کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا  
 آپ کے حلقہ احباب میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا کہ نالائق اور جاہل  
 لوگ بڑے بڑے مناصب و مدارج حاصل کئے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ جن کی قابلیت کا سکہ ساری  
 دنیا مان رہی ہے لیکن اس طرح ایک گوشے میں پڑے ہیں۔ وہ آتے اور آپ سے کہتے کہ فلاں اسامی  
 خالی ہو رہی ہے۔ آپ اپنی آمادگی ظاہر کر دیجئے فوراً کامیابی ہو جائے گی۔ آپ ان مخلص بھی خواہوں کی  
 سادگی پر مسکراتے اور جی ہی جی میں کہتے ہیں انہیں کس طرح بتاؤں کہ مہدار فیض کی عنایات  
 خسروانہ نے مجھے کیا عطا کیا ہے اور یہ مجھے کس طرف بلا رہے ہیں۔ وہ زیادہ اصرار کرتے تو آپ ان  
 سے کہتے کہ :-

فطرت نے نہ سخا مجھے اندیشہ چالاک  
 وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک  
 رکھتی ہے مگر طائف پرواز مری خاک  
 وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک  
 وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی  
 چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو

کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو غرقناک

جاوید سے آپ کو بہت محبت تھی۔ وہ ابھی بچہ تھا لیکن اس سے آپ بڑے  
 کام کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دن اس نے پوچھا کہ ابا جان! آپ کے پاس  
 نہ اچھے اچھے کپڑے ہیں نہ قیمتی صوفے اور قالین۔ نہ بہت سے نوکر جا کر ہیں نہ موٹر ہی ہے لیکن آپ  
 کے پاس بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ یہ آپ کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں۔ آپ نے اس کے سر پر  
 ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹا!

ہے میری بساط کیا جہاں میں بس ایک فنان زیربامی

اک صدق مقال ہے کہ جس سے میں چشم جہاں میں ہوں گرامی

جب آپ لندن گئے ہیں تو جاوید نے پہلا خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا۔ اس کے جواب میں آپ نے

اسے لکھا کہ

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر  
 نیاز مانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو  
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر  
میں شاخِ تاک میں میری غزل ہے میرا اثر  
مرے شکر سے متے لالہ فام پیدا کر  
میرا طریقِ امیری نہیں فقیری ہے  
خودی نریج غریبی میں نام پیدا کر

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اقبال کے پیغام کی تندہی اور تیزی بھی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کی نگہ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے اور اس کی بساطِ سیاست پر مسلمان کس طرح پٹ رہا ہے۔ اس آنے والے انقلاب کے تصور سے جوں جوں اس کا احساس شدید ہوتا جاتا اس کی نوا کی تلخی بھی تیز ہوتی جاتی۔ اقبال کے پیش نظر پوری انسانیت کے اندر ایک ایسا انقلاب برپا کرنا تھا جس سے یہ زمین بدل جائے، یہ آسمان بدل جائے اور خاکِ آدم کو وہ نمود حاصل ہو جس کے لئے اسے اس طرح سنوارا گیا تھا۔ انقلابِ آفرینی کا یہی وہ جذبہ تھا جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ

یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کرنے دے پیدا  
گرفتہ چینیوں احرام و مکی خفہ در بطحا

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی  
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے  
وہ کرمقام پر کہتے ہیں کہ

گستاخ ہے کرتل ہے فطرت کی حنا بندی  
رومی ہے نہ شنائی ہے کاشی نہ سمرقندی  
آدم کو سکھانا ہے آدابِ خداوندی

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمنازی  
خاک ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی  
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے

ادھر آسمان پر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں لیکن ادھر زمین والے ہنوز یہی طے نہیں کر پاتے تھے کہ اقبال جو کچھ

سرچشمہ پیغامِ اقبال کہتا ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ کوئی کہتا کہ اس کے کلام میں سوز و گداز اور کیفیت و مستی کے تذکرے ان نقوش کے اثرات

کا نتیجہ ہیں جو بچپن کی مشرقی تعلیم اور تصوف آمیز ماحول نے اس کے تحت الشعور میں ترسیم کر رکھے ہیں۔ کوئی کہتا کہ ان کی فکر نیشے، برگسان، ایگزینڈرا، وارڈ، جیمز جیسے مغربی مفکرین کے فلسفہ کی زمینِ منت ہے۔ اقبال یہ سب کچھ سنتا اور ان سادہ لوح معترضین سے کہتا کہ جب تم اس منبعِ علم و یقین سے آشنا نہیں ہو جو میری فکر کا سرچشمہ ہے تو اس باب میں قیاس آرائیاں کیوں کرتے ہو؟



میری فکر نہ مشرقی کتب و خانقاہ سے متاثر ہے نہ مغربی حکمت و فلسفہ کی منت پذیر۔

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض میری

یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

میں نے مشرق و مغرب دونوں کے علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مجھے حقیقت کا سراغ  
سراغ نہیں ملا۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے

یہاں ساتی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

میری فکر کسی سے بھی متاثر نہیں۔ میں نے کسی چیز کو قلباً دیکھا ہی نہیں بلکہ ہر شے کو از خود پرکھا ہے  
اور اپنے نتائج آپ مستنبط کئے ہیں۔

میان آب و گل غلوت گزینم ز افلاطون و فارابی بریدم

نکردم از کسے در یوزہ چشم جہاں را جز بہ چشم خود نہ دیدم

یہی میرا مسلک ہے جس سے اب کیفیت یہ پیدا ہو چکی ہے کہ لاکھ پرووں میں چھپی ہوئی حقیقت میری  
نیکر تجتس کے سامنے از خود بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ

اقبال نے کل اہل خیاباں کو سنایا یہ شعر نشاط آور و پُرسوز و طربناک

میں صورتِ گلِ دستِ صبا کا نہیں محتاج کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

یہی وہ حقیقت کشائی ہے جس سے میری دیدہ وری کا یہ عالم ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردہٴ افلاک میں ہے

عکس اس کا مرے آئینہٴ اوراک میں ہے

چنانچہ وہ جہاں فواجس کے انتظار میں آسمان کے تاروں کی آنکھیں ایک مدت سے محروم خواب  
ہیں میرا پیغام اس کے لئے طائرِ پیشِ رس ہے۔

عالمِ فہمے ابھی پردہٴ تقدیر میں میری نواؤں میں ہے اسکی سحر لے حجاب

لہذا اس عالمِ ہست و بود کی حقیقت صرف اس پر کھل سکتی ہے جس کی سمجھ میں میرا پیغام  
آجائے۔

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا

جسے آگتی ہر سیر میری شوخی نظر را

لوگ سمجھتے ہیں کہ اقبال جاوید منزل میں پلنگ پر لیٹے حقہ پیتا رہتا ہے اور شاعری کرتا رہتا۔ انہیں کیا خبر کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

مرے ہمصیفر سے کبھی اثر بہا سمجھے!

انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

**شاعری نہیں** | یہ شاعری نہیں، نہ ہی شاعری کسی پیغام بر کے شایانِ شان ہوتی ہے جس کے سامنے زندگی کا نصب العین متعین ہو۔ اس کا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہو اور اس لئے وہ ہر مخاطب کو اسی منزل کی طرف دعوت دے رہا ہو، اسے شاعری سے کیا واسطہ!

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

یہ وہی "رازِ درونِ میخانہ" تھے جن کے متعلق میں نے زبورِ عجم میں کہا ہے کہ

زبرونِ درگد شتم ز درونِ خسانہ گفتم

سخنے نگفتہ راچہ قلت درانہ گفتم

تم اسے شاعری سمجھتے ہو اور میں شاعری کو اپنے خلاف تہمت خیال کرتا ہوں۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ بستم مثالِ شاعرانِ افسانہ بستم

نہ بینی خیرا زان مردِ فرد دست کہ بر ما تہمت شعر و سخن بست

تم اسے سُسن و شباب کے رنگین افسانے سمجھتے ہو۔ تم اسے عہدِ کہن کی خواب آور داستانیں تصور کرتے ہو۔ تم یہی سمجھے بیٹھے ہو کہ یہ گل و بلبل کی فرضی کہانیاں ہیں۔ تمہارا اندازہ یہی ہے کہ یہ ایک شاعر کی دنیائے تصورات کی پریشاں خیالیاں ہیں۔ اگر تمہارا یہی اندازہ ہے تو کس قدر غلط ہے تمہارا یہ اندازہ۔ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو کس قدر باطل ہے تمہارا یہ خیال۔ اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ درحقیقت ہے کیا تو آؤ میرے مے سخن کے پیالے میں جھانک کر دیکھو کہ اس میں کیا نظر آتا ہے؟

دو عالم راتوں دیدن بہ مینائے کہ من دارم  
 کجا چشمے کہ بیند آن تماشا تے کہ من دارم  
 دگر دیوانہ آید کہ در شہر افگند ہونے  
 دو صد ہنگامہ بر خیزد ز سودائے کہ من دارم  
 مخور ناداں غم از تاریکی شبہا کہ می آید  
 کہ چو باجم درخت داغ سیمائے کہ من دارم

ندیم خویش می سازی مرا لیکن ازاں ترسم

نداری تاب آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

سننے والے یہ سب کچھ سنتے لیکن ان کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آتا تھا کہ اگر یہ خیالات نہ فکر مغرب سے  
 استعارے ہیں نہ تصورات مشرق سے۔ نہ یہ مکتب کی زلہ چینی ہے نہ خانقاہ  
 کی درپوزہ گری۔ نہ یہ شاعری ہے نہ افسانہ طرازی۔ تو پھر بالآخر ان تصورات حیات  
 کا سرچشمہ کیا ہے۔ وہ مرد خود آگاہ و خدا مست یہ کچھ سنتا اور کہتا کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ میرے انقلاب  
 بردوش پیغام کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس کا سرچشمہ ہے۔

## قرآن

آں کتاب زندہ قرآن حکیم  
 حکمت اولیٰ ز ال است قدیم  
 نسخہ اسرار تکوین حیات  
 بے ثبات از قوتش گیر ثبات  
 میں نے عمر بھر اسی شمع عالم تاب سے اکتساب ضیا کیا ہے۔ اسی میں ناپید اکنار سے حکمت کے موتی  
 نکالے ہیں۔

گوہر دریائے قرآن سفتہ ام  
 شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام

اس لئے

از تب و تابم نصیب خود بیگر  
 بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر  
 لیکن سننے والے کہتے کہ اس قرآن کو تو ہم ہر روز پڑھتے ہیں۔ اس کی تفسیریں بھی دیکھتے ہیں۔ ہمیں تو  
 اس میں یہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ دانائے رازان سادہ لوحوں کی یہ باتیں سنتا اور کہتا کہ قرآن اپنے آپ  
 کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا کرتا۔ اس کے سمجھنے کے انداز کچھ اور ہی ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہونزول کتاب  
 گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

اس لئے

پوں مسلماناں اگر داری جگر      و رضمیرِ خویش و در قرآن نگر

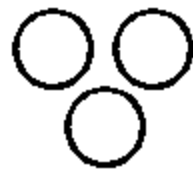
برادران! یہ ہے وہ اقبال جس نے کہا تھا کہ

چورختِ خویش پرستم ازیں خاک      ہمہ گفتند باما آشنا بود  
ولیکن کس ندانست این مسافر      چه گفت و باکہ گفت و از کجا بود

میں نے بھی اسی اقبال کی تلاش میں ساری عمر گزار دی۔ اسے مختلف وادیوں اور متنوع شاہراہوں میں ڈھونڈتا رہا۔ لیکن آخر الامر قرآن ہی سے اس کی راہ اور منزل کا سراغ پایا۔

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں

بڑی مدت کے بعد آخر یہ شاہیں زیرِ و ام آیا



# اے کشتہ سلطانی و ملانی و پیری

یومِ اقبال - اپریل ۱۹۶۶ء کی تقریر

آپ نوع انسانی کی تاریخ پر غور کیجئے۔ جس زمانہ میں جس ملک میں اور جس قوم میں آپ کو فسادِ آدمیت کی جھلک نظر آئے، تحقیق کے بعد معلوم ہوگا کہ اس فسادِ انگریزی کے عوامل و عناصر تین ہی تھے۔ یعنی ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری۔ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ یہ ابالیس دہڑ اپنا پیکر بدلتے رہیں گے۔ لیکن روح ہر زمان اور ہر مکان میں وہی کار فرما ہوگی۔ اگر آپ قرآن کریم پر بہ نگاہِ تعمق غور کریں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ حضراتِ انبیاء کرامؑ کی دعوت، انہی فسادِ انگریز عناصر کے خلاف، نعرۃ انقلاب تھی۔ وہ انہوں کو نظامِ خداوندی کے مرکز پر جمع کرتے تاکہ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے تختوں کو الٹ دیا جائے۔ انبیائے گزشتہ کے کوائف اور اہم سابقہ کی داستانیں، جو قرآن میں مذکور ہیں، وہ اسی کشمکش کی سرگذشت اور اسی انقلابی جدوجہد کی تفصیل ہیں۔ ان داستانوں میں قصۃ بنی اسرائیل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے اس کشمکش میں 'فسادِ آدمیت' کے یہ تینوں گوشے بجا سامنے آگئے تھے۔ یعنی فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجتہد۔ ہامان، مذہبی پیشوائیت کی اہلیسا، روباہ بازیوں کا سیکر اور قارون، سرمایہ داری کی خون آشامیوں کا نمائندہ۔ یہ تینوں یک جا اور ان کے پنجرہ فولادی کی گرفت میں تڑپتی، پھڑکتی قوم بنی اسرائیل جس کی

کے لئے ایک چھوڑ دو دو اولوالعزم پیغمبر صاحب ضرب کلیم حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی حضرت ہارون (مصرف جہاد۔ اور اگر تاریخ کا بیان صحیح ہے تو وادی سینا میں ایک اور پیغمبر حضرت شعیب ان کے مددگار۔

یہ کشمکش حق و باطل، یہ چراغ مصطفوی سے شادار بولہبی کی ستیزہ کاری، اسی طرح مسلسل چلی آرہی تھی کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، خدا کی آخری کتاب۔ قرآن کریم۔ اور اس کا آخری رسول۔ نبی اکرم۔ نوع انسان کو ان فساد انگیزیوں سے نجات دلانے کے لئے آئے۔ قرآن کریم نے حضور نبی اکرم کی بعثت کا مقصد یہ

## انقلاب عظیم

بتایا ہے کہ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَ الْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۱۵۷/۱۶)۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی اور ان بوجھل سلوں کو اس کے سر سے اتار دے گا جن کے نیچے وہ کھلی جا رہی تھی۔ نبی اکرم نے اپنی عظیم المثال انقلابی جدوجہد سے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کی ان زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور اس طرح خدا کی مخلوق دنیا میں سہراٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئی۔

نقشِ ثراں تاویریں عالمِ نشست  
نقشِ ہائے کاہن و پاپا شکست

لیکن یہ دور حریت و آزادی کھوڑے عرصہ تک قائم رہا اور اس کے بعد خود مسلمانوں نے ان زنجیروں کے بھرتے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی "مترگان عقیدت" سے ایک ایک کر کے چنا اور اس طرح اپنے گلے میں ڈال لیا کہ پھر کوئی قوت انہیں توڑ نہ سکے۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ ایسا کس طرح ہوا۔ اس کی وضاحت میں اس سے پہلے متعدد مقامات پر کر چکا ہوں۔ اس وقت میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ آسمان کی آنکھ نے

## حیرت انگیز رجعت

اس سے زیادہ حیرت انگیز تماشا کہیں نہیں دیکھا ہو گا کہ

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست  
خود سرتختِ ملوکیت نشست

حسبِ تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بحیرت رہ جاتے ہیں کہ مسلمان اس غیر شرعی زندگی کا

اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ اس کے نزدیک قفسِ حلال اور آشیانہ حرام ہے۔ اس کے اسباب و علل ظاہر ہیں۔ مفاد پرست گروہ نے اقتدار کی کرسیوں اور رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا۔ مذہبی پیشوائیت نے اس خلافِ اسلام نظام کو عین اسلام ثابت کرنے میں "شرعی سندت" مہیا کیں۔ — اربابِ حکومت ان کے وظیفے مقرر کر دیتے تھے اور یہ منبروں پر کھڑے ہو کر انہیں "ظل اللہ علی الارض" قرار دیتے اور ان کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہ وہی فرعون، ہامان اور قارون کی ملی بھگت تھی جسے قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس دوران میں خدا کے ایسے بندے بھی پیدا ہوئے ہوں گے جنہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہو۔ لیکن جیسا کہ ہر مستبد نظام کیا کرتا ہے ان کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ان کے آثار تک کو مٹا دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آج ہمارے ہاں بلوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی تاریخ تو پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا ذکر تک نہیں ملتا۔ بجز اس کے کہ اس تاریخ میں کہیں طعن و تشنیع کے ساتھ انہیں ہدفِ ملامت بنا دیا گیا ہو۔ اس سارے طوفانِ بلا میں اگر امتیہ کا کوئی سہارا ہے تو وہ یہ کہ خدا کی کتاب کے الفاظ ہمارے ہاں محفوظ چلے آتے ہیں۔

یہی تھی خدا کی وہ کتابِ محفوظ جس پر ہمارے دور کے ایک عظیم مفکر نے عمر بھر غور و فکر کیا اور اس کے بعد اس کی حقیقت کو واشکانِ الفاظ میں امت کے سامنے پیش کیا کہ اس کی یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ

چار مرگ اندر پتے ہیں دیر میر  
سود خوار و والی و ملا و پیر  
اور اس نے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری  
اے کشتہ سلطانی و ملانی و پیری

میں آج کی نشست میں مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو آپ کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا کہ قرآنِ کریم نے فسادِ آدمیت کے ان تینوں گوشوں — بلوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری — کے متعلق کیا کہا ہے اور اقبال نے اس کی اپنے حسین و بلیغ انداز میں کس طرح تشریح کی ہے۔

## ملوکیت

ہمارے ہاں 'ملوکیت' سے مراد موروثی بادشاہت لی جاتی ہے۔ یعنی باپ کے بعد بیٹے کا تخت نشین ہونا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جہاں یہ آیا ہے کہ (حضرت) معاویہؓ نے اپنے بیٹے کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تو کہا جاتا ہے کہ اس سے ملوکیت کا آغاز ہوا۔ دنیا کے عام تصور کے مطابق بھی ایک فرد کی حکومت کو پہلے ملوکیت (MONORCHY) یا شخصی اقتدار (AUTOCRACY) کہا جاتا تھا اور اب اسے آمریت (DICTATORSHIP) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عام تصور کے مطابق اگر کسی ملک پر اس ملک کے رہنے والوں کی حکومت ہے تو اسے آزادی کہا جاتا ہے اور اگر اس پر کسی دوسرے ملک کی قوم حکمران ہے تو اسے محکومی کہا جاتا ہے۔ آزادی اور محکومی کا یہ تصور تو دنیا میں اب تک موجود ہے لیکن انقلاب فرانس نے ایک جدید سیاسی نظام کو جنم دیا جسے جمہوریت یا ڈیموکریسی کہہ کر پکارا گیا۔ لفظی طور پر تو اس سے مفہوم ہے پوری کی پوری قوم کی حکومت، لیکن عملاً اس سے مراد ہے نمائندگان قوم میں سے اس پارٹی کی حکومت جسے اکثریت حاصل ہو۔ یعنی اس میں اقتدار مملکت ایک فرد کے بجائے ایک گروہ کو حاصل ہوتا ہے۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ دو سو سال کے تجربہ نے اس جمہوریت کے متعلق خود یورپ کے ارباب فکر و نظر اور اصحاب سیاست و عمرانیات کو کس نتیجے پر پہنچایا ہے اور وہ کس طرح اس کے ہاتھوں تنگ آچکے ہیں۔ میں اس وقت اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ مغربی جمہوریت کی مشینری ایسی ہے جس کی رو سے وہی لوگ قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے منتخب ہو سکتے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی طرح دولت سمیٹ کر معاشرہ میں اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ لہذا اس طرح حکومت سے جس گروہ کے ہاتھ میں زمام اقتدار آتی ہے وہ صلاحیت و قابلیت یا سیرت و کردار کی رو سے قوم کا منتخب طبقہ نہیں ہوتا مفاد پرستوں ہی کا ایک گروہ ہوتا ہے۔ لہذا 'ملوکیت و آمریت اور جمہوریت میں فرق اتنا ہی ہوتا ہے کہ ملوکیت میں بزنس (کاروبار) ایک فرد کی ملکیت ہوتا ہے جمہوریت میں یہ ایک لمٹید کمپنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مقصد دونوں کا سلب دہیب (EXPLOITATION) ہوتا ہے۔



قرآن کریم نے انسانی آزادی اور محکومی کا بنیادی تصور ہی بدل دیا۔ اس نے کہا کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسی کو حاصل ہی نہیں۔ نہ ایک فرد کو اور نہ افراد کی کسی جماعت کو۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنَّبُوءَةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ (۳/۷۸) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطہ قوانین اور اقتدار امور، حتیٰ کہ نبوت تک بھی کیوں نہ مل چکی ہو کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم و فرماں بردار بن جاؤ۔ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ (۱۲/۴۰) اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ کاروبارِ مملکت، خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق سرانجام پائے۔ وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق نظامِ مملکت قائم نہیں کرتے تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۵/۴۵) یہ لوگ ظالم ہیں۔ انسانوں کو حاکم اور محکوم کے طبقات میں تقسیم کر دینے سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟ لہذا قرآن کی رو سے مملکت، قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کی بجٹنسی ہے اور یہ مشورہ امت کے باہمی مشورہ سے سرانجام پاتا ہے کہ وَ أَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ (۲۲/۳۸) خدا کا ارشاد ہے۔ اس تصور کی رو سے، ایک ملک پر اگر خود اس ملک کے رہنے والے حکمران ہوں اور حکومت کا انداز مغربی جمہوریت بھی ہو، لیکن کاروبارِ مملکت، خدا کی کتاب کے مطابق سرانجام نہ پارہا ہو، تو وہ آزادی نہیں غلامی ہے۔ اسے ملوکیت کہا جائے گا۔ لیکن اگر نظامِ مملکت، قوانین خداوندی کے مطابق تشکیل ہو اور امورِ مملکت امت کے باہمی مشورے سے طے پائیں تو یہ آزادی ہے خواہ طرزِ حکومت کسی قسم کا ہو۔ اسے ہماری اصطلاح میں "خلافت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں تصورات حکومت (ملوکیت اور خلافت) ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک اسلامی ہے اور دوسرا غیر اسلامی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ صدارتی نظام جمہوریت غیر اسلامی ہے اور پارلیمانی سسٹم مطابق اسلام، تو یہ محض سیاسی نعرہ بازی ہے۔ اسلامی نظام جمہوریت اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قوم کے مشورہ سے کاروبارِ مملکت سرانجام پائے۔

صدیوں کی ملوکیت کے خواب اور اثرات سے مسلمان، خلافت کے تصور کو فراموش کر چکا

تھا۔ دوسری طرف یورپ کے نظام جمہوریت کے حق میں اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ ساری دنیا اس سے مسحور ہو گئی اور یہ سمجھنے لگی کہ جنت سے نکلے ہوئے آدم نے پھر سے فردوس گم گشتہ کو پایا ہے۔ وہ اس نظام کو آیہ رحمت اور نوع انسانی کے لئے حساب کرم خیال کرتی تھی۔ ان کی دیکھا دیکھی، خود مسلمان بھی اسے انعامِ خداوندی سمجھنے لگا اور یہ آوازیں چاروں طرف سے اکٹھی شروع ہو گئیں کہ نظام جمہوریت عین مطابق اسلام ہے۔ اس ہنگامہ ہاتے وہ اور تلامی شور و شغب میں جبکہ ساری فضا اسی قسم کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ اقبال کی فراستِ قرآنی نے اس فتنہ کو بھانپا اور اپنی بھرپور آواز سے مسلمانوں کو لگا کر کہا کہ اس فریب میں مت آؤ۔

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کورب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اس نے کہا کہ یاد رکھو! نظام حکومت جمہوری ہو یا شخصی، اگر اس کی اساس خدا کی کتاب پر نہیں تو وہ ملکیت ہے۔ اس کے برعکس جس نظام کی بنیاد ضابطہ قوانین خداوندی پر ہے وہ عین اسلام ہے۔ اسے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور

خلافت بر مقام باگواہی است حرام است آنچه بر پادشاہی است

ملوکیت ہمہ مکر است و نیزنگ خلافت حفظ ناموس الہی است

اس لئے ہر وہ نظام جس میں غیر شرعی قوانین رائج ہوں، ملکیت ہے اور ظلم و استبداد کا مظہر!

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدامو دیں سیاست تو وہ جاتی ہے جنگیزی

اقبال کی آخری کتاب "ارمغانِ حجاز" میں جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی، ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ میرے نزدیک وہ عصر حاضر کی تہذیب و تمدن اور سیاست و حکمت پر شدید ترین تنقید ہے اور فکرِ اقبال کا پختہ۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کے ایک زندہ و متحرک نظام حیات بننے کے خلاف جو قوتیں نہایت غیر محسوس طور پر مصروفِ تک و تاز ہیں، اس میں ان کی نشاندہی اور نقاب کشائی بڑے شوخ اور حسین انداز سے کی گئی ہے۔ نظم کا پلاٹ یہ ہے کہ ابلیس کی کابینہ (CABINET) کا اجلاس ہو رہا ہے جس کی صدارت خود ابلیس کر رہا ہے۔

اس کا بیٹہ میں ان تمام عوامل کو ایک ایک کر کے سامنے لایا جا رہا ہے جو ابلتسی نظام کے ضعف کا باعث بن سکتے ہیں۔ یہ عوامل زیر بحث آتے ہیں اور متعلقہ مشیر (وزیر) یہ بتاتا ہے کہ اس نے اس کی مدافعت کے لئے کیا حربہ تجویز کیا ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمہوری نظام کی نمود اس حقیقت کی غماز ہے کہ انسان اس نظام ملکیت سے تنگ آچکا ہے جسے ابلتسی نے مدت ہوئی وضع کیا تھا۔ اگر انسان نے اس نظام کو اختیار کر لیا تو پھر ابلتسی نظام کو زوال آجائے گا۔ چنانچہ اس مشیر نے وزیر سیاست سے دریافت کیا کہ

خیر ہے سلطانی جمہور کا غوغا کہ شر

نو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

وزیر امورِ سیاسیہ مسکرایا کہ کہا کہ "ہوں" یعنی میں ان سب تازہ فتنوں سے باخبر ہوں ہے  
ہوں مگر میری جہاں یعنی بتاتی ہے مجھے جو ملکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر  
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوی لباس  
بات یہ ہے کہ

کاروبارِ شہر باری کی حقیقت اور ہے  
مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو  
یہ وجودِ میر و سلطان پر نہیں ہے منحصر  
ہے وہ سلطانِ غیر کی کھلتی پہ مچس کی نظر

تُو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوی نظام

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

زمانہ قدیم کی ملکیت اور عصرِ حاضر کی جمہوریت اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دورِ جہالت کی شخصی ملکیت جو کچھ کرتی تھی، کھلے بندوں کرتی تھی۔ لیکن عصرِ حاضر کی "جمہوی ملکیت" وہی کچھ تہذیب کی اوٹ میں اور مفادِ عامہ کے تحفظ کے نقاب میں کرتی ہے۔ اس زمانے کی سلبِ نہیب (EXPLOITATION) کو باو شاہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس زمانے کی "ملکیت" اس سلب و نہیب کو (PUBLIC INTEREST) کہہ کر عوام کو دھوکا دیتی ہے۔ یہ ہے وہ جمہوریت جس کا چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر ہے۔

یہ تھا وہ جواب جو ابلتسی کی مجلس شوریٰ میں وزیر امورِ سیاسیہ کی طرف سے دیا گیا۔ ابلتسی

کا یہ حربہ کس قدر کارگر ہے، اس کی تشریح اقبال نے، بال جبریل کی ایک نظم میں کی ہے جس کا عنوان ہے "ابلیس کی عرض و داشت"۔ ابلیس خدا کے حضور ایک درخواست لے کر پہنچتا ہے جس میں تفصیل سے بتاتا ہے کہ اس دور میں، کارپردازان نظام مملکت، ان فرائض کو جو ابلیس کے سپرد کئے گئے تھے، کس حُسن و خوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اس لئے اب اس کی اس کڑواہٹ پر ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسے کہیں اور "ٹرانسفر" کر دیا جائے۔ وہ بحضور رب العزت عرض کرتا ہے کہ

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست

باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک

میرے یہاں سے چلے جانے سے اہرنی سیاست کے کاروبار میں کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہوگا بلکہ وہ اور زیادہ چمک اٹھے گا۔ اس لئے کہ

تری حریف یارت سیاست افراگ

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے ٹوٹنے

پھر میری تو یہ کیفیت ہے کہ ہر شخص میرا نام سننے پر (زبان ہی سے ہی) لاجول پڑھتا ہے لیکن

شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو

کہ خود نچر کے دل میں ہو پیدا ذوق نچری!

یوں اقبال نے دورِ حاضر کی اس ملوکیت (یعنی مغربی نظامِ جمہوریت) کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔

## مذہبی پیشوائیت

اب برادرانِ عزیز! آگے بڑھتے!

آپ انسانی نفسیات پر غور کیجئے۔ دنیا میں کوئی انسان بھی کسی دوسرے انسان کا محکوم اور غلام بننا نہیں چاہتا۔ اس کی طبیعت ان زنجیروں کے خلاف ابا کرتی ہے۔ پھر یہ کیا ہے کہ انسانوں کا گروہِ عظیم، ایک انسان یا انسانوں کے گروہ کی محکومی اور غلامی پر اس طرح رضا مند ہو جاتا ہے کہ

اس کے خلاف بغاوت کرنا تو ایک طرف اس کے دل میں اس کے خلاف نفرت کا جذبہ تک پیدا نہیں ہوتا! یہ کام مذہبی پیشوائیت کرتی ہے۔ اس کی سحر آفرینی کا اثر ہے کہ  
صید خود صیت اور اگوید بگیب!

برہمن عوام کو یہ کہہ کر ایون پلاتا ہے کہ راجہ ایشور کا اوتار ہے۔ کلیسا کا اُسقف، سادہ لوح انسانوں سے کہتا ہے کہ بادشاہ کو حقوق خداوندی (DIVINE RIGHTS) حاصل ہوتے ہیں، محراب و منبر سے یہ سحر آفریں الفاظ دہراتے جاتے ہیں کہ۔ السُّلْطَانُ ظِلُّ اللَّهِ عَلَى الْأَرْضِ بِأَوْثَانِ زَمِينٍ پر خدا کا سایہ ہے۔ اس لئے بادشاہ کے حکم کی تعمیل درحقیقت اطاعتِ خداوندی ہے جو اس سے مستزانی کرتا ہے وہ خدا کی معصیت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس قسم کے وعظ کہتا رہتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت شے ہے اس سے دُور بھاگو۔ اس دنیا کی قوت و دولت، ثروت و شہمت، زیب و زینت، فاسق و فاجر لوگوں کے لئے ہے۔ خدا کے بندوں کی دنیا آخرت ہے۔ انہیں اسی پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ اور آخرت کے حصول کے لئے وہ چند بے روح عقاید اور بے جان رسومات کو عین دین قرار دے کر، لوگوں کو ان میں زیادہ سے زیادہ منہمک رکھتا ہے تاکہ ان کی نگاہ دوسری طرف اٹھنے ہی نہ پائے۔

مذہبی پیشوائیت، عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتی ہے تاکہ ملکیت کو اپنی سلب و نہب میں کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ اس طرح ملکیت اور مذہبی پیشوائیت کا سا جھا ہوجاتا ہے۔ راجہ برہمن کی رکشا (حفاظت) کرتا ہے اور برہمن راجہ کو اشیر باو و دعا دیتا ہے۔ کنگ کلیسائی نظام کے لئے جاگیریں مقرر کرتا ہے۔ کلیسا، بادشاہ کے حقوق خداوندی کا محافظ بنتا ہے۔ سلطان مذہبی پیشواؤں کے وظائف مقرر کرتا ہے اور مذہبی پیشوا بر سر منبر اس کے لئے تائید و نصرت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ یہ سب ملکیت اور برہمنیت کی وہ ملی بھگت جس سے استبداد کے فولادی پنجرے کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں ہونے پاتی۔ یاد رکھئے! ہاتھ کی مدد کے بغیر کسی فرعون کی فرعونیت ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ اسلام نے ملکیت کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ لیکن جب مسلمانوں میں دوبارہ ملکیت کی نمود ہوئی تو فطری طور پر اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت بھی جلوہ دہ محراب و منبر ہو گئی۔ اقبال نے قوم کو اس ہیبت خطرہ سے بھی آگاہ کیا اور عمر بھر سلطانی کے ساتھ ملانی و پیری کے خلاف بھی مصروف

جہاد رہا۔

قرآن کریم نے مذہبی پیشوائیت کے فتنہ کے سلسلہ میں کہا تھا کہ۔ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَوْجِبَارِ  
وَ الشُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط  
(۹/۳۴) یاد رکھو! یہ علماء اور مشائخ عوام کی کمائی مفت میں کھا جاتے ہیں۔ یہ لوگوں سے کہتے یہ ہیں کہ ہم  
تمہیں خدا کا راستہ دکھاتے ہیں حالانکہ خدا کے راستے میں سب سے بڑی روک خود یہی لوگ ہیں۔ ان کی  
ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس راستہ پر چلنے ہی نہ پائیں جو خدا نے ان کے لئے تجویز کیا ہے  
ابھی کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ ۷

یہی شیخ حرم ہے جو چڑا کر بیچ کھاتا ہے  
گلیم بوڈر و دلی اویس و چادری زہریؒ

خدا اپنے رسولوں کی وساطت سے جو دین بھیجتا تھا وہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہوتا تھا جس  
کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دنیا سے ظلم و استبداد اور سلب و نہب پر مبنی ہر نظام کو مٹا کر اس کی جگہ  
نظام خداوندی متشکل کر دیا جائے۔ دین کے بنیادی تصورات اور ارکان و مناسک سب اسی انقلابی  
پروگرام کے اجزا ہوتے تھے۔ مذہبی پیشوائیت کی ٹیکنیک یہ ہوتی تھی کہ دین کے ان تصورات کے  
الفاظ اسی طرح باقی رکھے جائیں لیکن ان کا مفہوم بدل دیا جائے۔ اس کے ارکان و مناسک کی ظاہری  
شکل و صورت وہی رہے لیکن وہ چند بے مقصد رسومات کا مجموعہ بن کر رہ جائیں۔ یوں "مذہبی  
پیشوائیت کا وضع کردہ مذہب آدین خداوندی کی مٹی شدہ لاش بن کر رہ جاتا تھا جس کے خط و خال تو  
وہی رہیں لیکن جس کی حقیقت ایک جسد بے روح سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی  
طرف اشارہ کیا ہے جب کہا کہ

ملا کی اذال اور مجاہد کی اذال اور  
گرگس کا جہاں اور شاہین کا جہاں اور

الفاظ دعائی میں تفاوت نہیں لیکن  
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ ۷

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات  
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے  
یا وسعتِ افلاک میں تبکیر مسلسل

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

قرآنِ کریم نے فرعون کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ عاید کیا تھا کہ جَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضَعِفُ طَائِفَاتًا مِّنْهُمْ (۲۸/۳) وہ قوم میں افتراق پیدا کرتا رہتا۔ انہیں پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا۔ کبھی ایک پارٹی کو اور پرچہ صا دیتا اور دوسری کو نیچے گرا دیتا اور اس طرح انہیں کمزور کرتا رہتا کہ وہ اس کے خلاف اٹھنے نہ پائیں۔ قرآنِ کریم نے امت میں تفرقہ کو خدا کا عذاب قرار دیا اور واضح الفاظ میں کہا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۲۱-۲۲) مسلمانو! دیکھنا تم ایک خدا پر ایمان لا کر کہیں پھر سے مشرک نہ بن جانا۔ یعنی تم فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسروں کو باطل پر۔ اس طرح امت میں مسلسل پھوٹ پڑی رہتی ہے۔ ملوکیت کا اس میں فائدہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کام مذہبی پیشوائیت سے کراتی ہے۔ مذہبی پیشوائیت امت کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیتی ہے۔ یہ فرقے ایک دوسرے کی تکفیر کرتے رہتے اور اس طرح انہیں باہم لڑاتے رہتے ہیں اور ملوکیت اطمینان سے اپنی مفاد پرستیوں میں مصروف رہتی ہے۔ اقبال نے جاوید نامہ میں سعید علیم پاشا کی زبان سے اسی حقیقت کو واضح کاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

ز انکہ ملا مو من کافر گراست	دین حق از کافر می رسوا تراست
ملت از قال و قولش فرد فرد	کم نگاه و کور ذوق و ہرزہ گرو
کور بادرزاد و نور آفتاب	مکتب و ملا و اسرار کتاب
دین ملانی سبیل اللہ فساد	دین کافر و تدبیر جہاد

بال جبریل میں انہوں نے اسی حقیقت کو ذرا شوخ انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ قیامت میں

حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکم بہشت	میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن کرنے سکا
خوش نہ آئی گے اسے خورد شراب لب کشت	عرض کی میں نے الہی امیری تفصیر معاف
بحث و تکرار اس اللہ کے بند کی سرشت	نہیں فردوس مقام بدل و قال و اقوال

سے بد آموزی اقوام و ملل کام اس کا اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت کردہ دین کے پروگرام کا حاصل یہ تھا کہ جماعتِ مومنین، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق، نوع انسان کی منفعت کے لئے عام کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصدِ جلیل کے حصول کے لئے علومِ سائنس پر پوری پوری دسترس کے علاوہ عالمگیر انسانیت کے مقتضیات اور عصرِ حاضر کے تقاضوں پر بھی گہری نگاہ ہونی چاہیے لیکن جو کچھ ہماری مذہبی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے اس سے تو اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ سوئی کیسے بنائی جاتی ہے اور یونائیٹڈ نیشنز کس بلا کا نام ہے۔ ان درس گاہوں کے فارغ التحصیل ”علماء کرام“ کو زندگی کے عملی مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے اقبال نے کہا ہے کہ

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟  
اس کو کیا سمجھیں یہ بچائے دورِ کعبت کی امام؟

اتنا ہی نہیں۔ ان کے نصاب میں اٹھارہ اٹھارہ علوم تو ہوتے ہیں لیکن قرآنِ کریم کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوتی جو علوم وہاں پڑھائے جاتے ہیں ان سے ان کے ذہنوں میں فرسودہ یونانی علم الکلام اور پامال شدہ عجمی تصورات اس طرح کھٹونس دیئے جاتے ہیں کہ ان میں دین کے مبادیات تک کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ اس کا رونا روتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے  
وہ رمز شوق جو پوشیدہ لالہ میں ہے طریقِ شیخِ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے

یہ تو اربابِ شریعت کا حال ہے۔ اصحابِ طریقت ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔  
طریقت

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن  
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے؟ خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن  
دین کا انقلابی پروگرام یکسر مجاہدانہ زندگی کا متقاضی تھا جس کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت تھی جس کے رگ و پے میں بجلیاں بھری ہوتی ہوں۔ تصوفِ زندگی سے فرار سکھاتا ہے اس لئے خدا کے دین سے اس کا تعلق کیا ہو سکتا ہے؟۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔ ”تصوفِ اسلام کی سر زمین میں



اجنبی پودا ہے۔ دین، قوموں کے عروقِ مروہ میں خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے۔ تصوفِ رگِ حیات میں رواں دواں خون کو منجمد کر کے رکھ دیتا ہے۔ دین، وہ شعلہ جو الابے جو باطل کے بر نظام کو خس و خاشاک کی طرح راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ تصوفِ زندگی کی رہی سہی حرارت کو بھی افسردہ کر کے قیوں کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ یہی وہ تاسف انگیز منظر تھا جسے دیکھ کر اقبال نے ایک سرو آہ بھر کر کہا تھا کہ ۷

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال  
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو  
ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار  
ہو جس کے رگِ پلے میں فقط مستی کردار

اس نے اربابِ خانقاہیت کو پکار کر کہا کہ ۷  
یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی  
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مرلبنے یہ سرور  
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں  
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبال سے بھی پہلے ایک اور شہ آئی نگاہ رکھنے والے مردِ مومن۔ سر سید علیہ الرحمۃ۔ نے ان اجارہ دارانِ روحانیت کے متعلق کہا تھا کہ۔ ”مسکینی اور انکساری ان کو آسمان پر چڑھاتی ہے اس لئے یہ اور زیادہ مسکین و منکسر بنتے ہیں۔ سادہ لوحی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں اس لئے اور سادہ بنتے جاتے ہیں، دنیا سے نفرت ان کو دنیا دلائی ہے اس لئے یہ دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں۔ بے طمعی، محنت کے بغیر ورہم و دینار دلائی ہے اس لئے یہ اور زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں۔ لوگ ان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے ہیں اس لئے ان کے دل میں دوسروں کی ہر بات کی حقارت جمتی جاتی ہے۔

ان ’بظاہر حجرہ نشینوں‘ کی یہ کیفیت ہے کہ لوگوں کو یہ دنیاوی آسائشوں اور زیبائشوں سے نفرت دلاتے رہتے ہیں۔ لیکن خود ان کے محلات ہر قسم کی عیش سامانیوں کے مراکز ہوتے ہیں۔ اقبال نے (بالِ جبریل میں) ایک ”باغی مرید“ کی زبان سے اسی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے جب کہا ہے کہ ۷

ہم کو تو میت نہیں مٹی کا دیا بھی  
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے ساؤ  
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن  
مانندِ بیتاں پختے ہیں کجے کے بہمن!

نذرانہ نہیں! سود ہے پیرانِ حرم کا  
 ہر خرقة سا کوس کے اندر ہے مہاجن  
 میراث میں آئی ہے انہیں سندِ ارشاد  
 زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشین!  
 یہ تھا ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا وہ دجل و فریب جس کے احساس سے اقبال نے خون کے آنسو  
 روتے ہوئے بحضور رب العزت فریاد کی تھی کہ ہ  
 خداوند! تیرے سادہ دل بندے کہ بھر جائیں  
 کہ سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری

## نظامِ سرمایہ داری

اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت کی گرہیں کسے کے لئے پیشوائیت کی سحر آفرینی بڑی موثر  
 ہوتی ہے لیکن اس میں یہ خطرہ ضرور ہوتا ہے کہ اگر لوگوں نے ذرا بھی علم و عقل سے کام لینا شروع  
 کر دیا تو اس طلسمِ سامری کی نگاہ فریبی کا جال و ہواں بن کر اڑ جائے گا۔ اس کے لئے ایک اور حربہ  
 استعمال کیا جاتا ہے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ سرکس کاشیر، اتنی مہیب قوتوں کے باوجود، رنگ بستر  
 کے سامنے بکری کیوں بنا رہتا ہے؟ اس لئے کہ اسے متواتر بھوکا رکھا جاتا ہے بھوکا وہ موثر ترین  
 حربہ ہے جس سے بڑے بڑے قوی ہیکل سرکشوں کو گردن جھکانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ انسانی دنیا  
 میں اس حربہ کا نام نظامِ سرمایہ داری ہے جو حکمتِ ابلیسی کا نادر شاہکار ہے۔ اس میں عیار طبقہ  
 رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اس طرح جب لوگ روٹی کے لئے اس کے محتاج  
 ہو جاتے ہیں تو ان سے جو کام چاہتا ہے لیتا ہے۔ وین خداوندی، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف  
 کھلا ہوا چیلنج تھا۔ وہ لے جڑ بنیاد سے اکھیڑنے کے لئے آیا تھا۔ نظامِ سرمایہ داری کی عمارت فاضلہ  
 دولت (یعنی ضرورت سے زیادہ سرمایہ جمع رکھنے) کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ شران نے اس  
 بنیاد ہی کو منہدم کر دیا اور ضرورت سے زیادہ دولت جمع کرنے والوں کو عذابِ جہنم کا مستحق قرار دیا۔  
 اس نے واضح الفاظ میں کہا کہ۔ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَ لَا يَنْفِقُونَهَا

فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۹/۳۴) جو لوگ دولت کے انبار جمع کرتے رہتے ہیں اور اُسے دوسروں کی ضروریات کے لئے عام نہیں کرتے۔ اے رسول! تو ان سے کہہ دے کہ ان کی اس روش کا انجام الم انگیز تباہی ہوگا۔ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فِتْكُوى بِهٖا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۗ جَسَ دن اس دولت کے سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پشت کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ۔ هٰذَا مَا كُنْتُمْ لَآنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (۹/۳۵) یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات پر صرف کرنے کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ لہذا اب اس دولت کا مزہ چکھو۔

نظام سرمایہ داری کی بنیاد تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) پر مبنی ہے۔ لیکن یہ فاضلہ دولت زمانہ قدیم میں زمینداری سسٹم سے حاصل ہوتی تھی اور عصر حاضر میں نظام کارخانہ داری (انڈسٹری) کی رُود سے اکٹھی کی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے نظام زمینداری کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ زمین تمام نوع انسان کے لئے رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وَالْأَرْضُ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (۵۵/۱۰) "زمین کو ہم کے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے" اس لئے اسے سَوَاءٌ لِلنَّاسِ عَلَيْنَ (۶۱/۱۰) ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔ اس سے جس قدر رزق پیدا ہوتا ہے اس میں کاشت کار کی محنت شامل ہوتی ہے اور باقی سب کچھ فطرت کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ زمیندار فطرت کی ان بخششوں کو بھی اپنی ذاتی ملکیت بنا لیتا ہے اور کاشتکار کی محنت کا بیشتر حصہ بھی ہتھیا لیتا ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو بڑے دلنشین انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ أَفَرَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ کیا تم نے اس پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ تم جو کھیتی کرتے ہو تو اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور ہمارا کس قدر۔ تم زمین میں مل چلا کر تخم ریزی کر دیتے ہو۔ اس کے بعد اَنَّمْ تَزْرَعُونَ ۗ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ کیا اس دانے کو تم اگاتے ہو یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے ؟ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا ۗ فَظَلَّمْتُمْ نَفْسَكُمْ ۗ وَإِنَّا لَمُعْرِضُونَ ۗ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ اگر ایسا ہمارا قانون مشیت یوں ساتھ نہ دیتا تو کھیتی کا اگنا تو ایک طرف تمہارا بیج بھی ضائع ہو

جانا اور تم سر پکڑ کر بیٹھ جاتے کہ ہم پر مہفت میں چٹی پڑ گئی۔ اَفْرَعَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۗ پھر تم نے کبھی اس پانی پر بھی غور کیا ہے جس پر زندگی کا اور کھیتی کا وار و مدار ہے۔ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمْوَا مِنَ الْمُنْزِلِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ کیا اسے تم بادلوں سے برساتے ہو یا ہم ایسا کرتے ہیں؟ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۗ اگر ہمارا قانون مشیت ساتھ نہ دیتا اور جس طرح کا تلخ اور نمکین پانی سمندر میں تھا ویسا ہی یہ بادلوں سے برساتا تو کھیتی کا اگنا تو ایک طرف تم خود بھی زندہ نہ رہ سکتے۔ اَفْرَعَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُوْرِدُونَ ۗ پھر کیا تم اس آگ پر غور نہیں کرتے جسے تم جلاتے ہو اور جس کی حرارت میں زندگی کا راز سہرتا ہے۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَأْتُمْ شَجَرَ قَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُونَ ۗ کیا درختوں کی بنی شاخوں میں اس شعلہ سامانی کو ہم نے محفوظ رکھ چھوڑا ہے یا تم نے ایسا کیا ہے۔ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا قَدْ كِرَةً ۗ ہم نے اس داستان کو اس لئے دہرا پایا ہے کہ تمہیں ایک فراموش کردہ حقیقت کی یاد دہانی کرا دی جائے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ زراعت کا یہ سارا کاروبار تمہارا اور ہمارا مشترک ہے۔ اس لئے اس کے حاصل میں سے تم اپنا حصہ لے لو اور ہمیں ہمارا حصہ دے دو۔ تم پوچھو گے کہ تمہارا حصہ ہم کسے دیں، سو سن لو کہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ ﴿۴۳﴾ - ۱۵۶/۴۳ سے بھوکوں کو دے دو یہ ہم تک پہنچ جائے گا۔ اقبال نے انہی آیات کے مفہوم کو اپنے حسین انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون	کون دریاؤں کی موجوں کا اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پھپھم سے باد سازگار	خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نور آفتاب
کس نے بھری موتیوں کو خوشہ گندم کی کھیب	موسموں کو کس نے کھلائی یہ خوتے انقلاب

وہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں

تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

پھر اُس نے صنعتی نظام (انڈسٹری) کی چکی میں پسے ہوئے خاک نشیں مزدور کو اکٹھا کر گلے سے

لگایا اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ

شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری ذات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار جیلہ گر

اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

دستِ دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبال نے "بندۂ مزدور" کو یہ پیغام ۱۹۲۲-۲۳ء میں دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے بال جبریل اور ضرب کلیم میں اسی پیغام کو اور بھی زیادہ واضح و آشکارا الفاظ میں دہرایا۔ بال جبریل میں ایک نظم کا عنوان ہے۔

فرشتوں کا گیت۔ اس میں ملائکہ خدا سے شکوہ سنج ہیں کہ ۷

عقل ہے لے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی

خلق خدا کی گھات میں زند و فقیر و میر و پیر

تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست

بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلبند بام ابھی

اس پر خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ

اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

جس کھیت کے وہتقاں کو پتھر نہیں ریزی

کیوں خالق و مخلوق میں حائل ہیں پرے

حق را بسجودے صنماں را بطوائفے

کاخِ امرار کے درد یوار ہلا دو

اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بچھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں کے

میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

"فرشتے" وہ کائناتی قوتیں ہیں جو مشیتِ خداوندی کے پردہ گرام کو برتتے کارلانے کے لئے زمانے کے تقاضوں کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ یہی وہ "زمانے کے تقاضے" تھے جنہیں دیکھ کر اقبال کی

نگہ دور رس نے بہت عرصہ پہلے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ اب ۷

زمانے کے انداز بدلے گئے

پیرانی سیاست گری خوار ہے

گیا دور سرمایہ داری گیا

نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

زہیں میر و سلطان سے بیزار ہے

تماشا دکھا کر سداری گیا

حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ ۵

گراں خوابِ چینی سنھلنے لگے ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے جب ہنوز (شاید) خود چینوں کو بھی اپنے سنھلنے کا حتمی طور پر اندازہ نہیں ہوا ہوگا۔ قرآن پر غور و فکر انسان میں ایسی بصیرت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حوادثِ زمانہ سے اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اب ہوا کا رخ کدھر کو ہے۔

قرآن نے نظامِ سرِ پاپہ داری کے ختم کرنے کے سلسلہ میں کہا تھا کہ **يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ**۔ اے رسول! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں۔ **قُلِ الْعَفْوَ** (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے سب کا سب جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو اقبال نے کہا کہ

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم  
لے سو نہیں روس کی یہ گرمی گفتار  
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر  
کھلتے نظر آتے ہیں بت درج وہ اسرار  
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان  
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

”شاید“ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ روس نے جس اشتراکی نظام کی ایسی عظیم عمارت استوار کرنے کا دعویٰ کیا ہے اس کے ہاں ایسی بنیاد کوئی نہیں جو اس عمارت کا بوجھ اٹھا سکے۔ اس نے اہل روس سے اسی زلزلے میں کہا تھا کہ ۵

اے کہ می خواہی نظامِ عالی جنتہ اور اساس محکمے؟

یہ بنیاد قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ ۵

داستانِ کہنہ ششٹی باب باب فکرار روشن کن از اتم الکتاب

اور آپ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ گرامی قدر کہ اس اساسِ محکم کے نہ ہونے کی وجہ سے روش میں اشتراکیت کس بُری طرح سے ناکام ہو رہی ہے۔ یہ معاشی نظام قرآن ہی کی بنیادوں پر کامیابی سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبال نے ”ابلیس کی مجلس شوریٰ“ کی نظم کے آخری بند میں

نہایت اُجلے، نکھرے اور حسین و شاداب انداز میں بیان کیا ہے۔ اسے غور سے سنتے۔ ابلتیس کی کابینہ کے مشیر مال نے کہا کہ دنیا میں اشتراکیت کا چرچا عام ہو رہا ہے اس لئے مجھے خطر ہے کہ ہمارا وضع کردہ نظام سرمایہ داری کہیں پامال نہ ہو جائے۔ اس لئے ہمیں اس کی بابت کچھ فکر کرنی چاہیے۔ ابلتیس نے یہ سن کر کہا کہ تم نے صحیح نہیں سمجھا۔ مجھے اشتراکیت سے کچھ خطرہ نہیں۔ یہ ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔ ہمارے لئے خطرہ کا گوشہ ایک اور ہے جس کی طرف تم میں سے کسی کی بھی نگاہ نہیں گئی۔

جانتا ہے جس پہ روشن باطن آیام ہے مزدکیت قننہ فردا نہیں، اسلام ہے  
اس پر اس کے مشیروں کی آنکھوں میں خفیف سی ہنسی پیر گئی جو اس تنقید کی غماز تھی کہ موجودہ مسلمان قوم سے بھلا ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ اس پر ابلتیس نے کہا کہ ۷

جانتا ہوں میں یہ امتِ جاہلِ قرآن نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں  
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری راہیں بے پید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں  
عضر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف  
ہونہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

کون سی شرع پیغمبر؟

الحذر! آئین پیغمبر سے سو بار الحذر حافظ ناموس زن مرد آزما مرد آفریں  
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے نے کوئی نفع و خافاں نے فقیرہ نشیں  
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صفا منعموں کو مال دولت کا بنانا ہے ایس

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

یہ ہے ہمارے لئے حقیقی خطرہ کا موجب۔ اس لئے ۷

چشمِ عالم سے ہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب

یہ غنیمت ہے کہ خود مومن سے محروم یقیں

اب ابلتیس کے مشیروں کی سمجھ میں آیا کہ ان کے لئے حقیقی خطرہ کیا ہے۔ اس پر انہوں نے ابلتیس

سے پوچھا کہ اس خطرہ کی روک تھام کے لئے ہمیں کیا پروگرام اختیار کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا کہ ناکیا چاہیئے؟۔ وہی جو ہم کرتے چلے آتے ہیں۔ تم جاؤ اور اپنے نظام کی آلہ کار مذہبی پیشوائیت کو کھٹکھٹاؤ اور اس سے کہو کہ وہ مسلمانوں کو اس قسم کے اختلافی اور نظری مسائل میں الجھاتے رکھیں کہ

ابن مریم مرگیا یا زندہ جاوید ہے؟  
انے دل کے سے مسیح ناصری مقصود ہے  
ہیں صفاتِ ذاتِ حقِ حقِ جدا یا عینِ ذاتِ  
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات!  
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات!

وہ اسوچو کہ ہے

کیا مسلمان کیلئے کافی نہیں اس دور میں یہ الہیات کے ترشے ہوئے لاتِ فہمات!  
اسے ان نظری مسائل کے الجھاؤ میں ڈالے رکھو اور اس طرح ہے

تم اسے بے گانہ رکھو عالمِ کردار سے  
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں تباہ!  
نیر اسی میں ہے قلمت تک رہو من غلام  
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات  
ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر  
جو چھپا دے اسکی آنکھوں کے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں  
ہے حقیقت جس کے دین کی احتسابِ کائنات!

لہذا تم پوری پوری کوشش سے ہے

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحی گاہی میں اسے  
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس سے زیادہ اور کچھ کرنے کا کام نہیں۔ یہ ہو گیا تو تم چین کی نیند سوؤ۔ اس سے یہ قوم، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑی رہے گی اور ہمارا پورا لاؤشکر فسادِ آدمیت کے پروگرام کی تکمیل میں آزادانہ مصروف رہے گا۔

اقبال نے ابلیس کی اسی سازش کو ناکام بنانے کے لئے پاکستان کا تصور  
پاکستان دیا تھا۔ پاکستان سے اس کی مراد تھی ایک ایسا خطہ زمین جس میں تو زینِ خداوندی



کی حکمرانی ہوتا کہ اسلام پر جو ملکیت کا ٹھپہ لگ چکا ہے وہ دور ہو جائے۔ مذہبی پیشوائیت کا اقتدار ختم ہو اور سرمایہ داری کی جگہ صحیح قرآنی نظام معیشت رائج کیا جاسکے۔ اس سے "اشتراکیت" کو وہ اساس محکم میسر آجائے گی جس کے بغیر وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۱۹۴۷ء میں وہ خطہ زمین ہمیں مل گیا لیکن اُس وقت وہ حکیم الامت یہاں سے جا چکا تھا۔ اگر وہ اس وقت موجود ہوتا تو ہمیں "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کی اُس نشست کی روپرادبھی اپنے الفاظ میں سنانا جو حصولِ پاکستان کے وقت ہنگامی طور پر منعقد ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل کچھ اس قسم کی ہوتی کہ جب تقسیمِ ہند کا اعلان ہوا تو ابلیس کے مشیر چنچتے چلاتے اس کے پاس آئے اور کہا کہ جہاں پناہ! غضب ہو گیا۔ تحریکِ پاکستان کامیاب ہو گئی، مسلمانوں کو ایک آزاد مملکت قائم کرنے کے لئے جداگانہ خطہ زمین مل گیا۔ اس تحریک کے قائد نے بہت پہلے اعلان کر دیا تھا کہ اسلامی مملکت جس کے قیام کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں، قرآنی احکام و قوانین نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔ اس نے زمینداروں اور سرمایہ داروں کو وارننگ دے دی تھی کہ تمہیں اپنی روش بدلنے پڑے گی۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہارے لئے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہوگی کیونکہ وہاں نظامِ سرمایہ داری نہیں چل سکے گا۔ اس نے ابھی ابھی (۱۹۴۸ء میں) ایک براڈ کاسٹ میں کہا ہے کہ پاکستان میں تقیاً کریسی نہیں ہوگی۔ ہم نے دس برس تک مذہبی پیشوائیت کو برابر آگے بڑھا رکھا کہ وہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرے اور "خدا اور رسول" کے نام پر عوام کو اس کی حمایت کرنے سے باز رکھے۔ لیکن ان کی کسی نے نہ سُنی اور وہ تحریک کامیاب ہو گئی۔ اب اس خطہ زمین میں قرآنی نظام قائم ہو جائے گا اور ہماری حکمرانی ختم ہو جائے گی۔ عالی جاہ! یہ کیا ہو گیا؟ یہ کیسا انقلاب آ گیا؟

چھاگتی آشفته ہو کر وسعتِ افلاک پر جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اکشتِ غبار

فتنہ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج کانپتے ہیں کو ہزار و مرغزار و جوتبار

میرے آقا! وہ جہاں زیرِ ذر برہونے کو ہے

جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس نے یہ سب کچھ خاموشی سے سنا اور اس کے بعد نہایت سکون و اطمینان سے کہا کہ

اس میں شبہ نہیں کہ یہ انقلاب ہمارے لئے ایک بہت بڑے فتنہ کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ لیکن اس سے اس طرح گھبرانے اور چیخ و پکار کرنے کی کوئی بات نہیں۔ مسلمان مذہب پرست قوم ہے اسے اسی راستے سے بہکایا جاسکتا ہے۔ اسلام دشمن قوتیں بے نقاب ہو کر سامنے آئیں تو مسلمان ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہی قوتیں جب مذہب کا لبادہ اوڑھ کر آئیں تو یہ سادہ لوح نہایت آسانی سے ان کے دام فریب میں آجاتا ہے۔ لہذا تم اپنی قوتوں کو ایک بار پھر مجتمع کرو۔ ان کا جال سارے ملک میں بچھا دو۔ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَفْزَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ۔ ان کی پراسیگنڈہ کی مشینری کو تیز تر کرو۔ وَ اجْلِبْ عَلَيْهِمُ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ۔ اپنے لاؤشکر ان کے (DISPOSAL) پر چھوڑ دو کہ یہ چاروں طرف سے اس امت پر یورش کریں وَ شَارِكُكُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَ الْأَوْلَادِ۔ روپے پیسے سے ان کی مدد کرو اور ایسا انتظام کرو کہ قوم کا نوجوان طبقہ ان کی گرفت میں رہے۔ وَعَدُّهُمْ ۱۷/۶۳ اور انہیں حکومت و اقتدار کے سبز باغ دکھا دکھا کر اپنے پیچھے لگاتے رہو۔ تم یہ کچھ کرو اور پھر دیکھو کہ اس خطہ زمین میں بھی تمہاری حکمرانی کس طرح بدستور قائم رہتی ہے۔ یہ میرے مدتوں کے آزمائے ہوئے تیر ہیں جن کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ انہیں حربوں سے میں نے مسلمانوں کی اتنی اتنی بڑی مملکتوں کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ وہاں کے مسلمانوں کی کیفیت یہ ہے کہ

آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں  
ہو اگر پیدا تو مر جاتی ہے یا تہی ہے غلام!

تم دیکھتے نہیں کہ

صوفی و ملاطو کیت کے بندے میں تمام!

یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج

تمہارے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے

گنڈ ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام!

ہے طواف حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا

ان حربوں نے جو کچھ ان ممالک میں کیا ہے، وہی کچھ اس نوزائیدہ مملکت میں بھی کیا جاسکتا ہے جب تک دنیا میں مذہبی پیشوائیت باقی ہے، ہمارے لئے خطرہ کی کوئی وجہ نہیں، تم اسے ہر طرح سے تقویت پہنچاتے رہو اور جو پروگرام میں نے پہلے تجویز کیا تھا اس پر اور کبھی زیادہ شدت سے

عمل پیرا ہو جاؤ۔ یعنی جہاں جہاں بھی مسلمان نظر آئے ۵

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے

پنختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس پروگرام کے مطابق تشکیل پاکستان کے ساتھ ہی، وہ مذہبی پیشوائیت، جو مسلسل دس سال تک تحریک پاکستان کی مخالفت کرتی چلی آ رہی تھی، پاکستان میں آن موجود ہوئی۔ اقبال اس سے بہت پہلے و نیلے سے جا چکا تھا اور جناح قیام پاکستان کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس لئے مذہبی پیشوائیت کو یہاں پوری طرح کھل کھلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ

چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور حصول پاکستان کی تحریک اسی مقصد کے تحت چلائی گئی تھی کہ یہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے..... اور چونکہ یہاں مسلمانوں کی قومی قیادت آج تک جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے وہ ایک اسلامی حکومت کو چلانے کی صلاحیت سے عاری محض ہیں۔ لہذا انہیں چاہیے کہ وہ مسند قیادت و سیادت سے دستبردار ہو جائیں اور ایک نئی قیادت کے لئے جگہ خالی کر دیں۔ (جماعت اسلامی)

اٹھائیس سال سے مسلسل یہاں یہی جنگ جاری ہے جس نے قوم کو ان مقاصد کے حصول کی طرف آنے ہی نہیں دیا جن کی خاطر پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ملک کا سرمایہ دار طبقہ حسب معمول اس جنگ میں مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ہے کیونکہ مذہبی پیشوائیت ان کے مفاد کی پوری پوری نگہداشت کرتی ہے۔ مثلاً یہاں جب یہ تجویز سامنے آئی کہ اللہ کی زمین جاگیرداروں اور زمینداروں کے قبضہ سے نکال کر غریب کاشتکاروں کو دے دی جائے اور اس نچ کا قانون پاس کر دیا جائے کہ کسی شخص کے قبضہ میں اتنے ایکڑ سے زیادہ اراضی نہیں رہنے پائے گی تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے یہ فتوے صادر فرمایا گیا کہ ایسا کرنا خلاف شریعت ہے۔ اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کیفیت کے لحاظ

سے کوئی حد نہیں لگائی..... روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت پر کوئی حد نہیں..... وہ جس طرح ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اس طرح وہ تم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔

(مسئلہ ملکیت زمین، از سید ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۵۲ - ۷۲)

جب یہ سوال سامنے آتا کہ اتنے اتنے بڑے کارخانے سرمایہ داروں کی ذاتی ملکیت ہیں، انہیں ان کی ذاتی ملکیت سے نکال کر قوم کی مشترکہ تحویل میں دے دیا جائے تاکہ ان کی آمدنی قوم کے اجتماعی مفاد کے کام آئے تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے فتویٰ صادر ہو گیا کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطہ نظر کی ضد ہے۔

(مسئلہ ملکیت زمین، صفحہ ۷۰)

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ملک کی ساری دولت سمٹ کر چند گھرانوں میں محدود ہو گئی ہے اور غریب طبقہ دن بدن روٹی تک بھی محتاج ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت خوش ہے کہ ان کا جہادِ عظیم کامیاب ہو رہا ہے اور سرمایہ دار مطمئن کہ اسلام کی ڈھال ان کے لئے تیار کر دی گئی ہے جس کے چھے وہ جو جی میں آئے کر سکتے ہیں۔

لیکن اس میں 'عزیزانِ من' گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جب ابلیس اپنے مشیروں کو یہ پروگرام دے رہا تھا تو آنسو تے افلاک سے یہ نشیدِ جلال بھی اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی کہ تم جو جی میں آئے کرو دیکھو۔ اِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۷/۶۳) میرے بندوں پر تیرا کوئی جادو نہیں چل سکے گا۔ وہ بندے کہ

جن کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو!

وہ شمع قرآنی کو لے کر اٹھیں گے اور تمہارے مکر و دجل کی پھیلائی ہوئی تاریکیوں کے پرے چاک کر کے ان کے چھپے چھپے ہوتے ایک ایک چہرے کو بے نقاب کرتے جائیں گے۔ یہ کشمکش نئی نہیں ہے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز  
چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی

اور تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ جہاں اور جب بھی ”چراغِ مصطفویٰ“ کے علمبرداروں نے استقامت سے کام لے کر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ ”شرارِ بولہبی“ خاک تر ہو کر رہ گیا۔ اور فرعون، ہامان اور قارون کا متحدہ محاذ بھی اسے بچھنے سے نہ بچا سکا۔ — فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا (۶/۴۵) اس طرح ہر ظلم کرنے والی جماعت کی جڑ کٹ گئی۔ — وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبِطُونَ (۴۸/۴۸)۔ اور شرآنی نظام کی مخالفت کرنے والی ہر قوت، خاک تر و نامر اور ہو گئی۔ یہی پہلے ہوا ہے۔ یہی اب ہوگا۔ حقیقت ہے نہیں میرے تختیل کی یہ خلاق!

اور یہ اس دن ہوگا جب مسلمانوں میں خدا کے عطا کردہ دین اور مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ مذہب میں فرق کرنے والی نگاہ پیدا ہو گئی اور اس قسم کی نگاہ قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو اقبال نے کہا تھا کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن  
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

لہذا، عزیزانِ من! ہمارے لئے اقبال کا پیغام یہ ہے۔ اور یہ پیغام اقبال کا نہیں، درحقیقت قرآن کا پیغام ہے۔ کہ اس خطہ زمین، ارضِ پاکِ ستان کی حفاظت کا پورا پورا مسلمان کیا جائے کہ اگر یہ خطہ زمین ہی (خدا نکر وہ) باقی نہ رہا تو شرآنی نظام نافذ کس جگہ ہو سکے گا۔ اور جو تخریبی قوتیں اسلام کے نام پر ملک میں انتشار پیدا کرتی ہیں، ان کے فریب میں نہ آیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی ملک میں شرآنی پیغام کو عام کرتے جائیں۔ جب یہ پیغام فضا میں عام ہو گیا تو تخریبی قوتیں اس طرح کافور ہو جائیں گی جس طرح طلوعِ سحر سے

رات کی تاریکی کفن پوش ہو جاتی ہے۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا، تو یقین جانتے کہ ے  
 آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت ات کی سیماں پا ہو جائے گی  
 اس قدر ہوگی ترغم آفریں باد بہار نکتہ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی  
 شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ نور شید سے  
 یہ جہاں معمور ہوگا نعمہ توحید سے  
 وَإِخْرُودٌ عُوَانًا ۚ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝



# کیا اقبال اشتراکی تھا؟

جولائی ۱۹۶۹ء

آج کل ہمارے ہاں یہ موضوع بڑی شدت سے مرکزِ بحث و جدل بن رہا ہے کہ علامہ اقبال اشتراکی تھے یا نہیں۔ ایک فریق انہیں بدلائل و شواہد اشتراکی ثابت کر رہا ہے اور دوسرے فریق انہیں انہی کے کلام اور تحریرات سے اشتراکیت کا دشمن بتا رہا ہے۔ اربابِ دانش مرحوم کو اس طرح رگید رہے ہیں اور عوام انگشت بندہاں ہیں کہ یہ ہمارا کس قسم کا حکیم الامت ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ

جناب شیخ کے نقشِ قدم یوں بھی ہیں اور یوں بھی

حضرت علامہ کا جو احترام ہمارے دل میں اور ان کا جو مقام دنیا نے علم و فکر میں ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم حقیقتِ حال کو سامنے لا کر انہیں (کم از کم) اس الزام سے بچائیں کہ وہ اس قدر اہم موضوع پر ایسے متضاد خیالات کے حامل تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال چونکہ شاعر بھی تھے اس لئے ان کے کلام میں بعض مقامات پر تضاد بھی پایا جاتا ہے اور بعض نکات کے متعلق ہمیں ان کے فہم و تہان سے بھی اختلاف ہے۔ لیکن ہمارے مطالعہ اقبال کی رُو سے مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق ان کے ہاں تضاد نہیں۔ اور وہ جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ ہمارے نزدیک قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔

واضح رہے کہ ہم اس موضوع پر اس لئے قلم نہیں اٹھا رہے کہ اگر ثابت ہو جائے کہ علامہ اقبال اشتراکیت کے حامی اور مؤید تھے تو ہم کہہ دیں کہ اشتراکیت عین مطابق اسلام ہے اور اگر ایسا ثابت نہ ہو تو کہہ دیا جائے کہ اسلام اشتراکیت کے خلاف ہے۔ ہمارے نزدیک کسی نظریہ یا مسلک کے مطابق یا مخالف ہونے کی سند اور حجت خدا کی کتاب زندہ قرآن حکیم ہے، نہ کہ کسی فرد کا قول یا خیال۔ حتیٰ کہ ہم کسی شخص کے فہم و شہدائی کو بھی قرآنی سند اور حجت کا مقام نہیں دے سکتے۔

ہم نے جب اس بحث پر غور کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس مجادلہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں "اسلام" کا کوئی متعین مفہوم نہیں ہے۔ ہر فرد کا اسلام کا مفہوم الگ الگ ہے، حتیٰ کہ ایک ہی شخص کا مختلف اوقات میں اسلام کا مفہوم مختلف ہوتا ہے۔ کبھی "زمین پر بے حد و نہایت ذاتی ملکیت" عین اسلام ہے اور کبھی "وہ سوا ایک رقبہ کی تحدید" عین دین۔ اسی طرح اشتراکیت کا بھی کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں لایا جا رہا اور اب علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ جب کسی اصطلاح کا مفہوم متعین نہ رہے تو اس کا نتیجہ الجھاؤ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کسی لفظ یا اصطلاح کا مفہوم متعین کیجئے۔ آدھا مسئلہ اسی سے حل ہو جائے گا۔ لہذا مسئلہ زیر نظر کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اشتراکیت کا مفہوم متعین کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ "اشتراکیت" سے ہماری مراد وہ سوشلزم ہے جس کا تصور مارکس نے دیا تھا۔

کارل مارکس محض ایک ماہر معاشیات نہیں تھا۔ اس کا شمار فلاسفر کے زمرہ میں بھی ہوتا ہے۔ اس نے بنیادی طور پر ایک فلسفہ پیش کیا تھا اور پھر اس فلسفہ کی بنیادوں پر ایک معاشی نظام کا نقشہ دیا تھا جس کی ابتدائی شکل سوشلزم اور انتہائی کمیونزم ہے۔ لہذا سوشلزم سے مراد ہے مارکس کا پیش کردہ فلسفہ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام۔ مارکس کے فلسفہ حیات کی رُو سے انسان کی زندگی بس یہی طبعی زندگی ہے اور اس سے متعلق مسائل مادی۔ اسی تصور حیات کے مطابق، نہ خدا کا وجود باقی رہتا ہے نہ وحی کا۔ جب وحی کا وجود باقی نہ رہے تو نہ نبوت کا تصور باقی رہتا ہے، نہ اس کی وساطت سے عطا کردہ مستقل اقدار کا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد حیات اخروی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے (مسئلہ زیر نظر کی حد تک) مارکس کے فلسفہ حیات



کا ملخص۔

(۱) جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، مارکس کے نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کی جگہ ایسا نظام لے گا جو اس نظام (سرمایہ داری) کی ضد ہوگا۔

(۲) اس (جدید) نظام میں 'فرائع پیداوار' افراد کی ذاتی ملکیت کے بجائے 'مخنت کشوں کی مشترکہ ملکیت' (یا تحویل) میں رہیں گے۔

(۳) فاضلہ دولت 'جو نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے، کسی کے پاس نہیں رہے گی۔  
 (۴) جب فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہے گی تو دولت کی بنیاد پر دوسروں کی مخنت کو غصب کر کے مزید دولت کمانے کا سوال باقی نہیں رہے گا۔ نہ ذاتی جائیدادیں کھڑی کی جاسکیں گی۔ نہ انفرادی کارخانے لگاتے جاسکیں گے۔ نہ سودی کاروبار ہو سکے گا۔ نہ یہ صورت پیدا ہو سکے گی کہ

اُمّتے بر اُمّتے دیگر چرو

وانہ این می کار دآں حاصل برد

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ مارکس کے پیش کردہ فلسفہ حیات کا کبھی موید نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا فلسفہ حیات اور مارکسی فلسفہ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اب رہا معاشی نظام۔ سو اگر اسلام کا مفہوم غیر متعین رکھا جائے تو پھر کسی نظام، خلاف اسلام بھی ہو سکتا ہے اور مطابق اسلام بھی۔ لیکن اگر اس کے مفہوم کے لئے قرآن کریم کو حرفِ آخر قرار دیا جائے تو اس کے اثبات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قرآن کریم نظام سرمایہ داری کا سخت دشمن ہے اور اشتراکی نظام قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔  
 آئیے ہم دیکھیں کہ اقبال اس باب میں کیا کہتا ہے۔

۱۔ میں نے سوشلزم اور قرآن کے معاشی نظام کی تشریح اپنے اس خطاب میں کی تھی جو "اسلامی سوشلزم" کے عنوان سے طلوع اسلام کنونینشن منعقدہ اپریل ۱۹۶۲ء میں پیش کیا گیا تھا۔

اقبال نے اپنے سینے میں ایک درد آگیاں قلب پایا تھا جو مفلسوں اور ناداروں، محنت کشوں اور مزدوروں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بن کر اس کی چشم گریاں سے ٹپک پڑتا تھا۔ ان کی سب سے پہلی انٹرنی کتاب "علم الاقتصاد" ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں اصول مذہب بھی بے انتہا موثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندہ ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قوی کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریب یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریب قوی انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلمِ ادل یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مذہب قویں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوت مدارج، بجائے اس کے کہ قیام تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے گراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک درمند دل کو بلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحہ عالم سے حروف غلط کی طرح مٹ جلتے۔

یہ ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ غور کیجئے کہ اتنی سی عمر میں 'اقبال' کے دل میں کس قسم کے سوالات اُبھر رہے تھے۔ یہ سوالات کہ (۱) آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے اور (۲) کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دُخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک درد مند دل کو بلا دینے والا نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحہٴ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟۔ ان سوالات میں "ہمیشہ کے لئے" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ اقبال کی باقی زندگی (منجملہ دیگر) انہی سوالات کے اطمینان بخش جواب کی تلاش میں گزری۔ ظاہر ہے کہ ان کا جواب ہمارے "مروجہ مذہب" کے معاشی نظام سے نہیں مل سکتا تھا کہ جس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ نظمِ عالم کے لئے مفلسی ایک جزو لازم ہے۔ کیونکہ اگر مفلسی نہ رہے تو دولت مند لوگ صدقہ اور خیرات دے کر ثواب کیسے حاصل کر سکیں گے اور مفلسی سے کراہنے والوں کی دُخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو صدقہ و خیرات سے متعلق احکامِ شریعت معطل ہو کر رہ جائیں گے!

لیکن اقبال نے ان سوالات کا جواب قرآنِ حکیم کے عالمگیر ابدی ضابطہٴ حیات سے پالیا اور انہی جوابات کو وہ امت اور عالمگیر انسانیت کے سامنے پیش کرتے رہے۔ سب سے پہلے یہ

## اقبال اور نظامِ سرمایہ داری

قرآن کی دفتین سے یہ جواب ملا کہ مفلسی اور ناواری کا بنیادی سبب 'نظامِ سرمایہ داری' ہے اور جب تک اس نظام کی جڑیں نہیں کٹتیں، کراہنے والوں کی دُخراش صدائیں خاموش نہیں ہو سکتیں۔ ان صداؤں کا علاج 'محتاجوں اور مفلسوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈال دینے میں نہیں۔ ان کا علاج اس نظام کے الٹ دینے میں ہے جو انہیں مفلس اور محتاج بنا تا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر، اقبال نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اپنی مشہور نظم "خضر راہ" میں خضر سے سوال کرتے ہیں کہ

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟

اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور خضر کی زبانی اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے      خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات!  
 اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر      شاخِ آہو پر رہی صدیوں تیری برات  
 مگر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار      انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اسی زمانہ میں، ان کا فارسی مجموعہ کلام، پیام مشرق، شائع ہوا۔ اس کے آخری باب ”نقشِ فرنگ“ کا پیشہ حصہ، محنت اور سرمایہ کے اہم موضوع کے لئے وقف ہے۔ وہ اس میں ”صحبتِ رفتگان“ کے عنوان کے تحت ٹالسٹائی کی زبان سے کہلاتے ہیں۔

دارتے یہوشی است تاجِ کلیسا، دطن

جانِ خدا در اخواجہ بجائے خرید!

اور کارل مارکس کے یہ الفاظ دہراتے ہیں کہ

رازدانِ جزوکل، از خویش نامحرم شد است      آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

ٹالسٹائی، بیگل کے فلسفہٴ اضا دا کو ”عقل و ورو“ کی آفرینش کی تخلیق قرار دے کر اس پر ان الفاظ میں سخت تنقید کرتا ہے کہ اس کی رُو سے وہ

درسِ رضائی دہی بندۂ مزدور را

ایرانی تحریکِ کمیونزم کا بانی، مزدک، دورِ حاضر کی اضطرابِ انگریزوں کو دیکھ کر، پکارا اٹھتا ہے کہ

فوانہ ایراں ز کشتِ زار و قیصر بردمید      مرگِ نومی رقصدا ندر قصرِ سلطان و امیر

مدتے در آتشِ نمرودی سوزد خلیل      تاہی گرد و خروش از خداوندانِ پیر

دورِ پرویزی گذشت اے کشتہ پر ویز خیز

نعمتِ گم گشتہ نوور از خسرو باز گیہ

اس کے ساتھ ہی، مزدوروں کا نمائندہ، کوہن، اس نفیرِ قیامت خیز کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

لے انسانوں کا خود ساختہ مذہب، غریب کو تقدیرِ خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین سے درسِ رضا دیتا ہے۔

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است      ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است  
 بردنِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ بزم      زبانِ او ز میح و دولش ز چنگیز است  
 اگرچہ تیشہ من کوه را ز پا آورد      ہنوز گردشِ گردوں یکام پرویز است  
 ز خاک تاپ فلک ہرچہ ہست رہ پیماست  
 قدم کشائے کہ رفت از کارواں تیز است

اس کے بعد ہمارے سامنے فرانسیسی فلاسفر آگسٹس کومٹ اور مردِ مزدور کا مکالمہ آتا ہے۔ کومٹ نے فلسفہ مادیت کا علمبردار تھا اور طبقات کی تفریق کو عین مطابق فطرت قرار دیتا تھا۔ اس کے فلسفہ کے جواب میں مردِ مزدور کہتا ہے۔

فریبی بحکمت مرا اے کلیم      کہ نتواں شکست این طلسمِ قدیم  
 مسِ خمام را از زر اندوہ      مرا خونے تسلیم فرمودہ  
 تیغ کو کہن وادی اے نکتہ سنج      بہ پرویز پر کار و نابردہ رنج؟  
 جہاں راست بہروزی از دست مژد      ندانی کہ این ہیج کار است و زد

پتے جبرم او پوشش آور وہ؟  
 بایں عقل و دانش فسول خوردہ؟

ازاں بعد سرایہ دار اور مزدور کا قسمت نامہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس تقسیم کی رو سے سرایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ میاں اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ

غوغلے کارخانہ آہنگری ز من      گلبانگِ ارغنونِ کلیسا ازان تو  
 نخلے کہ شہ خراج برومی ہند ز من      باغ بہشت و سدہ و طوبی ازان تو  
 تلخا بہ کہ ورو سہ آرد ازان من      صہبائے پاک آدم و حوا ازان تو

ایں خاک و آسپمہ در شکم او ازان من  
 وز خاک تاپ عرشِ معلے ازان تو

اور پھر مزدور کی یہ دلخراش صدائے دردناک ہمارے کانوں میں آتی ہے۔

ز مزد بندہ کرپاش پوشا و محنت کش      نصیبِ خواجہ ناکرودہ کار ز خست حریر

زخوئے فشانی من لعل خاتمِ والی      ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستارِ امیر  
 ز خونِ من چو زُلفِ بہی کلیسا را      بزورِ بازوئے من دستِ سلطنتِ ہمہ گیر  
 خرابہ رشکِ گلستاں ز گریہِ سحرِ م  
 شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرِ م

اور اس کا ردِ عمل۔

بیگانہ تازہ نوامی ترا و او از رگِ ساز      مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغرِ اندازیم  
 مغان و ویرِ مغاں را نظامِ تازہ و ہم      بناتے میگرد ہائے کہن بر اندازیم  
 ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم      بہ بزمِ غنچہ و گلِ طرحِ دیگر اندازیم  
 بطوفِ شمعِ چو پروانہ زیتنِ تاکے  
 ز خویشِ این ہمہ بیگانہ زیتنِ تاکے

یہی حشرِ بدامان پیغامِ انقلاب ہے جسے "زبورِ عجم" میں ان الفاظ میں وجہ تزلزلِ قصرِ سرِ پادشاہی بنایا گیا ہے۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدورِ ساز و لعلِ ناب      از جفائے وہ خدایاں کشتہ ہقاں خراب  
 انقلاب

انقلاب اے انقلاب

"بالِ جبریل" میں فرشتوں کا گیت، اسی رُوحِ انقلاب کا طنزیہ نشتر ہے۔ وہ خدائے کائنات کو مخاطب کر کے شکوہ سنج ہیں کہ

خلقِ خدا کی گھات ہیں زند و فقیر و میر و پیر      تیسے جہاں میں ہے وہی گروشِ صبحِ شام بھی!  
 تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست      ہندہ، کوچہ گردا بھی خواجہ بلند نام بھی!

اور یہی وہ "عرش کے کنگوے ملا دینے والا" احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو      کاخِ امرار کے وردِ دیوارِ ہلا دو  
 جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں رُزی      اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل نہیں پردے  
پیران کلیسا کو کلیسا سے اکٹھا دو  
حق را بسجودے صنماں را بطوانے  
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بکھا دو  
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے  
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

یہی بات ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ  
اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلا دے  
اس لئے کہ  
ہے ان کی نمازوں سے محرابِ تیش ابرو

کثرتِ نعمت گداز ازلِ بُرد  
نازمی آرد نیاز ازلِ بُرد  
سالہا اندر جہاں گردیدہ ام  
نم بچشمِ منجماں کم ویدہ ام (جاوید نامہ)  
ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کسی اشتراکی (ہی نے نہیں بلکہ کسی کمیونسٹ) نے اس سے زیادہ تند و تیز  
الفاظ میں، نظامِ سرمایہ داری کو الٹنے کے لئے دعوتِ انقلاب دی ہے؟ بال جبریل میں لیکن خدا  
کے حضور یہ شکایت کرتا دکھائی دیتا ہے کہ

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں  
ہیں تلخ بہت بندہٴ مزدور کے اوقات  
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ  
دنیا بے تری منتظر روزِ مکافات  
اور اس کا جواب چار ہی قدم آگے چل کر ہمیں اقبال کے الفاظ میں یہ ملتا ہے کہ  
گیا دیر سرمایہ داری گیا  
تماشہ دکھا کر داری گیا  
جاوید نامہ میں، مسلمان کی تباہی و بربادی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔  
چار مرگ اندر پتے ایں دیر میر  
سود خوار و والی و ملا دیر

دوسری جگہ ہے۔  
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری  
اے کشتہٴ سلطانی و ملانی پیری  
ملا دیر، غریبوں اور ناداروں کو جس اسلام کا سبق پڑھاتے ہیں، اقبال سے ابلیس کا پیدا کردہ فریب  
قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں، ابلیس کی زبان سے کہلوا یا گیا ہے کہ  
میں نے ناداروں کو کھلایا سبقِ تقدیر کا  
میں نے منع کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

اور دورِ حاضر کے علم و فلسفہ اور تجارت و سیاست کو ملوکیت کی دسیسہ کاریوں کی تخلیق۔

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت  
جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد

(ارمغانِ حجاز)

اقبال اس طرح نظامِ سرمایہ داری کے بُتِ سامری کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بڑھتے ہیں۔  
**مثبت نظامِ معیشت** اور قرآنی نظامِ معیشت کی بنیادی شقوں کو سامنے لاتے ہیں۔  
نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس نظر پر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہنے چاہئیں۔ اقبال کے نزدیک یہ نظریہ قرآنی نظریہ معیشت کی یکسر نقیص ہے اور ایسیانہ فکر کی ایجاد۔ ذرائع پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض) کو حاصل ہے۔ اس باب میں اقبال کا نظریہ اس قدر واضح ہے کہ اس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ جاوید نامہ میں انہوں نے ”محکماتِ عالمِ قرآنی“ کے جو تین ستون بیان کئے ہیں، ان میں ایک ستون یہ ہے کہ  
ارض ملکِ خداست

اس عنوان کے تابع وہ لکھتے ہیں:-

حق زمین را جز متاع مانہ گفت  
دہ خدایا! نکته از من پذیر

ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت  
رزق و گورازوے بگیر اور امگیر

باطن ”الارض لشد“ ظاہر است  
ہر کہ این ظاہر نہ پسند کافر است

ہم نہیں سمجھتے کہ اقبال، اس مسئلہ کے متعلق، اس سے واضح تر الفاظ میں، اور کیا کہہ سکتا تھا۔ اپنے غور نہیں فرمایا کہ وہ مسئلہ ملکیتِ زمین کو، کفر و ایمان کی بنیاد قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ زمین کو افراد کی ذاتی ملکیت قرار دینا کفر ہے۔

آگے چل کر کہتے ہیں۔

ایں ”متاع“ بندہ و ملکِ خداست

رزق خود را از زمین بردن رواست

اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:-



ایک می گوئی متاعِ مازِ باست      مردِ ناداں میں ہمہ ملک خداست  
ارضِ حق را ارضِ خود دانی ، بگو      چیت شرحِ آیه لا تُفْسِدُوا  
ابنِ آدمِ دلِ بابلیسی نہاد      من ز ابلیسی ندیدم جز فساد  
برودہ چیزے کہ از آں تو نیست  
داغم از کارے کہ شایان تو نیست

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ      تازِ کارِ خویش بکشائی گرہ  
”ابلیس کی مجلسِ شوریٰ“ (ارمغانِ حجاز) میں ابلیس کی زبان سے کہلوا یا گیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

پادشاہوں کی نہیں اشد کی ہے یہ زمیں

”بالِ جبریل“ میں اس اجمال کی تفصیل حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے۔

أَلْوَرَضُ بِلَدِّهِ

وہ زمیندار کو (جو اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھتا ہے) مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون      کون دریاؤں کی موجوں کا اٹھاتا ہے سحاب  
کون لایا کھینچ کر پھپھ سے بادِ سازگار      خاک کیس کی ہے کہس کا ہے یہ نورِ آفتاب  
کس نے بھری موتیوں کو خوشہ گنم کی جیب      موسموں کو کس نے کھلائی یہ خوئے انقلاب

وہ خدا یا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں

تیرے آبار کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں

جب یہ زمین تیرے آبار کی نہیں تھی تو اسے وراثت میں پا کر مالک بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جب یہ نہ تیری ہے نہ میری تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کیسے کیا جاسکتا ہے؟ یہ خدا کی ہے اور قرآن کی رُو سے جس چیز کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے، اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے فائدے کے لئے کھلی رہے گی۔ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جاسکے گی۔ جیسے اس نے جب کعبہ کے متعلق کہا کہ وہ میرا گھر (بیٹی) ہے تو اس کے ساتھ ہی کہہ دیا گیا کہ اسے بتناں بنایا

گیا ہے یعنی تمام نوع انسانی کے فائدے کے لئے۔ اس لئے وہ سواء ن العاکف و الباد۔ یعنی وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں طور پر کھلایا یہی حیثیت زمین کی ہے، وہ نوع انساں کے لئے متاع (سامان زیست حاصل کرنے کا ذریعہ) ہے کسی کی ذاتی جائیداد نہیں۔

**فاضلہ دولت** جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، نظام سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کا فیصلہ صاف اور واضح ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے۔ **يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ**۔ اے رسول! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت رفاہ عامہ کے لئے دے دیں۔ **قُلِ الْعَفْوَ** (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ تمہاری ضروریات سے زائد جس قدر ہے، سب کی سب۔ اس فیصلہ نے فاضلہ دولت کا تصور ہی ختم کر دیا۔ قرآن کریم کے اسی فیصلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے 'اقبال' جاوید نامہ میں کہتے ہیں کہ قرآن نے

بامسماں گفت جاں بر کف بندہ ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

جب روس میں اشتراکیت کا انقلاب برپا ہوا تو اقبال کی نگہ ڈرف میں وڈورس نے اس میں فطرت کے اس اشارہ کو مضمردیکھا کہ وہ دور قریب آرہا ہے جب قرآن کا معاشی نظام وجہ شادابی عالم بن جائے گا۔ ضربِ کلیم کی یہ نظم (جس کا عنوان اشتراکیت ہے) اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم  
بے سود نہیں روس کی یہ گرمی رفتار  
اندیشہ ہوا شوخی افکار پہ مجبور  
فرسوہ طریقوں سے زما نہ ہوا بیزار  
انساں کی ہوس نے جنہیں لکھا تھا چھپا کر  
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار  
قرآن میں ہو غوطہ زن لے مرد مسلمان  
اللہ کرے تجھ کو عطا اجرت کردار

جو حرفِ قُلِ الْعَفْوِ میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

جب قرآن کی یہ مضمحل حقیقت نمودار ہوگی تو اس وقت اس دنیا کا نقشہ کیا ہوگا، اسے اقبال نے

جاوید نامہ میں 'فلکِ مریخ پر شہرِ مرغین (دینِ کاکستان) کے رنگ میں پیش کیا ہے اس میں  
سخت کش و ہمال چرخِ غش روشن است از نہاب وہ خدایاں ایمن است  
کشت و کارش بے نزارِ آبجوست حاصلش بے شرکتِ غیرے از اوست

اور

نے بازاراں زبیکاراں خروش نے صدائے گدایاں دردِ گوش  
اقبال اپنی ۱۹۰۳ء کی آرزو کو (جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے) قرآنی نظام کی اس آئیڈیل دنیا  
میں پورا ہوتے دیکھتا ہے جہاں کیفیت یہ ہے کہ  
کس دریں جا سائل و محوم نیست  
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست  
اسی کو وہ دین کا حاصل قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ  
کس نگر و در جہاں محتاج کس نکتہ شرع میں ابن است و بس

اقبال نے معاشی نظام کے متعلق جو کچھ کہا ہے 'وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ اس پر غور کیجئے اور  
دیکھئے کہ اس میں اور اشتراکی نظام میں کس قدر مماثلت ہے۔ اقبال کو یقین تھا کہ جس معاشی نظام کو  
اس نے قرآن سے سمجھا ہے وہ عہدِ رسالت میں عملاً متشکل ہو گیا تھا اور چونکہ وہ نظام 'اشتراکیت کے  
مماثل تھا' اس لئے ابو جہل کو یہ مغالطہ لگ رہا تھا کہ

ایں مساوات ایں موافقات اعجمی است  
خوبی دائم کہ سلماتِ مزدکی است

## ۲۔ اشتراکیت کی مخالفت

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اقبال 'اشتراکی نظامِ معیشت کا حامی تھا کیونکہ وہ نظام  
قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ لیکن اقبال اشتراکیت کے فلسفہ حیات کا تو حامی نہیں

ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ فلسفہ قرآن کے فلسفہ زندگی کی یکسر نقیض ہے۔ لہذا اس فلسفہ حیات کی تردید اور مخالفت کی اور سخت مخالفت۔ اس فلسفہ کی بنیاد ”انکار“ پر ہے جسے اقبال لائے تعبیر کرتا ہے۔ خدا کا انکار، وحی کا انکار، مستقل اقدار کا انکار، اخروی حیات کا انکار۔ اقبال نے اس فلسفہ پر تنقید کی اور کہا کہ اس پر متفرع نظام زندگی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ وہ اپنی ثنوی۔ پس چہ باید کروائے اقوام شرق۔ میں ردس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کردہ ام اندر مفاہاتش نگہ  
لا سلاطین، لا کلیسا، لا الہ !

لا سلاطین اور لا کلیسا تک تو بات درست ہے کہ یہ نظام سرمایہ داری کے کل پُرزے ہیں لیکن لا الہ کے بعد الا اللہ نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ

در مقام لایا ساید حیات      سوتے الامی خرامد کائنات  
لاوالا برگ و ساز امتناں      نفی بے اثبات مرگ امتناں

وہ جاوید نامہ میں ملت روسیہ کو حسب ذیل پیغام دیتے ہیں:-

تو کہ طرح دیگرے انداختی      دل زد ستور کہن پرواختی  
کردہ کار خدا ونداں تمام      بگذرازا لاجانب الاخرام  
درگذرازا لاکر جویندہ      تارہ اثبات گیری زندہ

ایکہ می خواہی نظام عالمی  
جستہ اور اساس محکمے

یہ اساس محکم اُسے کہاں سے ملے گی؟۔ کہتے ہیں۔

داستان کہنہ شستی باب باب      فکر روشن کن از اتم الکتاب

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ اقبال اشتراکیت کے معاشی نظام کی حمایت تو کرتا ہے لیکن اشتراکیت کے فلسفہ حیات کا سخت مخالف ہے۔ خود کارل مارکس کی یہی دو حیثیتیں ہیں جنہیں وہ بڑے حسین اور بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ اس کے متعلق کہتا ہے۔

صاحب سرمایہ از نسل خلیل یعنی آں پیغمبر بے جب تیریل  
یعنی وہ پیامبر انقلاب تو ہے لیکن وحی کی راہ نمائی سے محروم ہے۔ اس کا انقلابی پروگرام (جو نظام  
سرمایہ داری کو مٹا کر اس کی جگہ اشتراکی نظام قائم کرنے کا مدعی ہے جو اشتراکی نظام کے مماثل ہے)  
برحق ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ زندگی یکسر باطل ہے۔

زانکہ حق در باطل اضمحلت است قلب اومومن داغش کافر است  
کس قدر برجستہ اور بلند ہے یہ تجزیہ! اس کا قلب درد آگیاں، مفلسوں، محتاجوں، مزدوروں، محنت کشوں  
کے مصائب سے وقف اضطراب ہے اور ان کی مشکلات کے حل کے لئے کوئی انسانیت ساز نظام  
تجویز کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کا قلب مومن ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ یکسر باطل ہے اس لئے داغش  
کافر است۔ اس مقام پر مارکس پر کوئی پیغمبر بے جب تیریل کہا گیا ہے۔ ارمنغان حجاز میں مشیر اہلس کی  
زبان سے اس کے متعلق کہلوا یا ہے کہ

وہ کلیم بے تحشتی وہ مسیح بے صلیب

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارو کتاب

یعنی ایک عظیم داعی انقلاب جو وحی کی روشنی سے محروم ہے، مارکس (یا اشتراکیت) کی اس محرومی  
اور بے بصری پر اقبال کا دل کڑھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وحی کی اساس محکم نہ ہونے کی وجہ سے  
اس قدر عظیم انقلاب انسانیت، ناکام رہ جائے گا۔ وہ ہزار جان سے چاہتا ہے کہ اس انقلاب کے  
داعی، اپنے فلسفہ حیات کے لئے قرآن سے رہنمائی حاصل کریں تاکہ یہ معاشی انقلاب ابد و رکنا  
ہو جائے۔ اس امتزاج سے یہ عین مطابق اسلام ہو جائے گا۔ جب اقبال نے سرفرانس بینک میں  
کو (۱۹۳۱ء میں) لکھا تھا کہ

بالشوزم + خدا = اسلام

اس سے اس کا مقصد یہی تھا کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کو اگر قرآن کے فلسفہ حیات کی  
بنیادوں پر استوار کر لیا جائے تو یہ اسلام کے مماثل ہو جائے گا اور اسی میں نوع انسانی کی نجات  
کا راز و ابستہ ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ !

انہوں نے اس سے بھی بہت پہلے اپنے ایک مراسلہ میں اپنے مسلک کی وضاحت کر دی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ جب انہوں نے (بانگِ درا اور پیامِ مشرق میں) اشتراکیت کے معاشی نظام کی تائید میں لکھا تو ایک صاحب شمس الدین حسن نے جو کمیونزم کے بہت بڑے حامی (اور ہفتہ وار اخبار انقلاب اور خاور کے ایڈیٹر رہ چکے تھے) روزنامہ زمیندار (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۳ جون ۱۹۲۳ء میں ایک مضمون میں لکھا کہ:-

باشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر، اقبال، قانون کی زد سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ بالشوزم کارل مارکس کے فلسفہ سیاسیات کا لب لباب ہے اور اسی کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اقبال کی نظم - خضر راہ - اور ان کے مجموعہ کلام 'پیامِ مشرق' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ ہیں۔

اس کے جواب میں حضرت علامہ کا ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں خط شائع ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ

(۱) میرے انکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ باشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۃ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔  
(۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔

(۳) روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہے لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔

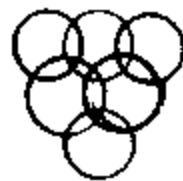
اس کے بعد انہوں نے ۱۹۳۶ء میں 'خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں لکھا:-

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے خلاف ہیں اور اسے  
افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس  
نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے  
نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سر اسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر  
روحانیت کے قرآنی مفہوم کا..... جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے  
یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم  
سوا سلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے  
بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ (مکاتیب اقبال)

اس سے سوشلزم اور اسلام کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سوشلزم کا  
فلسفہ حیات ماننے والا مسلمان نہیں ہو سکتا۔

انہوں نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے قائد اعظم کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ :-  
شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ  
اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم عام  
معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے..... اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی  
کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل  
ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع  
کرنا ہوگا۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ علامہ اقبال سوشلزم کے فلسفہ حیات کو اسلام کی نقیض قرار دیتے اور  
اس کے شدید مخالف تھے اور وہ قرآن کے معاشی نظام کو (جو سوشلزم کے معاشی نظام کے مماثل  
ہے) نوع انسانی کی مشکلات کا حل قرار دیتے تھے۔



# اقبال اور دو قومی نظریہ

یومِ اقبال، اپریل ۱۹۴۳ء کی تقریر

کاروانِ انسانیت کی داستان بھی عجیب و غریب ہے۔ اس میں سے لاکھوں انسان روزانہ کہیں گم ہو جاتے ہیں اور لاکھوں نئے افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ افراد کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ پہلے دن سے جاری ہے اور آخری دن تک جاری رہے گا۔ ان آنے جانے والوں کی گمنامی کا یہ عالم ہے کہ ان کی داستانِ حیات تو ایک طرف، زمانے کی ریگِ رواں پر ان کے نقوش قدم تک بھی نہیں ملتے۔ لیکن اسی گمنامِ جوم اور بے نام و نشان انبوہ میں کبھی کبھار ایسے افراد بھی آجاتے ہیں جو زندہ و پابندہ روشنی کے میناروں کی طرح چمکتے اور کاروانِ انسانیت کے لئے نشاناتِ راہ اور سراغِ منزل بنتے ہیں۔ تاریخِ انسانیت درحقیقت انہی قندیلوں کی تابندہ شعاعوں سے عبارت ہے۔ اسی قسم کے افراد تعمیرِ انسانیت کے معمار اور تحسینِ کائنات کے نقشِ گرہوتے ہیں۔ یہی وہ سیرت سازِ اقوامِ بلبل ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

فطرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے

دنیا میں بھی میزانِ قیامت میں بھی میزان

انہی زندہ جاوید ہستیوں میں اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کا شمار ہوتا ہے جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ وہ یگانہ روزگار جس کے متعلق خود اس نے کہا تھا کہ



عمر باد رکعبہ و بیت خانہ می نالہ حیات

تیا ز بزم عشق پاک دانائے راز آید برون

صدوف زمانہ ہزاروں سال تغیرات حوادث کی موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہے تب جا کر اس قسم کے گوہر یک دانہ کی نمود ہوتی ہے۔

عزیزان من! مشرق نے علامہ اقبال کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانا اسی لئے انہیں زیادہ

سے زیادہ "شاعر مشرق" کے لقب سے نوازا گیا، مغرب نے انہیں ایک

نقیب قرآن | فلا سفر کی حیثیت سے پہچانا اور دنیا کے ممتاز مفکرین کی صف میں انہیں جگہ

دی۔ اس میں شبہ نہیں کہ شعر و فکر کی دنیا میں بھی ان کا مقام بہت بلند ہے لیکن میرے نزدیک ان کا

صحیح مقام کچھ اور ہے اور وہ مقام ہے پیغامِ قرآن ہونے کا (پیغمبر نہیں، پیغامِ بریا نقیب)۔ میرے دل

میں حضرت علامہ کی جو عظمت و عقیدت ہے وہ ان کے اسی مقام کی بنا پر ہے۔ خدا کی یہ کتاب

عظیم ہمارے ہاں صدیوں سے مقدس غلافوں میں لپیٹی زینتِ دو طاقِ نسیاں ہو رہی تھی۔ اقبال نے

اسے ان غلافوں سے نکالا اور اس کے پیغامِ حیات بخش کو اس انداز سے عام کیا کہ اس کے غلغلوں سے

فضا گونج اٹھی۔ اس نے خوابیدہ ملتِ اسلامیہ کو جھنجھوڑا اور کہا کہ:-

رسمِ دآئینِ مسلمان دیگر است

منزل و مقصودِ قرآن دیگر است

اس نے کہا کہ کس قدر مقامِ ناست ہے کہ

در ایامے او نہ مے دیدم نہ درد

بندہ مومن ز قہر آں بر خورد

خود سر تختِ لوکیت نشست

خود ظلمِ قیصر و کسریٰ شکست

اس نے اس انقلابِ آفریں ضابطہٴ حیات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ

دستیگر بندہ بے ساز و برگ

چیت قرآن خواجہ را پیغامِ مرگ

یعنی:-

نئے کوئی نغفور و خاقان نے فقیرہ نشیں

موت کا پیغام ہر نوبع غلامی کے لئے

منعموں کو مالِ دولت کا بنانا ہے اہیں

کتابِ دولت کو بر آودگی سے پاک صفا

پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

ایک طرف قرآن نے ملوکیت اور نظامِ سربراہی کا خاتمہ کر دیا اور دوسری طرف اس نے مذہبی پیشوائیت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا۔

نقشِ قرآنِ نادر این عالم نشست  
نقشہائے کاہن و پاپا شکست  
اس نے قرآن کے اس پیغام کو عام کیا کہ

کیوں خالق و مخلوق میں حائل ہیں پرے  
پیرانِ کلیا کو کلیسا سے اٹھا دو  
اس نے کہا کہ ان خود ساختہ "نمائندگانِ خداوندی" کی حالت یہ ہے کہ :-

حق را بسجودے، صنماں را بطوائفے  
یہ طوائف تہوں کا کرتے ہیں اور خدا کو اپنے سجدوں سے دھوکا دیتے ہیں۔ اس لئے کہ  
بہتر ہے چہ راغِ حرم و دیر کجبادو

قرآن انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے رہنمائی دیتا ہے اس لئے پیغامِ اقبال کے بھی متعدد پہلو ہیں۔ میرے لئے یہ مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ میں ایک نشست میں تمام گوشوں کا احاطہ کر سکوں۔ ایک نشست میں ان میں سے کسی ایک گوشے ہی کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔ میں آج کی تقریب کے لئے ایک ایسے گوشے کا انتخاب کیا ہے جس نے پاکستان کی اجتماعی زندگی میں انتہائی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اور جس پر میرے نزدیک اس مملکت کی موت و حیات کا انحصار ہے۔ یہ موضوع ہے۔ دو قومی نظریہ۔ بظاہر ایسا نظر آئے گا کہ یہ مسئلہ ہنگامی سیاست سے متعلق ہے جس کا فیصلہ ہمیں اپنی سیاسی مصلحتوں کے مطابق کر لینا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ آپ دیکھیں گے کہ اس مسئلہ کا تعلق ہماری ہنگامی سے نہیں۔ یہ قرآن کی پیش کردہ ابدی حقیقت ہے اور دین کا اصل الاصول۔ علامہ اقبال نے اسے اسی حیثیت سے پیش کیا اور اسی کی بنیادوں پر اس مملکت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی عمارت کے استحکام کا انحصار اس کی بنیاد پر ہوتا ہے اسی طرح مملکت پاکستان کی سالمیت کا دار و مدار اسی نظریہ پر ہے اور اس کی یہی اہمیت ہے جس کے پیش نظر میں نے اسے اپنے خطاب کا موضوع قرار دیا ہے۔

عزیزانِ من! اگر کوئی یہ کہے کہ ایک فقرہ میں بتاتے کہ اسلام کا مقصود و منتہی اور دین کی غایت  
الغایات کیا ہے تو اسے پورے ختم و یقین کے ساتھ متعین طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کا مقصود  
اور اس کے عملی نظام (دین) کی غایت یہ ہے کہ نوع انسان کے اختلافات و افتراقات کو ختم کر کے  
اُسے آسمانی اقدار کی بنیادوں پر ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ انسانوں نے جب اپنی تمدنی زندگی  
کا آغاز کیا، تو قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ **كَانَ**  
**النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً** (۲/۲۱۳) اس وقت تمام انسان ایک  
برادری (امت واحدہ) کی شکل میں رہتے تھے۔ ان میں نہ باہمی اختلاف تھا

## دین کی غایت

نہ افتراق۔ نہ نزاحم تھا نہ تصادم۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے۔ ان میں "میری  
اور تیری" کی کوئی تمیز نہ تھی اس لئے جس کو جہاں بھوک لگے وہیں سے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا  
(۲/۲۵)۔ اس طرز زندگی میں "نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا تھا نہ پیاس کا" نہ کپڑے کی فکر وجہ پریشانی ہوتی  
تھی نہ مکان کی" (۱۱۸-۲۰/۱۲۱)۔ ان سے کہا گیا تھا کہ تم اسی طرح ایک برادری بن کر رہنا۔ **وَلَا تَقْسَبَا**  
**هَذِهِ الشَّجَرَةَ** (۲/۲۵) باہمی مشاجرت اختیار نہ کر لینا۔ مشاجرت کے معنی ہیں شجر کی طرح ہوجانا  
کہ جس کی اصل ایک ہونے کے باوجود شاخیں الگ الگ ہوجاتی ہیں۔ لیکن انسانوں نے اس سے  
اعراض برتا۔ **فَاخْتَلَفُوا** (۱۰/۱۹) اور آپس میں اختلاف پیدا کر لیا۔ یہ ابتدائی اختلاف کیا تھا؟ یہ کہ وہ  
نسل کی بنیاد پر قبیلوں میں بٹ گئے اور **بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ** (۲/۳۶) اس طرح ایک دوسرے  
کے دشمن ہو گئے۔ اس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں جسے قرآن نے فساد کہہ کر پکارا ہے اور  
باہمی خونریزیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا (۲/۳۰-۲۶)۔ ان اختلافات کا مٹانا اور فساد انگیزیوں اور  
خونریزیوں کے بنیادی سبب کا ختم کرنا انسانوں کے اپنے بس کی بات نہ تھی۔ یہ اسی صورت میں ممکن  
تھا کہ انسان اپنے معاشرہ کو اقدارِ خداوندی کے مطابق متشکل کرے۔ اسی لئے کہا کہ **فَبَعَثَ اللَّهُ**  
**النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَ مُنذِرِينَ**۔ اس مقصد کے لئے خدا نے انبیاء کرامؑ کو بھیجنا شروع کیا جو  
لوگوں کو متنبہ کرتے تھے کہ اگر تم اسی طرح خاندانوں اور قبیلوں اور فرقوں میں بٹے رہے تو تباہ ہو  
جاؤ گے اور اگر تم اقدارِ خداوندی کے مطابق امت واحدہ بن گئے تو اس کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں  
اور سرفرازیاں ہوگا۔ **وَ أَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا**

اِخْتَلَفُوا فِيهِ (۲/۲۱۳) اس مقصد کے لئے ان انبیاء میں سے ہر ایک کو الکتاب (ضابطہ ہدایات و قوانین) بھی دیا تاکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے انہیں ایک امت کے قالب میں ڈھال دیں۔

یہ تھا عزیزان من! انبیاء کے بھینچنے اور ان کے ساتھ کتابیں نازل کرنے کا مقصد یعنی ان اختلافات کو مٹا کر جن کی وجہ سے نوع انسان مختلف خاندانوں، قبیلوں اور قوموں میں بٹ گئی تھی اور اس لئے باہمی خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کا شہرہ پھیل رہا تھا، اسے امت واحدہ (ایک عالمگیر برادری) بنا دیا جاتے۔ جو لوگ انبیاء کرام کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنے نسلی، قبائلی اور قومی امتیازات کو مٹا کر وحی کی رہنمائی کے مطابق امت واحدہ کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جاتے وہ ایک مرکز پر جمع ہو جاتے۔ جو اس دعوت کی مخالفت کر کے اپنے امتیازات کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف قبائل اور اقوام کی گروہ بندیوں کو قائم رکھنا چاہتے وہ ان کے برعکس دوسرے گروہ بن جاتے۔ اول الذکر کو امت مسلمہ یا جماعت مومنین کہا جاتا۔ یعنی امت واحدہ کے نظریہ کو تسلیم کرنے اور اس کی صداقت پر ایمان لانے والے۔ اور دوسری جماعت کو کفار کہا جاتا۔ یعنی اس نظریہ زندگی سے انکار کر کے نسلی اور قومی امتیازات کو برقرار رکھنے پر اصرار کرنے والے۔ اس طرح پوری نوع انسانی دو گروہوں میں بٹ جاتی۔ اسے برادران عزیز! دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ نظریہ نہ تو تحریک پاکستان کے دوران وضع کیا گیا تھا اور نہ ہی اسے حصول مملکت پاکستان کے لئے سیاسی حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ یہ اسلام کی خایت اور دین کا اساسی اصول تھا جو اس دن وجود میں آ گیا تھا جب خدا کی طرف سے سلسلہ وحی کا آغاز ہوا تھا۔ قرآن کریم میں اس سلسلہ زریں کی داستان کا آغاز حضرت نوح سے ہوتا ہے۔ انہوں نے اس دعوت کو پیش کیا تو ان کی قوم کے کچھ افراد اس پر لبیک کہہ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور باقی قوم نے اس نظریہ کی مخالفت کی۔ اس طرح ایک قوم کے بجائے دو قومیں وجود میں آ گئیں۔ ان دونوں قوموں کی نسل ایک تھی، زبان ایک تھی، قبیلہ ایک تھا، وطن ایک تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک قوم

لے جو لوگ کہتے ہیں کہ نبی بغیر کتاب کے بھی آسکتا ہے وہ قرآن کریم کی اس واضح آیت کی تکذیب کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ تمام انبیاء کو کتابیں دی گئی تھیں۔

نہیں رہی تھی۔ قومیں بن گئی تھیں۔ ان کے دو قومیں بن جانے کی بنیاد کیا تھی؟ بس ایک نظریہ کا اختلاف سے کہا جاتا ہے دین یا ایمان کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل۔ ان دو گروہوں میں یہ خلیج اتنی گہری اور ناقابل عبور تھی کہ جب حضرت نوح نے نسلی رشتہ کی بنیاد پر کہا کہ ان کا بیٹا ان کے اہل میں سے ہے تو خدا نے یہ کہہ کر ان کی غلط فہمی کو دور کر دیا کہ اِنَّهُ لَيْسَ مِنْ اٰهْلِكَ (۱۱/۴۶) وہ تیرے اہل میں سے نہیں کیونکہ وہ اس نظریہ پر ایمان نہیں لایا جسے تم نے پیش کیا ہے۔ یعنی نظریہ کے اختلاف سے۔ وطنی اور قبائلی تعلق تو ایک طرف، خاندانی اور نسلی رشتہ بھی باقی نہیں رہتا۔ باپ اور بیٹے کا رشتہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

قرآن کریم نے حضرت نوح کے بعد مختلف اقوام اور ان کی طرف بھیجے گئے انبیاء کرام کا ذکر کیا ہے اور وضاحت سے بتایا ہے کہ انہوں نے اس دو قومی نظریہ پر کس طرح عمل کیا اور اس کے نتیجہ میں ایک ہی وطن میں نسل، قبیلہ، زبان، رنگ اور خون کے اشتراک کے باوجود نظریہ کے اختلاف کی بنیاد پر دو قومیں وجود میں آتی رہیں۔ ان کا پیش کردہ معیار جس سے اپنے اور بیگانے کی تخصیص ہوتی تھی یہ تھا کہ

فَمَنْ تَبِعَنِي فَاِنَّهُ مِنِّي (۱۲/۴۶)

جو میرے مسلک کا اتباع کرتا ہے وہ میرا ہے (جو اس کے

خلاف چلتا ہے میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں)۔

یہ سلسلہ رشد و ہدایت اسی طرح جاری رہا، تا آنکہ آج سے چودہ سو سال پہلے سرزمین عرب میں اس نبی آخر الزماں کا ظہور ہوا جس پر دین کی تکمیل ہو گئی اور سلسلہ نبوت کا اختتام۔ خدا کے اس آخری حضور خاتم النبیین کے دور میں

کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں نہ کسی قسم کا شک و شبہ رہا نہ کوئی ابہام و التباس۔ اس نظریہ کی دو شقیں تھیں۔ ایک یہ کہ ایک ہی ملک میں بسنے والے ایک ہی زبان بولنے والے ایک ہی نسل سے متعلق افراد اگر اس نظریہ کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے تو وہ اس قوم کے افراد نہیں بن سکتے جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتی ہے۔ بالفاظ دیگر، مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے خواہ وہ ایک ہی وطن کے باشندے اور ایک ہی نسل کے افراد کیوں نہ ہوں اور

دوسری شق یہ تھی کہ ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر جو قوم (امت) متشکل ہوگی اس میں زبان، رنگ، نسل، وطن کی کوئی تخصیص باقی نہیں رہے گی۔ وہ سب ایک قوم کے افراد اور ایک تسبیح کے دانے ہوں گے۔ شق اول کا عملی مظاہرہ اس طرح ہوا کہ رنگ، نسل، وطن کا اشتراک تو ایک طرف حضورؐ کا حقیقی چچا ابولہب جس نے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا تھا اس قوم کا فرد تسلیم نہیں کیا گیا جو ایمان کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آئی تھی اور حضورؐ کے دو سرے چچا عباسؓ اور داماد ابوالعاصؓ بھی اس وقت تک اس جدید قوم میں شمار نہیں کئے گئے جب تک وہ ایمان نہیں لے آئے۔ جہاں تک دوسری شق کا تعلق تھا حبش کا بلال اور روم کا صہیب، فارس کا سلمان اور عرب کا ابوبکر رضی اللہ عنہم اجمعین، وطن، زبان، رنگ، نسل کے اختلافات کے باوجود ایک امت کے افراد قرار پائے اور ان میں ایسی وحدت اور یگانگت پیدا ہو گئی کہ اس کے بعد وطن، زبان، رنگ، نسل کی سابقہ نسبتوں کا تصور تک بھی ان کے ذہن میں نہ آیا۔ اس لئے کہ وہ جلتے تھے کہ خدا کی توحید پر ایمان کا عملی مفہوم امت کی وحدت ہے اور اس وحدت میں کسی قسم کی تفریق شرک ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ:

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ  
وَكَانُوا يَشِيعًا ۝ (۳۱-۳۲/۳۰)

مسلمانو دیکھنا! کہیں توحید پرست ہونے کے بعد پھر سے مشرک نہ بن جانا۔  
یعنی ان لوگوں میں نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور  
قوم مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔

تو اس تفرقہ سے مراد صرف مذہبی فرقہ پرستی نہیں، اس سے مراد ہے ہر قسم کی تفریق خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں۔ وہ ذاتوں اور برادریوں کے رنگ میں ہو اور خواہ "چار قومیتوں" کے پیکر میں جن کا آجکل نعرہ لگایا جاتا ہے یہ تمام اختلافات شرک ہیں اور چونکہ امت کی تشکیل رسول کی نسبت سے ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۵۹) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور اسی طرح امت واحدہ رہنے کے بجائے

مختلف گروہوں میں بٹ جائیں، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس باب میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کسی جنگ میں وہ (مسلمان) سپاہیوں میں کسی بات پر باہمی جھگڑا ہو گیا تو ان میں سے ایک نے سابقہ عادت کی بنا پر، غیر شعوری طور پر اپنے قیدیہ کو مدد کے لئے پکارا اور دوسرے نے اپنے قیدیہ کو حضور کے گوش مبارک تک یہ آواز پہنچی تو آپ فوراً خیمہ سے باہر تشریف لائے اور سخت براؤ و خنگی کے عالم میں فرمایا کہ ”تم لوگ ایمان لانے کے بعد پھر عہدِ جاہلیہ کی طرف پلٹ رہے ہو۔ یاد رکھو! یہ اسلام نہیں! اسلام وہ تھا جس کا اعلان حضور نے حجتہ الوداع کے خطبہ میں جو عالمگیر انسانیت کا منشورِ عظیم ہے ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ:-

عہدِ جاہلیہ کے تمام باطل نظریات میرے پاؤں تلے ہیں۔ یاد رکھو! تم سب ایک امت ہو۔ تمہارا رب ایک ہے۔ اصل کے اعتبار سے تم سب ایک ہو۔ اس لئے کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کسی قسم کی کوئی فضیلت نہیں بجز تقوے کے۔

یوں دین کی تکمیل ہو گئی۔ حضور کے بعد کچھ عرصہ تک امت، امت واحدہ ہی رہی۔ اس میں کسی قسم کا کوئی تفرقہ پیدا نہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد یہ گاڑی دوسری پٹری پر جا پڑی۔ **حضور کے بعد** اور سب سے پہلے اسی قبائلی تفریق نے سر نکالا جسے حضور نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ پہلے مملکتِ خلافتِ راشدہ تھی۔ اس کے بعد یہ بنو امیہ، بنی عباس، بنو فاطمہ کی قرار پائی۔ جب سلطنت اور حکومت کی نسبت قبائل کی طرف ہوئی تو مسلمان بھی امت واحدہ نہ رہے۔ مذہب کی دنیا میں یہ جس طرح فرقوں میں بٹی، اس سے قطع نظر، یہ قومی اعتبار سے ترکوں، مغلوں، عربوں، افغانوں، ایرانیوں میں بٹ گئی۔ پھر ان میں ذاتوں اور برادریوں کی تفریق درآئی۔ اب مسلمان اسلام کی طرف نسبت سے امتِ مسلمہ بننے کے بجائے سید، پٹھان، قریش، راجپوت، جاٹ، اعوان، اراٹیں کی نسبتوں سے الگ الگ برادریوں میں تقسیم ہو گئے یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیش نظر اقبال نے کہا تھا کہ

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو  
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اس طرح صدرِ اول کے بعد یہ امت، امت واحدہ نہ رہی۔ مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹ گئی۔ یہ چیز یقیناً موجب صد انتشار و تشتت تھی۔ لیکن اس کے باوجود ایک بات باعث اطمینان بھی تھی۔ اوردہ یہ کہ اس دوران میں دو قومی نظریہ کی دوسری شق بہر حال قائم رہی یعنی مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم کبھی نہ بنے۔ یہ کسز مغرب کے نظریہ قومیت نے پوری کر دی۔ اس نظریہ کی زد سے ایک ملک میں بسنے والے تمام افراد، بلا لحاظ مذہب و ملت، ایک قوم کے افراد قرار پائے گئے۔ اس نظریہ کو نیشنلزم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مغلوں کی حکومت کے زمانے تک اس نظریہ نے ہندوستان میں بار نہیں پایا تھا۔ اس وقت تک مسلمان، غیر مسلموں سے الگ ایک متعین اور منفرد قوم کے افراد تھے۔ انگریزوں نے اس نظریہ کو یہاں بھی عام کیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس کا چرچا برجگہ ہونے لگا۔ یہیں سے ہمارے سامنے وہ اقبال آتا ہے جس کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوتے ہیں۔

## نیشنلزم کی لعنت

اقبال کی پیدائش، تعلیم و تربیت اسی (غیر منقسم) ہندوستان میں ہوئی تھی جہاں کی فضا نیشنلزم کے پراپیگنڈے سے معمور تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہونہا طالب علم کا اس فضا سے متاثر ہو جانا فطری امر تھا۔ وہ انہی خیالات کو اپنے ذہن میں لئے مزید تعلیم کے حصول کے لئے ۱۹۰۵ء میں یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ وانا یان مغرب اس نظام نو کو نوع انسان کی مشکلات کا مداوا قرار دے رہے تھے۔ چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک و تہنیت کے تحائف پیش کئے جا رہے تھے۔ ان حالات میں ایک ایسے نوجوان طالب علم کو جو پہلے ہی نیشنلزم سے متاثر ذہن لئے کر یورپ گیا ہو، متشدد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن مورخ کی نگاہ یہ دیکھ کر حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ



چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا  
وہ گیا تھا تو یہ گنگناتا ہوا کہ

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیتا ہے!

اور واپس آیا تو یہ الپتا ہوا کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیر بن اسکا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ گیا تھا تو یہ سندیش دیتا ہوا کہ

سائے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا ہم پلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے!

اقبال کے قلب و دماغ میں اس قسم کا انقلاب کس طرح آیا تھا، اس کی وضاحت انہوں نے ۱۹۳۸ء میں (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ نظریہ و طینت کے موضوع پر بحث و تمحیص کے سلسلہ میں کی تھی۔ (اس معرکہ کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آتی ہے)۔ انہوں نے کہا تھا کہ وطن سے محبت اور

اس کی خیر سگالی کا جذبہ ایک فطری امر ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن

زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں "وطن" کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں

بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار

سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ

کا ایک قانون ہے اس لئے "وطن" کو جب ایک سیاسی تصور کے طور پر

استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے اور یہ وجہ ہے کہ میں

اس نظریہ قومیت کی مخالفت کرتا ہوں۔

چونکہ وطنیت یا قومیت کا یہ نظریہ اسلام کے نظریہ قومیت کے خلاف تھا، اس لئے اقبال نے

اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دیا کہ اس کے خلاف شد و مد سے جہاد کیا

اقبال کا جہاد | جاتے بانگِ درا میں وطنیت کے عنوان سے جو نظم زیبِ وہِ اوراق ہے

اور جسے اقبال نے یورپ سے واپسی کے بعد لکھا تھا، اس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا ہے کہ یہ نظریہ کس طرح اسلام کا نقیض اور نوع انسان کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔ اس نظم کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے تماماً آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں۔

اس فوڑ میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور      ساقی نے بنا کی روشنی لطف و ستم اور  
مسلم نے بھی تمعیب کیا اپنا حرم اور      تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیر میں اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدہ تہذیبِ نبوی ہے      غارت گر کا شانہ دینِ نبوی ہے  
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے      اسلام ترا ویس ہے تو مصطفوی ہے

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھاوے

اے مصطفویٰ خاک میں اس بُت کو ملائے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی      رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی  
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الہی      دے تو بھی نبوت کی صداقت کی گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے      تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے  
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے      کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بنتی ہے اس سے

قومیتِ اسلام کی بڑھکتی ہے اس سے

اقبال مسلسل اپنی اس پکار کو دہراتا رہا اور قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو (بالخصوص) اس نظریہ قومیت کی تباہ کاریوں اور فتنہ سامانیوں سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ کبھی وہ ان سے 'رمز و ایما کے انداز سے کہتا کہ

باوطن وابستہ تقدیرِ اُمم      برنسب بنیا و تمعیبِ اُمم

ملت مارا اساس دیگر است این اساس اندر دل ماضی است

اور کبھی اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کرتا .... کہ  
اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی  
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری  
دامن دین ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں  
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اقبال کا یہ پیغام، ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں تھا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے  
اسلام کا اصول قومیت یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ وہ کسی خطہ زمین میں بستے ہوں ایمان  
کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ محض ایک قوم کے افراد نہیں، ایک دوسرے کے بھائی  
۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۲۹/۱۰)۔ شُرَّانَ كَا ارشاد ہے۔ اس اخوت کو اس  
کے کتاب اللہ سے وابستگی کا لازمی نتیجہ اور خدا کی خصوصی نعمت قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ۔  
فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (۳/۱۰۳) خدا نے تمہیں اپنی نعمت کی رو سے بھائی بھائی بنا دیا۔  
اس اخوت کی بنا پر یہ امت کسی ایک خطہ زمین میں محدود و محصور نہیں تھی۔ مسلمان جہاں بھی تھا،  
دنیا کے کسی خطے میں بھی سکونت پذیر تھا، دنیا کے باقی مسلمانوں کا بھائی اور امتِ مسلمہ کا فرد تھا۔  
تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے اجزاء تھے۔ بنا بریں، جس طرح نسلی وابستگی کی بنا پر مسلمانوں  
کی الگ الگ قومیت کا تصور خلاف اسلام ہے، اسی طرح جغرافیائی حدود (یعنی وطن کی نسبت)  
کی بنا پر ان کی جداگانہ قومیتوں کا نظریہ بھی دین کی نقیض ہے۔ اقبال نے جو اسلام کی اس عالمگیر  
دعوت کا گہرا احساس رکھتا تھا، اپنے اس پیغام کو ہندوستان کی  
**عالمگیر امت** چار دیواری سے آگے لے جا کر پورے کے پورے عالم اسلام تک پھیلایا۔  
اس نے ۱۹۲۲ء میں جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور ترکی کی بالخصوص،  
حالت بڑی سقیم ہو رہی تھی، جملہ عالم اسلام کو مخاطب کر کے کہا کہ یاد رکھو! ہماری نکتہ و زبوں حالی کا  
ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ ۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کھلے نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کا شہر  
جو کریگا امتیاز رنگ و فون مٹ جائے گا ترکِ خردگاہی ہو یا اعرابی والا گہر  
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی  
اڑ گیا دنیا سے تو مانسِ خاک رہ گذر

اور اس سے اگلے سال (۱۹۲۳ء میں) انہوں نے اپنی مشہور نظم 'طلوعِ اسلام میں انہی اقوام کو مخاطب کر کے کہا کہ

ہوس لکڑے لکڑے کھڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو  
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی و تورانی  
نخوتِ کابیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا  
تو لے شرمندہ ساحل اچھل بیگاں ہو جا  
غبارِ آلودہ رنگِ نسب میں بالِ پر تیرے  
تو لے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اس سلسلہ میں 'بیں عزیزانِ من! آپ کی توجہ ایک عظیم حقیقت کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں ہم میں سے کون ہے جسے اس کا علم و احساس، بلکہ شکایت نہیں کہ دوسرے ملکوں کی مسلمان سلطنتوں نے ہم ہندو پاک کے مسلمانوں کے مصائب و آلام میں بالعموم اس ہمدردی اور یگانگت کا ثبوت بھی نہیں دیا جس کی ان سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہماری کیفیت یہ ہے کہ اگر افریقہ میں کسی حبشی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو ہماری آنکھ کے آگینے سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ آپ نے کبھی

## ہمارا احساسِ نخوت

اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اس حکیم الامت نے اسلام کی عالمگیر نخوت کا وہ پیغام دیا ہے جو نسلِ رنگِ وطن کی حدود و ثغور سے ماورا ہے اور جو ہماری ملت کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ اس لئے مسلمانانِ عالم پر کہیں مصیبت آئے، غیر شعوری طور پر ہمارے قلوب وقفِ اضطراب اور ہماری آنکھیں خونناہ فشاں ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۱۲ء کے جنگِ طرابلس میں ایک عرب لڑکی 'فاطمہ بنت عبد اللہ غازیوں کو پانی پلائی ہوئی شہید ہو گئی تو اس کی یاد میں اقبال نے جو نظم جو سچکاں لکھی، اس کے سننے سے آج بھی حساس قلوب سینوں میں تڑپ اٹھتے ہیں! اس میں انہوں نے کہا تھا کہ:-

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے  
 یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی  
 ذرہ ذرہ تیری مشیتِ خاک کا معصوم ہے  
 غازیانِ دین کی سقائی تری قسمت میں تھی  
 اس کے بعد اقبال نے یہ نہیں کہا کہ ایسی سچی عربی نسل یا طرابلسی قوم کے لئے باعثِ فخر ہے کہہا یہ  
 کہ فاطمہ خود ہماری سچی تھی۔ وہ صدقِ امتِ مسلمہ کا گواہ بنا داری تھی۔ اس لئے اس کا یہ کارنامہ ساری  
 امت کے لئے باعثِ صد شرف و عزت ہے۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزانِ منظر میں تھی  
 اپنے صحرائیں بہتا ہوا بھی پوشیدہ ہیں  
 ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکتہ تھی  
 بجلیاں بسے ہوئے بادل میں بھی پسند ہیں  
 اور شاہی مسجد (لاہور) کے ضمن میں وہ قیامت بھی تو جنگِ طرابلسی کے شہیدوں کی یاد میں برپا  
 ہوئی تھی جس کے تصور سے آج بھی جگر کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شہداء  
 طرابلس کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے شاہی مسجد میں ایک اجتماعِ عظیم منعقد ہوا  
 جس میں علامہ اقبال سے نظم کی فرمائش کی گئی۔ وہ ان شہداء کے غم سے نڈھال تھے۔ اقبال نے خیزاں  
 سیلج پر آتے اور اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں حضور رسالتاً میں اپنی حاضری کا نقشہ اس طرح کھینچا

کہ جب میں خدمتِ بابرکت میں پہنچا تو حضور نے فرمایا کہ  
 نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بُو آیا  
 ہمارے واسطہ کیا تحفہ لے کے تو آیا

تو میں نے (اقبال نے) بصدِ احترام عرض کیا کہ!  
 حضور! وہر ہیں آسودگی نہیں ملتی  
 تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی  
 وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی  
 ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں

لہذا ان حالات میں میں ایسا تحفہ کہاں سے لاتا جو حضور کے شایانِ شان ہوتا۔  
 مگر میں نذر کو اک آبیگنہ لایا ہوں  
 جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس پر مجمع کا کیا حال ہوا ہوگا، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اور ۱۹۲۲ء میں جب یونانیوں نے ترکوں کو شکست دی ہے تو اسلامیہ کالج (لاہور) کے

میدان میں اقبال نے جس درد و کرب سے اپنی نظم — خضر راہ — پڑھی تھی اس کی یاد آج بھی خون کے آنسو رلاتی ہے۔

لے گئے تھیلٹ کے فرزند میراثِ خلیل  
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز  
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ  
جو سرِ اپانا زتھے ہیں آج مجبورِ نیاز  
اور انتہائی مایوسی کی اس تاریک فضا میں اس امیدوں کے شہزادے نے آخر میں یہ پیغام دیا کہ  
مسلم استی! سینہ رازِ آرزو آباد دار  
ہرزماں پیشِ نظر لایِ مَخْلِفُ الْمُنْعَادِ دار

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ پیغام حیات بخش دیتے وقت اس دیدہ و رک کی نگہ دور رس نے اس انقلاب کو بے نقاب دیکھ لیا تھا جو اس وقت ضمیر کائنات میں پہلو بدل رہا تھا اور جس کی رو سے دوسرے ہی سال ترکوں نے یونانیوں کو شکستِ فاش دے کر اپنے لئے حیات نو کا سامان پیدا کر لیا تھا۔ ترکوں کی اس محیر العقول کامیابی پر اقبالؒ طرب و نشاط کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لے کر قصاں و فرحاں جس طرح ایٹج پر آیا اور جوشِ مست میں جس ولولہ اور طنطنہ سے اپنی نظم، طلوعِ اسلام پڑھی اس کی یاد کبھی دلوں سے محو نہیں ہو سکتی۔ آتے ہی کہا کہ

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی  
افق سے آفتاب بھرا گیا اور گراں خوابی  
عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا  
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

اور  
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے  
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

جب تک اقبال نے اسلام کے معیارِ قومیت کے پیغام کو ہندی مسلمانوں تک محدود رکھا۔ یورپ کی مخالفت اس کے خلاف کوئی ایسا ردِ عمل نہ ہوا۔ اسے محض ایک شاعر کا خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں یہاں کی سیاسی فضا پر اس کا کچھ اثر نہیں تھا۔ لیکن جب اس نے اس پیغام کو دیگر مسلم ممالک تک پہنچایا تو مغربی سیاست کے ہرہ بازوں کے دل میں اس سے طرح طرح کے خطرات نمودار ہوئے۔ ان

خطرات کی وضاحت علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کی تھی:-

مجھے یورپ میں مصنفوں کی تحریروں سے ابتر اور ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں "افرنکی نظریہ وطنیت" کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی۔

(بیان: مولانا حسین احمد کے جواب میں)

یہ تھی مغربی اقوام کی وہ سازش جس کے لئے مہرہ بازانِ افرنگ، پیغامِ اقبال میں خطرہ محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے مفکرین نے گو سفندانہ ہمدردی کے لباس میں اُسے یہ طعن دیا کہ وہ اپنے عالمگیر انسانیت کے پیغام سے ہٹ کر، اس قسم کی "فرقہ وارانہ" تنگنائے کی طرف کیسے چلا گیا؟ پروفیسر نکلسن کے نام علامہ اقبال کا خط اس سازش کی غمازی کرتا ہے جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ:-

اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ایس کی اس احتراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے دنیا کے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوعِ انسان کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب

سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فریضہ سارے بنی آدم کی نشوونما کا ہے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے محبت ہے لیکن مسٹر نکلسن کا یہ خیال درست نہیں کہ میں نے محض اس کی محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخالف ٹھہرایا ہے حقیقت یہ ہے کہ علی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخالف قرار دیا جائے کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔۔۔۔۔

دور و فلاح انسانیت کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس نظر پر کو پہلے ایک ایسی سوسائٹی تک محدود کر دیا جائے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

جس عملی ضرورت کے پیش نظر علامہ اقبال نے اپنے عالمگیر پیغام کو ابتداءً مسلمانوں تک محدود رکھنا ضرور سمجھا۔ اسی قسم کے تقاضا نے انہیں

## ہندوستان میں سیاسی تغیرات

اس پر مجبور کیا کہ وہ اس دائرے کو پہلے مسلمانوں تک محدود کر دیں۔ اس کی وجہ اس زمانے میں ہندوستان میں سیاسی تغیرات کی نمود تھی۔ انگریزوں کے اپنے حالات سے مجبور کر رہے تھے کہ مملکت ہند میں زیادہ سے زیادہ اختیارات اہل ہند کی طرف منتقل کر دے۔ ہندو نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور وطنیت کی بنا پر نظریہ قومیت کو عام کرنا شروع کر دیا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ۔

(۱) ہندوستان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام لوگ بلحاظ مذہب و ملت ایک قوم کے افراد ہیں۔

(۲) حکومت کے اختیارات اس قوم کی طرف منتقل ہوں گے۔

(۳) یہاں جمہوری نظام رائج کیا جائے گا جس میں مملکت سے متعلق تمام فیصلے اکثریت کی آراء سے ہوتے ہیں۔

(۴) اور یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اکثریت ہندو کی تھی اور ہندو ہی کی رہنی تھی۔



(۵) اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کے محکوم رہیں۔ یہ تھا یہاں کے بدلتے ہوئے حالات کا فوری تقاضا جس کی وجہ سے علامہ اقبال کو اپنی تمام تر توجہ مسلمانان ہند پر مرکوز کر دینی پڑی اور انہوں نے نہایت شد و مد سے اس حقیقت کو عام کرنا شروع کر دیا کہ وطنیت کے معیار کے مطابق قومیت کی تشکیل اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر ایک منفرد اور مستقل بالذات قوم ہیں اور یہاں کے غیر مسلم ان سے الگ دوسری قوم کے افراد۔

آپ نے دیکھا براہِ دران عزیز! کہ دو قومی نظریہ نہ تو کسی ہنگامی سیاسی تقاضا کی پیداوار تھا اور نہ ہی اسے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے لئے حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ دو قومی نظریہ اس دن وجود میں آیا تھا جس دن خدا نے پہلی وحی عالم انسانیت کی طرف بھیجی تھی۔ یہ دین خداوندی کا اساسی اصول ہے اور توحید اور شرک میں خط امتیاز۔ اشتراک دین کے سوا کوئی بھی معیار قومیت ہو وہ اسلام کے خلاف ہے۔ اقبال نے اس نظریہ قومیت کی نشاۃ اشاعت یورپ سے واپسی کے بعد شروع کر دی تھی۔ وہ ساری عمر اس پیغام کو عام کرتے رہے۔ ان کے اس پیغام کے

## ہندو کی طرف سے مخالفت

مخاطب کسی خاص خطہ کے مسلمان نہیں تھے، ساری دنیا کے مسلمان تھے۔ لیکن جب اقبال نے دیکھا کہ ہندوستان کے سیاسی تغیرات اس تیزی سے رونما ہو رہے ہیں کہ اگر یہاں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے نظریہ کو خصوصیت کے ساتھ عام نہ کیا گیا تو نیشنلزم کی رو سے یہاں مسلمانوں کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ تو انہوں نے اس خطہ زمین کو اپنے پیغام کا اولین مخاطب قرار دے دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اگر ہم یہاں اس نظریہ کو عمل میں لانے کے قابل ہو گئے تو یہ چیز باقی ممالک اسلامیہ کے لئے نظیر بن جائے گی اور اس طرح یہاں کی مسلم قوم عالمگیر امت مسلمہ کی تشکیل کے لئے ذرۃ اولین (FIRST) کا کام دے گی۔

جب ہندو نے دیکھا کہ اقبال کا پیغام کس طرح ان کے اس خواب کو جس کی رو سے وہ مسلمانان ہند کو ابھی طور پر اپنا محکوم رکھنا چاہتا تھا، خواب پریشاں بنا دے گا تو اس نے اس کی مخالفت کی اور سخت مخالفت اقوام مغرب مسلمانان عالم کے امت واحدہ بن جانے میں اپنے

استعمار کے لئے خطرہ محسوس کرتی تھیں اس لئے انہوں نے اسے مذہبی جنون قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی مذمت اور مخالفت کی۔ ہندو نے مسلمانانِ ہند کے ایک الگ اور منفرد قوم کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اپنے سیاسی تغلب کے منصوبے بکھرتے دیکھے اس لئے اس نے بھی اس کی مخالفت کی۔ یہ ہے ہندوستان میں نیشنلزم اور دو قومی نظریہ کی کشمکش کی تمہید۔ یاد رہے کہ ہندو کے نزدیک تو دو قومی نظریہ کی مخالفت نہ کہ سیاسی نوعیت کی تھی، لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس نظریہ پر اصرار ان کے دین کا تقاضا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دینی تقاضا کے پورا ہونے سے انہیں سیاسی مفاد بھی حاصل ہو جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں ملت کے سیاسی مفادات اتباعِ دین کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی دنیا ان کے دین سے الگ نہیں ہوتی۔ آئیے اب دیکھیں کہ ہندوستان میں نیشنلزم اور دو قومی نظریہ کی یہ جنگ کیسے لڑی گئی!

یہ حقیقت بڑی جگر پاش اور اس کا تذکرہ بڑا جاں سوز ہے کہ مخالفین نے جب بھی اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا ہیتہ کیا تو اس مقصد کے لئے انہیں خود مسلمانوں میں سے آلہ کار مل گئے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، دو قومی نظریہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے تھا اور ہندو کی طرف سے اس کی مخالفت سیاسی وجوہ پر تھی۔ لیکن اسے خود ہندی مسلمانوں میں ایسے لوگ مل گئے جو اس نظریہ کی مخالفت میں ہندوؤں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ ان میں بعض لوگ **نیشنلسٹ مسلمان** تو محض سیاسی حیثیت کے حامل تھے اور سیکولر حکومت کے قائل۔

ان کی طرف سے اس نظریہ کی مخالفت قابلِ فہم تھی اگرچہ یہ امر موجبِ تاسف تھا کہ مسلمان ہوتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ المناک اور زہرہ گداز یہ سانچہ تھا کہ ان مخالفین کی قیادت مذہبی پیشواؤں یعنی نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ہندو مسلمان تھا کہ مسلمان اپنے جس دعویٰ کو مذہب کی بنیادوں پر پیش کر رہے ہیں اس کی مخالفت خود انہی کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ یہ مخالفت اپنے انتہائی نکتہ پر اس وقت پہنچی جب شروع ۱۹۳۸ء میں (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے دہلی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ قومیتیں **معرکہ دین و وطن** | اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں۔ ہندوستان کے سب سے بڑے

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان، کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جاسکتا۔ علامہ اقبال اس زمانے میں یوں کہتے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے جب انہوں نے اس نعرہ جاہلیہ کو سنا تو ان کے دل صدچاک سے ایک آہ اُبھری جو ان الفاظ کی شکل میں فضا کو چیرتی ہوئی آں سوتے افلاک تک جا پہنچی کہ :-

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ      زد یوبند حسین احمد ایں چہ بولہجی است  
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است      چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است  
مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمراہ است  
اگر باؤنر سیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں "مصطفیٰ برساں خویش را" کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن امت کی تشکیل اس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو ان افوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے اسلام کے پیرو، امتِ محمدیہ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پا جاتے تو رسول سے نسبت ختم ہو جاتی ہے اور جب رسول سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں، اس حقیقت پر قرآن کی وہ آیہ جلیلہ شاہد ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَہُمْ وَ کَاوُوا شِیْعًا لَّسَتْ مِنْہُمْ فِیْ شَیْءٍ ﴿۱۵۹﴾ جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کریں اور اس طرح الگ الگ گروہ پارٹیاں تو ہیں بن جائیں اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ یعنی اگر قومیت کی اساس رسول اللہ کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا رسول سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے اسی بنا پر علامہ اقبال نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے رسول اللہ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت کی نسبت وطن کے بجائے حضور نبی اکرم کی طرف کرو۔ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمراہ است۔ اگر باؤنر سیدی۔ اگر تم نے اپنی نسبت حضور کی طرف نہ کی تو۔ تمام بولہبی است۔ پھر دیں باقی نہیں رہتا۔ بولہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف جاتی ہے۔

علامہ اقبال کی یہ تنبیہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی اور ان کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے بجائے مولانا مدنی نے اپنے دعوے کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے وہ بیان شائع کیا جو ”معرکہ دین و وطن“ کے نام سے مشہور ہے اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابل تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ مروری زمانہ سے یہ دستاویز (بالعموم) نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے اور پاکستان میں وطنیت کی تحریک پھر سے ہانڈاز نو اُبھاری جا رہی ہے اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے اہم حصے سامعین کے گوش گزار کر دیئے جائیں۔ ان حقائق کی اہمیت کے پیش نظر ان اقتباسات کی طوالت کے لئے مجھے معذرت خواہ ہونے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ علامہ اقبال نے سب سے پہلے یہ کہا کہ:-

مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام، ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راہنی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا:-

کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے پیغمبر تھے جن کی وحی میں قوموں، نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا، نوعِ آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی۔ یعنی موجد اور مشرک، اس وقت تک صرف دو ہی ملتیں دنیا میں ہیں تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبہ اللہ کے محافظ آج دعوتِ ابراہیمی اور دعوتِ اسماعیلی سے غافل ہو گئے۔ قوم اور

لئے سب سے پہلے پیغمبر صرف اس اعتبار سے کہ آپ نے تعمیرِ کعبہ سے امتِ مسلمہ کے لئے ایک محسوس مرکز کی بنا رکھی اور نہ دو قومیتوں کی بنیاد تو خدا کی طرف سے اولین وحی نے رکھ دی تھی جو حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے کی بات ہے۔

قومیت کی ردا اور ٹھننے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعایا دہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی تھی۔ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمِیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص (۱۲۷-۱۲۸/۲) کیا خدا کی بارگاہ سے امت مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش تھی کہ آپ کی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی حصہ کسی عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا۔ امت مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ الکفر ملّۃ واحدہ کی ہے۔

اس اصولی حقیقت کی وضاحت کے بعد کہا۔

اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابل قدر تھا تو رسول اللہ کے بعض اقارب ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرغائش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول اللہ نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت، ابو جہل اور بلہب کو اپناتے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت و وطنی قائم رکھی۔۔۔۔۔ محمد (فداہ و ابی و اُمّی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمد کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب امت مسلمہ یا مملت محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے۔ اب ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا۔

کہے کو سچہ زد ملک و نسب را      نہ داند نکتہ دین عرب را  
اگر قوم از وطن بودے، محمدؐ      ندا دے دعوت یوں بولہب را  
حضور رسالتما ب کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ بولہب یا ابو جہل یا کفار مکہ

سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بُت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر حضور (غوثِ بائند) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی، نبی آخر الزماں کی راہ نہ ہوتی۔

آپ نے غور فرمایا برادرانِ گرامی قدر! علامہ اقبال نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریہ قومیت کو کس طرح اُبھارا اور نکھار کر بیان کر دیا ہے۔ لیکن ابھی اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں: دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن امت کی تشکیل اس نبی کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا ہوں لیکن موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے آج پھر دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ امت کی تشکیل اس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جسے سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے۔ مثلاً ایک عیسائی حضرت عیسیٰ اور ان سے پہلے کے جملہ انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ حضرت عیسیٰ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے یعنی نبوت کو حضرت عیسیٰ کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے اس لئے وہ امتِ حضرت عیسیٰ کا فرد (یا عیسائی) کہلاتا ہے لیکن جو نبی وہ حضرت عیسیٰ کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمد رسول اللہ) پر ایمان لے آتا ہے وہ امتِ عیسوی سے کٹ کر ایک نئی امت یعنی امتِ محمدیہ کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی اصول کی رو سے اگر کوئی شخص محمد رسول اللہ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ امتِ محمدیہ سے کٹ کر ایک نئی امت کا فرد قرار پاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ جس طرح رسول اللہ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ امتِ محمدیہ سے کٹ جاتا ہے اسی طرح نسل یا وطن کو قومیت کی راہ اس قرار دینے سے بھی امتِ محمدیہ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا۔ انہوں نے کہا کہ:-

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریہ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی انکار میں انکارِ خاتمیت

کانظریہ وطنیت کے حامی بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امت مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانون الہی ابدالاباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے کوئی اور حیثیت بھی اختیار کر لے۔ جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوت محمدؐ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہ اسی طرح وطنیت کانظریہ بھی امت مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبال نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن بانسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور ذات رسالتماں سے اپنا رشتہ منقطع کر کے ایک جدید امت پانٹے دین کو جو ہیں لانے کے مرادف بن جاتا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنے اس بیان میں متنبہ کیا تھا کہ اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رکھ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تولادینی ہوگی اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی۔

آنے والا مورخ جب اس دور کی تاریخ پر نگاہ ڈالے گا تو وہ یہ دیکھ کر یقیناً محو حیرت رہ جائے گا کہ علامہ اقبال نے جو کہا تھا کہ وطنیت کی اساس پر قومیت کا تصور اسلام کی اصولی تعلیم کے خلاف ہے تو اس حقیقت کو نہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی سمجھے اور نہ ہی دیگر پیشلسٹ علماء (جن میں مولانا ابوالکلام آزاد مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور علمائے مجلس احرار جیسے نامور مذہبی رہنما سب شامل تھے) لیکن اسے سمجھا تو ہندو راہنماؤں نے سمجھا۔ چنانچہ جس زمانہ میں متحدہ قومیت کا مسئلہ بحث و نزاع کا مرکز بن رہا تھا، لالہ لاجپت رائے نے (جو اسی لاہور کے رہنے والے بڑے تشدد ہندو تھے) مسٹری آر۔ داس کو ایک خط میں لکھا (جو اخبار مرہٹہ کی ۲۲ فروری ۱۹۲۰ء

## ہندو لیڈروں کا اعتراف

کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) کہ:-

ایک اور چیز جو کچھ عرصہ سے میرے لئے بے حد وجہ اضطراب ہو رہی ہے ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور و فکر دوں۔ گذشتہ چھ ماہ میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ چیز (یعنی ہندو مسلم اتحاد) ایک امرِ محال اور ناقابلِ عمل شے ہے..... میں تہ دل سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں۔ اس کے لئے میں مسلمان راہنماؤں پر اعتماد کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کریں گے؟ مسلمان راہنما ان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔

لیکن مسلمانوں کے مذہبی راہنماؤں نے سینہ تان کر کہا کہ قرآن و حدیث کے احکام پر خطِ تنسیخ کیوں نہیں کھینچا جاسکتا؟ ہم ہزار برس سے یہی کچھ کرتے چلے آتے ہیں، اب بھی یہی کریں گے۔ لالہ لاجپت رائے کے اسی خیال کی تائید میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن مسٹر این بی۔ وٹ نے اپنی کھلی چٹھی میں (جو اخبار دینہ کی یکم فروری ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی) لکھا کہ ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری سانس تک مسئلہ قومیت کی اسلامی نقطہ نگاہ سے وضاحت کرتے رہے اور اسی کی بنیاد پر انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا۔ وہ ملتِ اسلامیہ کو یہ پیغام دیتے دیتے عالمِ جاوداں کی طرف سدھا گئے اور اس شمع کو ایسے ہاتھوں میں دے گئے جن کی امانت و دیانت پر انہیں پورا پورا اعتماد تھا۔ یہ ہاتھ تھے اللہ کے بندے محمد علی جناحؒ کے جنہیں ملتِ اسلامیہ نے قائدِ اعظم کے برجستہ موزوں ترین اور ان کے شایانِ شان لقب سے پکارا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ!

میں نے شروع میں کہا ہے کہ اقبالؒ ہندوستان سے گیا تو "میرا وطن، میرا وطن" کہتے ہوئے



اور انگلستان سے واپس آیا تو اس نظریہ وطنیت کو انسانیت اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن اور اہلیس کی اختراع قرار دیتے ہوئے۔ اقبال کی زندگی میں یہ انقلاب بڑا تیز انگیزہ ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ حیرت افزا اور تعجب انگیز ہے وہ انقلاب جو محمد علی جناح کی زندگی میں رونما ہوا۔ وہ نہ صرف

## جناح کی زندگی کا عظیم انقلاب

یہ کہ عقیدہ وطنیت پر نظری طور پر اعتقاد رکھتے تھے۔ بلکہ عملاً بھی ان کا شمار کانگریس کے بلند ترین رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ بمبئی کا "جناح کانگریس ہال" آج بھی ان کے عقیدہ وطنیت کی یاد تازہ کرتا ہے۔ حیرت ہے کہ اقبال کی نوجو دور رس نے کیسے بھانپ لیا کہ مسلمانوں کے لئے دوقومی نظریہ کی بنا پر ایک جداگانہ مملکت کا حصول اس شخص کے ہاتھوں ممکن ہوگا جو اس قدر کٹر وطن پرست اور صرف اول کانگریسی تھا۔ اسے کہتے ہیں دیدہ وری اور مومنا نہ فرست! قائد اعظم کے سولہ حیات کا مرتبہ ہکتور بولیتھو (HECTOR BOLITHO) اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ اپنے قیام انگلستان کے دوران مسٹر جناح نے اقبال سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ نہایت اچھے دوست تھے لیکن اس کے باوجود جناح نے اقبال کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہ کیا۔ اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔ (ص ۹۹) معلوم نہیں اقبال نے کس کس طریق سے جناح کو (CONVERT) کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کی کوششیں جلد نتیجہ خیز نہ ہوئیں۔ لیکن انہوں نے وہ امن امید کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس کے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں جناح کی ذات پر کس قدر بھروسہ اور اپنی مساعی کے بار آور ہونے پر کس قدر یقین محکم تھا۔ برسوں کی کوششوں کے بعد انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو جناح کو وہ خط لکھا جو ان کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ

میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف انسان ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا آپ پر گراں نہیں گزرتا ہوگا۔ (میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے) کہ میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں

لے اس سے غالباً یہ مراد ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کی الگ مملکت کا جو تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا اسے قائم کرنے میں قرارداد پاکستان کی شکل میں متعین کر دیا۔

جس کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے اس کی کشتی کو ثابت و سالم بہ امن و عافیت ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔ (ص ۱۱۵)

یہ تیر، اقبال کے قلب سے نکلا اور اور سیدھا جناح کے دل میں پیر گیا۔ اور پھر اقبال اپنے پیغام کی شمع جناح کے ہاتھوں میں دے کر نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ یہ کہتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا کہ

پس از من شعر من خوانند و دریا بند و می گویند  
جہا نے را دگر گوں کرد یک مرد خود آکا ہے

میرے نزدیک نیشنلسٹ جناح میں یہ نظریہ تغیر پیدا کرنا، اقبال کا اتنا بڑا احسان ہے جس سے ملتِ اسلامیہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

قائد اعظم نے اس جنگ کو دس سال تک جاری رکھا اور بالآخر نہ صرف ہندوؤں سے بلکہ ساری دنیا سے اس حقیقت کو منوالیا کہ مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر ایک جداگانہ قوم ہیں اور ایک الگ آزاد مملکت کے مستحق۔ چونکہ آج کی نشست میں میرا موضوع علامہ اقبال اور دو قومی نظریہ ہے، اس لئے میں اس وقت اس جنگ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جو قائد اعظم نے دس سال تک لڑی۔ اس کی تفصیل میں گذشتہ پچیس سال سے بیان کرتا چلا آ رہا ہوں اور آئندہ بھی بتوفیق ایزدی مناسب مواقع پر بیان کرتا رہوں گا کہ یہ جنگ درحقیقت دین و وطن کی آویزش اور کفر و اسلام کا معرکہ تھا جسے بیان کرنا میری زندگی کا مشن ہے۔

قائد اعظم نے دس سال تک یہ جنگ لڑی اور بالآخر پاکستان وجود میں آ گیا۔ یہاں سے پھر ایک ایسی داستان کا آغاز ہوتا ہے جو سابقہ داستان سے بھی زیادہ حیرت افروز، عبرت انگیز اور اس کے ساتھ ہی جگر سوز اور دل دوز ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، دو قومی نظریہ کی دو شقیں تھیں۔ ایک یہ کہ غیر مسلم اور مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے اور دوسری شق یہ کہ تمام مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر امت واحدہ (ایک قوم) ہیں۔ نسل، وطن، زبان، ثقافت وغیرہ کے اختلاف سے یہ مختلف قومیتوں اور گروہوں میں نہیں بٹ سکتے۔ قائد اعظم کی وفات ۱۹۴۸ء میں ہو گئی اور اس کے بعد جب مملکتِ پاکستان کے لئے آئین

مرتب کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو دنیا یہ دیکھ کر محو حیرت رہ گئی کہ اس میں پہلی شق کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ یعنی پاکستان کی حدود میں بسنے والے تمام باشندوں۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں۔ کو ایک قوم قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھی بلکہ اس دعوے کے بھی خلاف جس کی بنا

## حصولِ پاکستان کے بعد

پر ہم نے ایک الگ مملکت حاصل کی تھی۔ اس سے ہم نے وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے دیا اور اس طرح پاکستان کی وجہ جواز کی خود ہی نفی کر دی۔ یہاں پچیس سال سے آئین سازی کی ہم جاری ہے۔ مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ مطالبہ کرنے والوں میں سے آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ وطنیت کی بنیاد پر تشکیلِ قومیتِ اسلام کو جو بنیاد سے اکھڑتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت بالعموم ان علماء (یا ان کے شاگردوں) پر مشتمل ہے جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ یہ لوگ وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے کر نہ صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ان کا (یا ان کے اساتذہ کا) موقف صحیح تھا بلکہ حصولِ پاکستان سے انہیں جو شکست پندار ہوئی تھی اس کا انتقام بھی لینا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں متحدہ قومیت کی تشکیل سے سب سے زیادہ نقصان مشرقی پاکستان میں ہوا۔ ایک تو اس لئے کہ وہاں غیر مسلموں (ہندوؤں) کی آبادی کثیر تھی اور دوسرے اس لئے کہ وہاں غیر مسلم بڑی موثر حیثیت رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہاں کی اقتصادیات اور سیاست ان کے ہاتھ میں تھی، مسلمان بچوں کی تعلیم کے نگران بھی وہی تھے۔ تعلیم کی بات چلی ہے تو اس سے ایک اہم نکتہ سامنے آگیا۔ وطن یا نسل کو بنائے قومیت قرار دینے سے قوم کی تشکیل کے لئے کسی قسم کی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بزرگچہ پیدائشی طور پر اس قوم کا فرد ہوتا ہے لیکن کسی نظریہ کی بنا پر قوم کی تشکیل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کے بچوں کو اس نظریہ کی تعلیم دی جائے۔ ہم نے نہ صرف یہ کہ تعلیم کے اس اہم مقصد سے اغماض برتا بلکہ اپنی نژادوں کی تعلیم ان لوگوں کے ہاتھ میں دیدی جو اس نظریہ کے مخالف تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری نئی نسل وہ ذہنیت لے کر ابھری جس کی ترجمانی ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم، عزیز الرحمن نے اپنے اس خط میں کی تھی جو ۱۹۶۹ء میں وہاں کے اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا رہا کہ مسلمان مذہب کی بنا پر ہندوؤں سے الگ تو ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ :-

ہم شری جیتنا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیرو کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موٹے اور علی جمیلوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا۔ یعنی اللہ۔ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نور اللہ اور غلیل اللہ جیسے ناموں پر ریچھ گئے اور ناگنی، کھاگنی جیسے سید سادے ناموں کو تیاگ دیا۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا کہ

اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہونا جا رہا ہے اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اونا دیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھا رہے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس حصہ پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کیا تھے۔ کوئی اس کی وجہ اقتصادی استحصال قرار دیتا ہے کوئی سیاسی غلطیاں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ لیکن کسی کی نگاہ اس حقیقت تک نہیں پہنچتی کہ اس کا غیباوی سبب ہمارا یہ غلط اقدام اور غلط تعلیم ہے جس کی رو سے ہم نے وطنیت کو معیار قومیت قرار دے لیا ہے۔ جب آپ وطن کو معیار قومیت قرار دے لیں گے تو جس علاقے کے لوگ چاہیں گے اپنے علاقہ کو اپنا وطن قرار دے کر اپنے آپ کو جداگانہ قوم قرار دے لیں گے اور جب وہ ایک الگ قوم بن جائیں گے تو اس کے بعد ان کی جداگانہ مملکت کا دعویٰ اور مطالبہ جائز قرار پائے گا۔ ہم مشرقی پاکستان کی

**مغربی پاکستان میں وطنیت کا تصور** | علیحدگی کو رو رہے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ مغربی پاکستان بھی اسی راستے پر چلا جا رہا ہے جس پر مشرقی پاکستان چل رہا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۶۸ء میں کراچی کی عوامی ادبی انجمن

کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس میں منجملہ دیگر "وانشوران قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا:-

ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختار ترقی کر سکیں..... ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

یہ پہلی چنگاری تھی جو مغربی پاکستان کے نیستان ملت میں پھینکی گئی۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ اس تیزی سے بھڑکی کہ اب اس حصہ پاکستان کا بھی کوئی گوشہ اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا چونکہ جداگانہ قوموں کے لفظ سے یہاں کے عوام بدکتے تھے اس لئے محض بغرض تبلیغ "قوموں" کی جگہ "قومیتوں" کی اصطلاح وضع اور اختیار کی گئی ہے۔ یہ محض لفظی فریب ہے ورنہ قومیت درحقیقت ان کی مراد قوم ہی ہے۔ مغربی پاکستان میں وطن سے مراد صوبہ لیا جا رہا ہے اور چونکہ یہاں چار صوبے ہیں اس لئے چار قومیتوں کا تصور عام کیا جا رہا ہے۔ قوم ہو یا قومیتیں اور

**عام پر اسپیکٹا** پانچ ہوں یا چار مقصد اسلامی معیار قومیت کے بجائے وطنی معیار قومیت کا نظریہ عام کرنا اور اس طرح مغربی پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بالآخر اس کے جداگانہ وجود کو ختم کرنا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرگانڈھی نے اپنی فتح کا جشن مناتے ہوئے کہا تھا کہ

یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہماری حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ پر جو باطل پر مبنی تھا اور جس پر مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔

اس نے اُدھر یہ کہا اور اُدھر سرحد کے رہنما خان محمد اولی صاحب نے اعلان فرمایا کہ دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ پاکستان غلط تھا۔

(نوائے وقت، ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

بیٹے نے یہ کہا اور ان کے والد جزرگوار (خان عبدالغفار خان) نے ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے، مسٹر ولیپ کمار کرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ

چند سال پہلے کا پاکستان اب مرچکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتہ کی تعمیر کرنی ہوگی۔

انہوں نے یہ بات آج نہیں کہی۔ وہ پہلے دن سے نیشنلسٹ ہیں اور ہندو سے بھی زیادہ تشدد و نیشنلسٹ۔ وہ اپنے اس عقیدہ کا برابر پرچار کرتے رہتے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں جب وہ کابل سے بھارت گئے ہیں تو انہوں نے وہاں کہا تھا کہ

میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی۔ لہذا میں اسے کس طرح تسلیم کروں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ ہم مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔

(اسٹیٹسین، ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء، بحوالہ پاکستان ٹائمز، ۱۹)

چار قومیتوں کا نظریہ نیشنل عوامی پارٹی کے منشور میں داخل ہے اور اس کے راہنما کھٹے بیٹھے اس کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں (گذشتہ مارچ) میں مسٹر غوث بخش برنجو نے، مرکزی اسمبلی کے ایوان میں اس نظریہ کو دہرایا تھا۔ یہ آواز اب نیشنل عوامی پارٹی یا اس کے ہمنواؤں تک محدود نہیں رہی، ہماری نئی نسل کے ہر نوجوان کے لب پر عام ہو رہی ہے جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے پاکستان میں مذہبی پیشوائیت کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے خود بیان کے اساتذہ اور مقتداؤں نے تحریک پاکستان کے دوران، دو قومی نظریہ کی مخالفت کی تھی۔ اس لئے جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہاں نظریہ وطنیت عام ہو رہا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں کہ آخر الامر جیت انہی کی ہوئی جماعت اسلامی

کا دعویٰ ہے کہ دوقومی نظریہ کے سب سے پہلے داعی ان کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے لیکن مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ انہوں نے کبھی اس کا مطالبہ نہیں کیا کہ یہاں دوقومی نظریہ کو عملی شکل دی جائے بلکہ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں انتخابات کے سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے گی تو جماعت اسلامی اس کی حمایت نہیں کرے گی۔ کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں اس کے برعکس اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریے کے مطابق ہونا چاہیے۔ (امروز ۲۰/۶/۷۳)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں بسنے والے لوگوں کا کلچر مختلف ہے اس لئے ان کی قومیتیں مختلف ہیں۔ کلچر کا لفظ ایسا ہے جو آج تک شرمندہ معنی نہیں ہوا۔ کلچر کے مدعیوں سے پوچھتے کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کے جواب میں متعین طور پر کچھ نہیں بتا سکیں گے۔ بات سمٹ سمٹا کر خوراک، لباس، تراش، خراش، وضع قطع، طرز بود و ماند یا فنون لطیفہ پر آجائے گی۔ ان "دانش وروں" کو کون بتائے کہ جو اسلام و وطن، نسل یا زبان کے اختلاف کو کبھی جداگانہ قومیت کا معیار قرار نہیں دیتا، کیا وہ وضع قطع، تراش، خراش یا شعر و نغمہ کے اختلاف کو معیار قومیت تسلیم کر لے گا؟ قرآن کریم، اختلاف رنگ اور زبان (الوان ولسنہ) کو بیشک تسلیم کرتا ہے لیکن وہ انہیں معیار قومیت قرار نہیں دیتا۔ اس نے جو امت واحدہ متشکل کی تھی اس میں عرب، ایران، شام، عراق، روم، مصر، شمالی افریقہ، حبش وغیرہ کے باشندے سب شامل تھے جن میں اسلام لانے سے پہلے کوئی چیز بھی مشترک نہیں تھی اسلام نے ایمان کو قدر مشترک قرار دیا تو ان اختلافات کے باوجود وہ سب ایک امت کے افراد بن گئے حالانکہ اس وقت بھی ان کا طرز بود و ماند (بقول ان حضرات کے ان کا کلچر) الگ الگ تھا۔ اسلام طرز بود و ماند کو نہ چنداں اہمیت دیتا ہے نہ ہی اس سے تعرض کرتا ہے۔ مختلف ملکوں کے مسلمان اپنا طرز بود و ماند الگ الگ رکھ سکتے ہیں لیکن اس اختلاف سے وہ الگ الگ قومیتوں میں نہیں بٹ جاتے۔ اگر کلچر نامی کوئی شے ہے تو وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ایک ہے۔ اس سے مراد انداز بود و ماند نہیں بلکہ وہ ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت مراد ہے جو مستقل اقدار پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس

ذہنیت کے مظاہر اور ان اقدار کو برے کارلانے کے طریق الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کا ان کے ملت واحد ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

لیکن ہمارے ان دانش وروں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہ غیر ملکی سیاحوں کو پاکستانی کلچر دکھانے کے لئے موہ بھو ڈاڑو لے جاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جو کلچر وہاں کے کھنڈرات میں مدفون ہے وہ پاکستان کے وجود میں آنے سے ہزاروں سال پہلے کا ہے۔ نیز یہ بھی محض اتفاق ہے کہ وہ علاقہ تقسیم ہند کے وقت حدود پاکستان میں شامل ہو گیا۔ اگر تقسیم کی لیکر فوراً ادھر کھینچ جاتی تو وہ بھارتی کلچر کا مظہر قرار پا جاتا۔

یہ تو ان لوگوں کی کیفیت ہے جو دو قومی نظریہ کی مخالفت کرتے ہیں لیکن جو اس نظریہ کی تائید اور مدافعت کرتے ہیں، بنظر تعمق دیکھا جائے تو وہ بھی اس نظریہ کے بنیادی اصول کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ محض اپنے سیاسی حریفوں

کی مخالفت کے لئے ایسا کہہ دیتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دو قومی نظریہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلام میں معیار قومیت وطن کا اشتراک نہیں، دین کا اشتراک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک وطن میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم قرار نہیں پاسکتے چار قومیتوں کے مدعی وطن کو معیار قومیت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مختلف صوبے مختلف وطن ہیں اس لئے ہر صوبے کے باشندے، بلا امتیاز مذہب، الگ قوم ہیں۔ دو قومی نظریہ کے مدعی کہتے ہیں کہ پاکستان (یا اب مغربی پاکستان) ایک وطن ہے اور اس میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں۔ فرمائیے کہ اصل کے اعتبار سے ان دونوں گروہوں میں فرق کیا ہے۔ وطن کو بطور معیار قومیت دونوں تسلیم کرتے ہیں۔ فرق صرف وطن کی حدود میں ہے۔ ایک گروہ صوبوں کی حدود کو وطن قرار دیتا ہے۔ دوسرا گروہ پورے مغربی پاکستان کو وطن کہتا ہے۔ اسلام کو معیار قومیت نہ یہ تسلیم کرتے ہیں نہ وہ یاد رکھتے کہ جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا جاتا کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے خواہ وہ ایک وطن ہی میں کیوں نہ رہتے ہوں، اس وقت تک دو قومی نظریہ کا دعویٰ حقیقت نہیں بن سکتا۔ دو قومی نظریہ کے حامیوں

لے سندھ کا ایک خطہ جہاں سے ہزاروں سال پہلے کے آثارِ قدیمہ برآمد ہوتے ہیں۔



سے آپ پوچھئے کہ آپ جن دو قوموں کے مدعی ہیں، فرمائیے کہ پاکستان میں وہ قومیں کون کون سی ہیں آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔

کہا جائے گا کہ مغربی پاکستان میں غیر مسلموں کی تعداد بہت کم ہے اس لئے ان کا یہاں کے مسلمانوں کا ہم قوم قرار پانا ہماری سیاست کو متاثر نہیں کر سکتا۔ لیکن سوال سیاست کا نہیں، دین کے اصول کا ہے۔ غیر مسلم خواہ ایک ہی کیوں نہ ہو، اگر اسے اور مسلمانوں کو ایک قوم تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے ایمان کے اشتراک کو نہیں بلکہ وطن کے اشتراک کو معیار قومیت تسلیم کر لیا۔ یہاں کے غیر مسلموں اور مسلموں کو ایک قوم قرار دے دینا، اس متحدہ قومیت کو وجود میں لے آنا ہے جس کی ہم نے تحریک پاکستان کے دوران اس شدت سے مخالفت کی اور جو اسلام کے نظریہ قومیت کی حریف ہے۔ لہذا جب تک یہاں غیر مسلموں کو آئینی طور پر مسلمانوں سے الگ قوم قرار نہیں دیا جاتا، دو قومی نظریہ کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھ سکتا۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ جس زمانے میں غیر منقسم ہندوستان میں ہمارے ”علماء کرام“ کی طرف سے دو قومی نظریہ کی مخالفت کی جا رہی تھی، ہندو مسٹر نرادی سی چوہدری کا اعتراف

راہنما مثل لالہ لاجپت رائے اور این۔سی۔ دت یہ کہہ رہے تھے کہ متحدہ قومیت کا تصور، قرآن اور حدیث کے خلاف ہے۔ یہ چیز اس زمانے تک محدود نہیں رہی۔ آج جبکہ پاکستان میں دو قومی نظریہ کی اس قدر (بالواسطہ یا بلاواسطہ) مخالفت ہو رہی ہے، ہندوستان میں ایسے ہندو موجود ہیں جو وہاں اس نظریہ کی تائید کر رہے ہیں۔ مسٹر نرادی سی چوہدری وہاں کا بین الاقوامی شہرت کا حامل قلم کار ہے۔ اس نے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کی بڑھتی ہوئی لہر سے متاثر ہو کر ۱۹۶۸ء میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس نے وہاں کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ

میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب دوبارہ کھل کر پورے شد و مد سے مجھے یہ کہہ لینے دیکھتے کہ جب تک ہندوستان کی حکومت اور ہندوستان کے ہندو یہ رٹ لگاتے رہیں گے کہ یہاں کے مسلمان ایک متحدہ قومیت کا جز ہیں، اس

وقت تک (ہندو مسلم فسادات کے مسئلہ کو سلجھایا ہی نہیں جاسکتا.....  
 امر واقعہ یہی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ معاشرے ہیں جو دو الگ الگ تہذیبوں  
 کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے اندر یہ اختلاف ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا.....  
 ... اگر میری یہ بات مان لی جائے تو پھر اگلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ اسے تسلیم کر لیا  
 جائے کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں۔

(طلوع اسلام، بابت جون ۱۹۶۹ء)

یہی بات مسٹر چوہدری نے اس سے پہلے اپنی شہرہ آفاق کتاب (THE CONTINENT OF  
 CIRCLE) میں بھی کہی تھی جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ غور کیجئے کہ ہندوستان کا ہندو تو  
 یہ کہہ رہا ہے کہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کے تحت رہنے والے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ  
 قومیں ہیں اور پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دینے کے مدعی ایک طرف یہاں کے مسلمانوں اور غیر مسلموں  
 کو ایک قوم تسلیم کر رہے ہیں اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو بھی علاقائی تفریق کے اعتبار سے چار  
 قوموں میں تقسیم کر رہے ہیں۔

بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بواجبی است

آئین پاکستان میں 'خدا خدا کر کے ختم نبوت کے عقیدہ کو مسلمان ہونے کی شرط قرار دے دیا گیا۔ اس کے  
 لئے اس آئین کے مرتبین مستحق مبارک باد ہیں۔ لیکن یاد رکھتے بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔

۱۔ جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہ رکھی جائے کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم نہیں قرار دیتے جاسکتے،  
 نہ یہ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے نہ ہمارا آئین اسلامی۔

۲۔ جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہیں رکھی جاتی کہ مسلمانوں میں متعدد قومیتوں کا نظریہ اسلام  
 کی ضد اور مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے، نہ ملت واحدہ وجود میں آسکتی ہے نہ  
 پاکستان محفوظ رہ سکتا ہے۔

۳۔ جب تک دو قومی نظریہ کو ہمارے نصابِ تعلیم میں داخل نہیں کیا جاتا، پاکستان کا مستقبل مستحکم  
 نہیں رہ سکتا۔ اور

۴۔ جب تک آپ ٹرائی نظریہ پاکستان کو اپنی تقریروں اور تحریروں کا مرکزی موضوع قرار نہیں

دیتے نہ اقبال کی یاد میں اجتماعات منعقد کرنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے، نہ قائد اعظم کے یوم منانے سے کوئی فائدہ۔ اقبال نے کہا تھا کہ اگر وطنیت کو معیار قومیت قرار دے لیا گیا تو اس کا نتیجہ لادینی ہوگا۔ اور قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ اگر ہم نے دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان حاصل نہ کیا تو برصغیر میں مسلمان باقی رہیں گے، نہ اسلام۔ اور آپ مجھے اپنی زندگی کے اس ڈھلتے ہوئے دور میں میں اس جگر شکاف اور جاں سوز حقیقت کو زبان تک لانے کی اجازت دیجئے کہ ہم نے نظریہ پاکستان اور اس کے عملی تضمینات کو نظر انداز کر دیا جو درحقیقت قرآن ہی کے نظریہ حیات کا دوسرا نام ہے تو اول تو یہ مسلکت ہی باقی نہیں رہ سکے گی کیونکہ اس کی وجہ جواز ہی ختم ہو جائے گی۔ اور اگر یہ باقی بھی رہی تو یہ اسلام کی نشاطِ ثنائیہ کا گہوارہ نہیں بن سکے گی جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑے گا کہ وہ اپنے ظہور (غلبہ) کے لئے کوئی اور خطہ زمین تلاش کر لے گا۔ لیکن ہمارا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہی وہ المیہ تھا جس کے پیش نظر اقبال نے کہا تھا کہ

حق اگر از پیش ما بردار شش      پیش قومے دیگرے بجز ارش  
ترسم از روزے کہ محرموش کنند      آتش خود بر دل دیگر زند!

ویلیتنی مت قبل هذا و کنت نسیاً منسیاً۔

والسلام



# اقبال کا مردِ مومن

یومِ اقبال، اپریل ۱۹۳۴ء کا خطاب

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

ہم آج ایک ایسی واجب الاحترام ہستی کا یومِ وفات منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ملتِ اسلامیہ کا بالعموم اور ہم اہلِ پاکستان کا بالخصوص عظیم محسن ہے۔ پوری ملت کا اس لئے کہ اس نے خدا کی اس کتابِ جلیل کو جسے ہم نے صدیوں سے نقش و نگارِ طاقِ نیلا بنا کر رکھ چھوڑا تھا اور جس کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ کہ اڑیسین او آساں بمیری۔ پھر سے کتابِ زندہ کی صورت میں پیش کیا اور اہلِ پاکستان کا اس لئے کہ اس نے اس بے مقصد مصروفِ دشتِ پیمانی اور صحراِ انوردی قوم کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین رکھا۔ یعنی ایک ایسی آزاد مملکت کا تصور جس میں اسلام پھر سے ایک عملی نظام کی حیثیت سے کارفرما ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ کے یہ بہت بڑے احسانات ہیں جن سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ان کے احسانات کا یہی احساس ہے جس کی بنا پر میں ۱۹۳۸ء سے آج تک ان کے زندگی بخش پیغام کی یاد تازہ کرتے چلا آ رہا ہوں اور یہی آج کے اجتماع سے بھی مقصود ہے۔ پیغامِ اقبالؒ اور قرآنِ کریمؐ میرا مخصوص موضوع ہوتا ہے۔ اس موضوع کے متنوع گوشے ہیں جنہیں بہ تمام و کمال کسی ایک نشست میں پیش کرنا ناممکن ہے۔ ایک نشست میں ان میں سے کوئی ایک گوشہ ہی سامنے لایا جاسکتا ہے۔ میں آج جس گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں اس کا عنوان ہے "اقبالؒ کا مردِ مومن" اس

موضوع تک پہنچنے کے لئے ایک تمہید ناگزیر ہے۔ ایسے ہی ناگزیر جیسے فصل بونے کے لئے زمین کا ہوا اور نرم کرنا ناگزیر ہوتا ہے کہ "تمہید" کے بنیادی معنی یہی ہیں، اور اقبال تو خود اس دنیا کی زندگی کو مزاجِ آخرت کی تمہید قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ

زمین خاکِ درمیانہ ما      فلک یک گردشِ پیمانہ ما  
حدیثِ سوز و سازِ مادرِ ازست      جہاں ویبِ اچہ افسانہ ما

اور ہمارے موضوع کی تمہید یا ویبِ اچہ یہ ہے۔

## تمہید

قرآنِ کریم، داستانِ حیات کو بڑے عجبانہ لیکن اس کے ساتھ ہی نہایت حکیمانہ انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی، ناقابلِ نمو، جامد مادہ (INORGANIC MATTER) میں موجود خواب تھی کہ پانی کے چھینٹے نے اس کی آنکھ کھول دی۔ یوں پانی اور مٹی کے امتزاج سے اولین جرثومہ حیات وجود میں آیا۔ یہ جرثومہ جوشِ نمو سے دو حصوں میں بٹ گیا جس سے نر و مادہ کا امتیاز عمل میں آگیا اور ان کے اختلاط سے کاروانِ حیات، شاخ در شاخ مختلف سمتوں میں بڑھتا، پھولتا، پھلتا، رواں دواں پھیلتا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ تا نکہ وہ کروڑوں سال کی منزلیں طے کرتا اور پہلو بدلتا پیکرِ حیوانی میں نمودار ہو گیا اور جب اس نے ایک ارتقائی جست اور آگے لگائی تو زندگی نے لباسِ بشریت اختیار کر لیا۔

یورپ کے سائنس دان اپنی صدیوں کی تحقیق و کاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں جسے قرآن نے چودہ سو سال پہلے ان اشارات میں بیان کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد حکمائے مغرب کے نظریہ اور قرآنی حقائق میں ایسا ناقابلِ مفاہمت اختلاف سامنے آتا ہے جسے کفر اور ایمان کے افتراق سے تعبیر کیا جائے گا۔ مغربی محققین کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ بجز اس کے کہ انسانی شعور کی سطح ذرا زیادہ بلند ہے۔ دونوں فطرت کے طبعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے

ہے اس لئے اس مقام پر محض اشارات سے کام لیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

کھاتے پیتے، افزائشِ نسل کرتے اور بالآخر مرتے ہیں۔ موت کے ہاتھوں جس طرح دیگر حیوانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسانی پیکر ارتقا کے سلسلہ دراز کی آخری کڑی ہے۔ اس کے بعد فنا ہے۔ قرآن کریم اس تصورِ حیات کو کفر، یعنی حقیقت سے انکار قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ (۱۲/۱۴) حقیقت سے انکار کرنے والے (یعنی کفار) حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یعنی کھاتے پیتے اور بالآخر مرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا سوچو تو سہی کہ فطرت کا وہ تخلیقی پروگرام جس کی ابتداء اس قدر معجزانہ انداز سے ہوئی، پھر کاروانِ حیات جس انداز سے مختلف وادیوں میں سے گزرا۔ اس نے جس طرح انواع و اقسام کے کروڑوں پیکر اختیار کئے، اپنی خاصیتیں بدلیں، نوعیتیں تبدیل کیں۔ اس میں ایسے ساحرانہ تغیرات نمودار ہوئے کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ عروسِ حیات جو بہ ہزار عشوہ و رعنائی پیکرِ انسانی میں کھڑے مسکرا رہی ہے، وہی ہے جس کا آغاز ایک جرثومہ حیات سے ہوا تھا۔ ذرا سوچو کہ یہ تمام محیر العقول پروگرام۔ یہ حیرت بدوش زندگی۔ یہ سترتاہر طلسماتی منزلیں۔ اس تمام نظام ارتقا کا ما حاصل یہی تھا کہ موت کی ایک ٹھوکرا اس کا رگہ نمود و وجود کو مٹی کے گھروندے کی طرح پامال کر کے رکھ دے؟ سوچو کہ یہ تصور کس قدر بے معنی اور بے نظریہ کیسا بعید از قیاس ہے! العجب خاکِ ساختن می نہ زند خدائے را۔ قرآن نے کہا کہ پیکرِ بشریت سلسلہ ارتقا کی آخری کڑی نہیں۔ یہ ایک جدید سلسلہ ارتقا کی اولین کڑی ہے۔ یہاں سے کاروانِ حیات ایک نئی منزل میں داخل ہوتا ہے۔ انسانی زندگی اس کے طبعی جسم ہی سے عبارت نہیں۔ اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات، نفس یا خودی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس سے پہلے مقصود صرف طبعی جسم کی نشوونما تھا لیکن اب مطلوب انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ انسانی جسم کی نشوونما دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانین کی رو سے ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ذات کی نشوونما ان غیر متبدل اقدار کی رو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی رہی ہیں اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ انسانی جسم کی نشوونما کیسے ہی لطیف و نفیس انداز سے کیوں نہ ہو وہ انسانی جسم ہی رہتا ہے۔ ارتقا کی اگلی منزل میں نہیں پہنچتا۔ لیکن جب انسانی ذات کی نشوونما سے انسان سلسلہ ارتقا کی اگلی اور بلند منزل میں پہنچ جاتا ہے پھر موت سے اس کا جسم تو بیونہی خاک ہو کر ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی ذات کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ زندگی کی مزید ارتقائی

منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھ جاتی ہے جس انسان میں اس کی ذات کی نشوونما شروع ہو جائے اُسے قرآن کی اصطلاح میں مومن کہا جاتا ہے۔ دین (یعنی اسلامی نظامِ حیات) کا مقصد انسان کو مومن بنایا ہے۔ قرآنِ کریم وہ ضابطہ زندگی یا پروگرام عطا کرتا ہے جس کی رُو سے ایک انسان مردِ مومن بن سکتا ہے۔ اس پروگرام کی رُو سے حسنات وہ اعمال میں جن سے انسانی ذات کی نشوونما اور تعمیر ہوتی ہے اور سیئات وہ کام جن سے اس کی تخریب ہوتی ہے۔ یہی خیر و شر کا نقطہ امتیاز اور نیکی اور بدی کا معیار و مقیاس ہے۔

آگے بڑھنے سے بیشتر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ مغرب کے تصورِ حیات اور قرآنی تصور کا فرق محض نظری (THEORETICAL) یا سائنسی تحقیق کے نتائج کا فرق نہیں۔ یہ ایسا بنیادی فرق ہے جس سے انسانی زندگی کا ہر شعبہ — معاشرتی، معاشی، سیاسی، تمدنی وغیرہ اساسی طور پر متاثر ہوتا ہے اسی وجہ سے قرآن نے اُسے کفر اور ایمان کے فرق سے تعبیر کیا ہے۔ مغربی نظریہ کی رُو سے انسانی زندگی محض طبعی زندگی ہے جو دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانین فطرت کے تابع رہتی ہے۔ اس زندگی میں طبعی قوانین سے ماوراء یا بلند کوئی اور قانون نہیں۔ یہ جو آپ اقوامِ مغرب کے ہاں ہر جگہ "جنگل کا قانون" کا فرما دیکھتے ہیں تو یہ اسی نظریہ زندگی کا عملی اور فطری نتیجہ ہے۔ اسی کو سیکولرزم یا لادینیت کہا جاتا ہے اور جس جہنم میں آج ساری دنیا ماخوذ ہے وہ اسی نظریہ کے برگ و بار ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد      زیرِ گرووں رسمِ لادینی نہاد  
درنگاہش آدمی آبِ گل است      کاروانِ زندگی بے منزل است

(پس چہ باید کرد، ص ۵۶)

آپ نے دیکھا کہ سائنس کا ایک غلط نظریہ کس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبے کو زیرِ دگر بردیتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کی رُو سے دین اور دنیا میں کوئی مغایرت یا ثنویت نہیں تو اس سے یہی مراد ہے جب تک انسانی زندگی کے متعلق اقوامِ مغرب کا زاویہ نگاہ نہیں بدلتا، وہاں کے سیاسی، معاشی، معاشرتی نظام میں کوئی صالح تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس غلط نظریہ حیات کے تخریبی نتائج نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے اس سے متاثر ہو کر اب یورپ کے مفکر رفتہ رفتہ اس طرف آ رہے ہیں کہ

انسانی زندگی محض حیوانی زندگی نہیں۔ اس سے آگے کچھ اور ہے اور اب مزید ارتقاء طبعی جسم کا نہیں بلکہ اس کی انسانی مضمرات کا ہوگا۔ روس کا مشہور مفکر اوس بیچی اپنی مشہور کتاب (IN SEARCH OF THE MIRACULOUS) میں لکھتا ہے۔

اب انسانی ارتقاء کا مفہوم ہے ان فزعی اور ممکنات کا نشوونما پانا جو از خود نشوونما نہیں پاسکتیں یعنی جن میں میکانیکی طور پر بالیدگی پیدا نہیں ہوسکتی صرف اس بیج کی نشوونما صرف اس انداز کی بالیدگی انسان کا حقیقی ارتقاء کہلا سکتی ہے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کو انسانی ارتقاء نہیں کہا جاسکتا۔

برگسان اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ اب ارتقائی منازل سے مقصود یہ ہے کہ "انسان ان حدود سے آگے بڑھ جائے جو مادی فطرت نے نوع انسان پر عاید کر رکھی ہیں۔"

اور پروفیسر آرتھر تھا ماس اپنی کتاب (GOSPEL OF EVOLUTION) کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے کہ :-

ہم یہ کہنے کی جرات کر سکتے ہیں کہ ہلکے نے یہ فلفط کہا تھا کہ کائناتی تجربہ کا اخلاقی مقاصد سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کے برعکس ہم پروفیسر (PATRICK GEEDS) سے متفق ہیں کہ فطرت درحقیقت اخلاقی عمل ہی کی مادی شکل کا نام ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ حقیقت ارتقائی کتاب مقدس کا نہایت اہم جزو ہے۔ حیوانات سے ہمارا تعلق اب ہمیں ملائکہ کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ حضرات اب خالص مادی نظریہ ارتقاء کو باطل قرار دے کر کس طرح انسانی ارتقاء کی طرف آرہے ہیں لیکن چونکہ قرآن کی شمع تابندہ ان کے سامنے نہیں اس لئے مزید ارتقائی منازل کے راستے اور ان کے طے کرنے کا پروگرام ہمنوز نکھر اور اُبھر کر ان کے سامنے نہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی ہو جائے گا کہ اس کے سوا انسان کے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔

## مستقل اقدار

میں نے پہلے کہا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر



کرنے سے ہوتی ہے۔ ان اقدار کی اصل و حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے ذاتِ خداوندی کا تعارف اس کی صفات کی رُو سے کرایا ہے جنہیں الاسما الحسنى کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان صفات یا اسماء کی رُو سے ذاتِ خداوندی کے مختلف گوشوں کی جھلک سامنے آتی ہے۔ انسانی دنیا میں انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو ایسی صفات ہیں جو ذاتِ خداوندی سے مختص ہیں۔ مثلاً هو الاول و الآخر۔ هو الظاهر و الباطن۔ یعنی اس کا زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء ہونا۔ یا فاطر السموات و الارض۔ کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ اس قسم کی صفات کے سوا، باقی صفات ایسی ہیں جنہیں انسان علی حد بشریت اپنی ذات میں منعکس کر سکتا ہے۔ انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ قرآن نے انہیں صبغة اللہ (۲/۱۳۸) یا اللہ کا رنگ کہہ کر پکارا ہے۔ جوں جوں انسان ان صفات کو اپنی ذات میں منعکس کئے جاتا ہے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ قرآن میں بیان کردہ صفاتِ خداوندی پر نگاہ ڈالئے یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ان میں سے بیشتر صفات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ مثلاً خدا غفور الرحیم بھی ہے اور شدید العقاب بھی۔ وہ عفو کریم بھی ہے اور جبار و متکبر بھی۔ ان صفات میں باہم مدگر تضاد نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مختلف خصوصیات کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر خصوصیت (صفت) کا ظہور اس کے مناسب موقع پر ہوتا ہے۔ وہ ظالم کے لئے نہایت سخت گیر ہے اور مظلوم کے لئے رحیم و کریم۔ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والے کو سزا دیتی اور سر بلندی عطا کرتا ہے اور ان کے سرکشی برتنے والے کی سخت و تکبر کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ سوال ان صفات ہی کا نہیں اس کے ساتھ سوال یہ بھی ہے کہ کس موقع پر خدا کی کس صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ بات قرآنِ کریم کے گہرے مطالعہ سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

ہمارے ہاں جب مومنین کی خصوصیات کا ذکر ہوتا ہے تو اس کے لئے عام طور پر چند اخلاقی خوبیاں گناہی جاتی ہیں (مثلاً) وہ جھوٹ نہیں بولتے، بددیانتی نہیں کرتے وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے۔ مومنین ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن جس باب میں مومن دوسرے نیک لوگوں سے منفرد ہوتے ہیں وہ اور ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ خارجی دنیا میں ظہور میں آتا تو اس وقت جس صفتِ خداوندی کو ظہور میں آنا ہو، مومن کی طرف سے اسی صفت کا ظہور ہو یعنی

ہر واقعہ پر اس کا ردِ عمل وہی ہو جو اس کے خدا کا "ردِ عمل" ہو۔ گرفت کے موقعہ پر گرفت۔ رحم کے موقعہ پر رحم۔ سرسام زدگان کی فصد کھولنے کے لئے لوک نشتر اور زخموں کے اندمال کے لئے مرہم کا پھایا۔ اس تمہید سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ قرآن کریم نے ذاتِ خداوندی کی صفات اور مختلف مواقع پر ان کے ظہور کی جو تفصیل بیان کی ہیں وہ حدودِ بشریت کے اندر درحقیقت مومن کی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کریم کی ساری تعلیم کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ایک انسان کس طرح مومن بنتا ہے اور مومن کی زندگی سے کس کس قسم کی خصوصیات کی نمود ہوتی ہے۔ میں نے "نمود" کا لفظ ارادۃ استعمال کیا ہے۔ بتانا اس سے یہ مقصود ہے کہ ایک مومن (مثلاً جب عدل کرتا ہے تو وہ محنت و کاوش سے (WITH EFFORT) ایسا نہیں کرتا۔ عدل اس کی ذات کی خصوصیت ہے جو مناسب موقعہ پر خود بخود نمودار ہو جاتی ہے۔ جس طرح روشنی اور حرارت سورج کی ذاتی خصوصیت ہے جس کا انعکاس خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ مومن جس وقت سخت گیر ہوتا ہے اس وقت اس میں رحمی اور کریمی کی صفت موجود نہیں ہوتی۔ مومن کی ذات میں یہ تمام صفات ہر وقت موجود رہتی ہیں اور مناسب مواقع پر خود بخود ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ یوں کہتے کہ مومن مختلف صفات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اس کی ذات ہمہ گیر ہوتی ہے جس میں یہ تمام صفات یوں سموتی ہوتی ہوتی ہیں جس طرح پھول میں خوشبو، رنگینی، لطافت، نراکت اور طبی خواص جیسا کہ میں نے کہا ہے قرآن مجید درحقیقت مومنین کی اپنی صفات و محاسن کا تذکرہ جمیلہ ہے اس کا ارشاد ہے کہ لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۲۱/۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے۔ اس حقیقت کو عقل و بصیرت کی رو سے سمجھو۔ دیکھئے اس عظیم حقیقت کو اقبالؒ کس حسین انداز میں بیان کرتا ہے جب کہ

محمدؐ بھی ترا، جبریلؑ بھی، قرآن بھی تیرا

مگر یہ حرفِ شیریں تر جہاں تیرا ہے یا میرا

اور جس طرح قرآن کریم مختلف طرق و اسالیب سے مومنین کی خصوصیاتِ کبریٰ کا تذکرہ کرتا ہے اسی طرح اقبالؒ بھی گونا گوں انداز سے مومن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ ارتقار کے اس عظیم نظام سے مقصد افراد انسانیت کی ذات کی نشوونما ہی ہے یا یہ نظام کائنات کے خدائی پروگرام میں بھی کوئی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ درحقیقت خدائی پروگرام کی تکمیل کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ وہ ان افراد (مومنین) کو حزب اللہ (۵/۵۶) کہہ کر پکارتا ہے یعنی خدا کی پارٹی۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن نے ان دو لفظوں میں اپنے مخصوص معجزانہ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ انسانی دنیا میں خدا نے جس قدر ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ خدا کی اس پارٹی (جماعت مومنین) کے ہاتھوں سرانجام پاتی ہیں۔ مثلاً مدینہ میں اس جماعت کی اپنی مملکت قائم ہوئی لیکن مکہ میں ابھی ایسے مسلمان تھے جو گھر کر رہ گئے تھے اور مخالفین انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنی انتہائی مظلومیت کی حالت میں خدا کو مدد کے لئے پکارتے تھے۔ خدا قادر مطلق ہے۔ اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ ان ستم زدگان کی براہ راست مدد کر کے انہیں وہاں سے نکال لیتا لیکن اس نے خود ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنی پارٹی (یعنی مدینہ کے مسلمانوں) سے کہا کہ

(اے ہماری پارٹی کے لوگو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ظالمین مکہ کے خلاف جنگ کے لئے نہیں نکلتے؟ تم سنتے نہیں کہ وہاں کے مظلوم مرد عورتیں بچے کس طرح بلک بلک کر رہے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس بستی سے جس کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے بچاؤ نکال لینے کا سامان پیدا کر دے۔ تو ہمارے لئے کوئی

مددگار بھیج۔ تو کسی کو ہمارا پشت پناہ بنا۔ (۴/۷۵)

آپ نے غور فرمایا کہ وہ لوگ خدا کو مدد کے لئے پکارتے تھے اور خدا "حزب اللہ" یعنی اپنی پارٹی سے کہہ رہا تھا کہ تم سنتے نہیں ہو کہ وہ لوگ ہمیں کس طرح پکارتے ہیں۔ تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے! یہ ان کی مدد کے لئے اٹھے اور ان کے دشمنوں کو میدان جنگ میں فنا کے گھاٹا مار دیا۔ اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے خدا نے بعد میں کہا کہ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَهَذَا مَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى (۸/۱۷) تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے اور یہ اس لئے تھا

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ (۹/۴۰)۔ کہ مخالفین حق و صداقت کے پروگرام کو شکست ہو اور خدا کا پروگرام غالب آئے اور اس کے لئے کہا کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷) اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا کہ درحقیقت خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ تک و تازہ ہوتے ہو۔

یہ ہے عزیزانِ من! جماعتِ مومنین کا مقام اور یہ ہے وہ دلکش و بصیرت افروز انداز جس سے خدا ان کا تذکرہ کر رہا ہے۔ علامہ اقبال نے بار بار کہا ہے کہ ان کا پیغام، قرآن کے پیغام ہی کی تشریح و تبیین ہے، اس لئے ان کا کلام، بنیادی طور پر، مرد مومن کی خصوصیات، مقام فریضہ حیات اور مطمح زندگی کا تابندہ دورخشاں آئینہ ہے۔ آئیے اس آئینہ میں مرد مومن کی چند ایک جھلکیاں دیکھیں۔

## بندۂ مولا صفات

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مومن وہ ہے جس کی ذات میں صفاتِ خداوندی علیٰ حدِ بشریت جھل جھل کر رہی ہوں اور کائنات کے خدائی پروگرام اس کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچیں۔ دیکھتے حضرت علامہ ان حقائق کو اپنی نظم سجدِ قرطبہ میں کس وجد آفریں انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:-

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ	غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز
خاکی و فوری نہاد بندۂ مولا صفات	ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل	اس کی اوداں فریب اس کی نگہ و لنواز
نرم دم گشتگو، گرم دم جستجو!	نرم ہو یا نرم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقین	اور یہ عالم تمام، وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ

حلقۂ آفاق ہیں، گرمی محفل ہے وہ

آپ اس مصرعہ میں "عقل کی منزل" اور "عشق کا حاصل" کی اصطلاحات پر غور فرمائیے اور پھر

قرآن کریم کی اس آیت جلیلہ کو سامنے لائے جس میں کہا گیا ہے کہ

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّيْلِ  
وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ  
اللَّهَ قِيَامًا وَتُقُودًا وَ عَلَى جُنُوبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُونَ  
فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا  
بَاطِلًا..... (۱۹۰ - ۳/۱۹۱)

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں قوانین خداوندی کی محکمیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں ان صاحبان علم و بصیرت کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے بیٹھے لیٹے، قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد علی وجہ البصیرت پکاراٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگاہ ہستی کو نہ تو بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔

لہذا، مردِ مومن، علم و ایقان، فکر و ایمان، عقل و عشق، خبر و نظر کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس کی ذات متضاد صفات کا مجموعہ ہوتی ہے جن میں سے ہر صفت اپنے اپنے وقت پر ابھر سامنے آجاتی ہے اور یوں دنیا اس طلسم کردہ رنگارنگ (KALIDOSCOPE) کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر محو حیرت رہ جاتی اور وجد و کیف کے عالم میں بیانیہ

پکاراٹھتی ہے کہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن      گفتار میں کردار میں اشد کی برہان  
تہاری و غفاری و قدوسی و جبروت      یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان  
قدرت کے مقاصد کا عیار اسکے ارادے  
دنیا میں کبھی میزان، قیامت میں کبھی میزان

## اللہ کی برہان

ان آیات میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ مومن کے متعلق کہا گیا ہے کہ گرفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان۔ تو اس سے مراد کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر مخلوق اپنے خالق کے جوہر تخلیق کی زندہ شہادت ہوتی ہے۔ مونا لیزا کے سحر آفریں تبسم کا خدنگ بے کمان، لیونارڈو کے عظیم فنکار ہونے کی دلیل اور شہادت ہے۔ خدا نے اپنی مخلوق میں سے انسان کے متعلق کہا ہے کہ اُسے احسن تقویم میں پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی حسین ترین ہیئتِ ترکیبی لئے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس ہیئتِ ترکیبی سے مراد انسانی جسم کی رعنائی اور زیبائی نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (۵-۹۵) انسان کے اندر حسین ترین مخلوق ہونے کے ممکنات پوشیدہ ہیں۔ لیکن چونکہ اسے اس امر کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان ممکنات کو جس قالب میں چاہے ڈھال لے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بے باک جذبات کی رو میں بہہ کر پست ترین درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ اپنی ذات کے ارتقائی مدارج پر یقین رکھتے ہوئے خدا کے تجویز کردہ صلاحیتِ بخشش پر وگرام پر عمل پیرا ہوں وہ پستی کے گڑھے میں گرنے کے بجائے انسانی ہیئت کے بلند ترین اور حسین ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ انہی کو مومن کہا جاتا ہے۔ لہذا مومن کی ہر نقل و حرکت خدا کے احسن الخالقین ہونے کی شہادت ہوتی ہے۔ اس کے کردار کو دیکھ کر ہر شخص بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ جس ہستی کا تخلیقی شاہکار ایسا ہے اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اس لئے مومن — گرفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان بن جاتا ہے۔

## تقدیر پر زوال

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے۔ یہ بھی ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ اگر کسی نے یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں معاملہ میں خدا کی مشیت اس کا ارادہ کیا ہے۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ معلوم کرے کہ اس باب

میں مردِ مومن کا فیصلہ اور ارادہ کیا ہے۔ اس موقع پر جو فیصلہ مردِ مومن کا ہو، سمجھ لیجئے کہ وہی خدا کی مشیت ہے۔ خدا ایسا ہی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ مومنین کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ (۲۰/۷۶) وہ وہی چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ ان کی مشیت، مشیتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے اور ان کا چاہنا خود خدا کا چاہنا۔ اس حقیقت کو حضرت علامہ نے اپنے شعر میں باندازِ فوسیان کیا ہے جسے دہرایا تو اکثر جاتا ہے لیکن سمجھا بہت کم یعنی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بند سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کی بلندی کے معنی یہ ہیں کہ انسانی ذات، صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار بن جائے۔ جب ایسا ہو جائے تو پھر مومن کا ارادہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا ارادہ ہو۔ اس کا فیصلہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا فیصلہ ہو۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود بندۂ مومن قضائے حق شود

اس طرح مومن کے ارادے اور فیصلے، خدا کے مقاصد کے پہچاننے اور ماننے کا متقیاس بن جاتے ہیں۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بدر کے میدان میں جماعتِ مومنین کی مقاتلانہ تگ و تاز کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ تم تلواریں نہیں مار رہے تھے، ہم مار رہے تھے۔ تم تیر نہیں چلا رہے تھے ہم چلا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی مرضی تمہارے ہاتھوں سے پوری ہو رہی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ جاوید نامہ میں کہتے ہیں :-

عزمِ اُو خلاقِ تقدیرِ حق است

روزِ ہیجا تیرا، تیرِ حق است

یہ اندازِ گفتگو فلسفیانہ سا ہے۔ اس کو ذرا شوخ انداز میں یوں کہتے ہیں کہ

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیرِ مسلمان مومن ہے تو وہ آپ بے تقدیرِ الہی

تقدیر کے ہاتھوں رننے والے مسلمان کو وہ جھنجھوڑ کر کہتے ہیں کہ

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے خودی تیری مسلمان کیوں نہیں ہے

جہت ہے شکوہ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

جب مومن اس طرح خود "تقدیر یزداں" بن جاتا ہے تو پھر وہ زمانے کی تقدیروں کو بدل دیتا ہے۔ تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیتا ہے۔ اقوامِ عالم کی بساط اُلٹ دیتا ہے۔ رنگِ کائنات تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ کچھ بن جاتا ہے مردِ مومن جب اپنے ارادوں کو خدا کے ارادوں کے تابع کر دیتا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہ ہے مطلب حضرت علامہ کے یہ کہنے کا کہ قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے سے ہے۔ یہ تو رہا اس دنیا کا معاملہ۔ اور اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ اس کے اعمال اسے جنت کا مستحق بنا دیں گے یا نہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ مومن کے اعمال نامہ کو سامنے رکھ کر دیکھ لے کہ اس کے اعمال اس ہیمانے پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ

دنیا میں بھی میزانِ قیامت میں بھی میزان

## عقل و جذبات

اب آگے بڑھئے عقل اور جذبات کو دو متضاد عناصر خیال کیا جاتا ہے جن میں ہمیشہ باہمی کشمکش رہتی ہے اور جب جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں تو انسان تباہ ہو جاتا ہے۔ رہبانیت (یعنی تصوف) میں اس کا علاج یہ بتایا جاتا ہے کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ بظاہر یہ بات کچھ ناقابلِ قبول سی نظر آئے گی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ تصوف کا یہ مسلک خود شدتِ جذبات کا پیدا کردہ ہے۔ جذبات کو اس قدر قابلِ نفرت سمجھنا کہ انہیں فنا کر دینا ہی مقصودِ حیات قرار دے لیا جائے عقل کا فیصلہ قدر نہیں پاسکتا۔ عقل اسے بخوبی جانتی ہے کہ اگر انسان میں جذبات نہ ہوں تو اس کا (عقل کا) کوئی فیصلہ بروئے کار آہی نہ سکے۔ عقل کے فیصلے عملی پیکر اختیار ہی جذبات کی قوت سے کرتے ہیں۔ لہذا عقل کا کب یہ تقاضا ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے کارآمد عنصر کو اپنے ہاتھوں فنا کر کے خود عضوِ معطل بن کر رہ جائے۔ ترکِ جذبات کے معنی ہیں ترکِ آرزو، ترکِ مقاصد اور یہ خالص جذباتی چیز ہے اس کے علاوہ ایک اور حقیقت بھی قابلِ غور ہے۔ انسانی جذبات بھی



اسی خدا کے پیدا کردہ ہیں جس خدا نے انسان کو عقل عطا کی ہے۔ لہذا خدا کی پیدا کردہ اتنی بڑی خصوصیت اور صلاحیت کو شر 'فلہذا' قابلِ نفرت اور لائقِ ترک قرار دینا خدا کے عظیم تخلیقی پروگرام کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا سے جنگ کرنا خدا کے مقربین کا شیوہ نہیں ہو سکتا اور آخری بات یہ کہ جذبات ایسی قوت نہیں جسے آپ فنا کر سکیں، انہیں آپ وقتی طور پر دبا تو سکتے ہیں، فنا نہیں کر سکتے۔ اور دبانے کی صورت میں بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپ ان کا ایک راستہ بند کرتے ہیں تو وہ اپنے لئے دس اور راستے تلاش لیتے ہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں اسے بذہادی یا (PERVERSION) کہا جاتا ہے۔ شُدانِ کریم نے جذبات کو قابلِ نفرت 'فلہذا' فنا کر دینے کے لائق قرار نہیں دیا۔ وہ انہیں بڑی اہمیت دیتا ہے اور ان کا اسی طرح احترام کرتا ہے جس طرح عقل کا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ انسانی جذبات کو سرکش اور بے باک نہیں ہونے دینا چاہیے۔ انہیں ہمیشہ - ہدایت - یعنی اتدرا خداوندی - کے تابع رکھنا چاہیے۔ جب جذبات آسمانی ہدایت کے تابع رہیں گے تو ان کا نتیجہ تعمیر ہی تعمیر ہوگا۔ لیکن جب یہ اس سے سرشی اختیار کر جائیں گے تو اس سے تباہی و بربادی، تخریب اور فساد پیدا ہوگا۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بَغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ (۲۸/۵۰) اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہو سکتا ہے جو ہدایتِ خداوندی سے بے نیاز ہو کر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے۔ مومن میں عقل اور جذبات دونوں اپنی انتہائی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان دونوں کو ہدایتِ خداوندی کے تابع رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں اس نظم کو سامنے لائے جو ضربِ کلیم میں مدنیۃ اسلام کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

بتاؤں تجھ کو سماں کی زندگی کیا ہے  
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں  
نہ اس میں عصرِ وراں کی حیا سے بیزاری  
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں  
حقائقِ ابدی پر اس کا سہا ہے اسکی  
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

عناصر اس کے ہیں رُوح القدس کا ذوقِ جمال

عجم کا حسنِ طبیعتِ عرب کا سوزِ دروں

اس سزا پر صبحِ نظم کا ایک ایک شعر شُدان کی روشنی میں توضیح و تشریح کا متقاضی ہے۔

لیکن نقطہ زیر نظر کی رعایت سے ہم سرِ دست اس کے مطلع تک محدود رہتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ مومن کی زندگی — یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں — یعنی عقل جو اپنے انتہائے کمال تک پہنچی ہوئی ہو اور جذبات کی ایسی شدت جو سطح میں لوگوں کی نگاہ میں دیوانگی نظر آئے۔ قرآن کریم نے عقل و جذبات کے اسی امتزاج کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (۳/۱۵۹) اے رسول! تم بہت امور میں اپنے رفیقار سے مشورہ کیا کرو۔ اس کے بعد جب تم فیصلہ پر پہنچ جاؤ اور اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کا عزم کر لو، تو پھر قوانینِ خداوندی کی محکمت پر یقین کامل رکھ کر میدان میں نکل آؤ اور تمام خطرات سے بیگانہ ہو کر جانبِ منزل بڑھتے چلے جاؤ۔ یقیناً فتح و نصرت تمہارے قدم چومے گی۔

ظاہر ہے کہ مشورہ، نہایت اندیشہ، کمال عقل و فکر کا نام ہے جس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر مشورہ میں جذبات دخل انداز ہو جائیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ لہذا وحیِ خداوندی کی روشنی میں عقل و بصیرت کی رُو سے پیش نظر معاملہ کا باہمی مشاورت سے فیصلہ کرو۔ اب اگلا قدم اس فیصلہ کو بروئے کار لانا ہے۔ اس کے لئے پہلی شرط عزمِ راسخ ہے اور دوسری چیز اپنے فیصلہ کے مبنی برحق ہونے پر یقین کامل۔ ان کا تعلق جذبات سے ہے۔ اُن مومنانہ جذبات سے جن کے حاملین کے متعلق کہا کہ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (۳/۱۶۳) وہ لوگ کہ جب ان سے دوسروں نے کہا کہ تمہارے مخالفین نے ہمارے خلاف ایک لشکرِ حرار جمع کر رکھا ہے۔ اس لئے ان سے ڈرو اور آگے نہ بڑھو۔ تو اس سے بچائے اس کے کہ وہ مخالفت ہوں، ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا کہ ہمیں ان کی پرواہ کیا ہے۔ ہمارا بھروسہ قوانینِ خداوندی کی محکیت پر ہے اور یہ اتنی بڑی قوت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ یہ ہے مردانِ مومن کا عزم و توکل جس کی رُو سے وہ دیوانہ وار آتشِ نمرود میں کود جاتے اور مخالفت کی ہر قوت پر غالب آجاتے ہیں۔ دیکھئے اقبال! اس حقیقت کو کیسے بصیرت افروز انداز میں بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اُستیاں را زندگی جذبِ دروں      کم نظر ایں جذب را گوید جنوں  
بیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد      بے جنونِ ذوقنوں کارے نکردا

مومن از عزم و توکل تا ہر است

گر ندارد ایں دو جو ہر کافر است

لیکن جذبات کی اس قدر اہمیت کے باوجود مومن کی زندگی میں یہ کس طرح اقدارِ خداوندی کے تابع رہتے ہیں، اسے قرآن کریم نے ایک آیت میں نہایت جامعیت سے واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ قُلْ اِنْ كَانَ اَبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاَخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ لَئِنْ رَسُلًا مِنْكُمْ جَاءَتْكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ لَوَجَّهْتُ وَاِلَىٰ رِجْتِي لَسَاءَ مَا يَحْكُمُونَ لَكُمْ فِي الَّذِي كُنْتُمْ يَكْفُرُونَ اِنَّ اَوْلِيَّيَكُمْ يَوْمَئِذٍ هِيَ الْاَرْضُ الَّتِي كُنْتُمْ عَلَیْهَا فَاحْيَاؤْا بِهَا حَيٰوةً حَسَنًا وَاَعْرِضُوْا عَنْهَا صَالِحًا اِلَىٰ رَبِّكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۲۴۰/۱)۔

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ، بیٹے بیٹیاں، بھائی برادر، تمہاری بیویاں یا دیگر رشتہ دار و اموال یا اقرباؤں سے تمہارا مال و دولت جسے تم نے محنتِ شاقہ سے حاصل کیا ہے و تجارتاً، تخشون کسادھا۔ تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم خائف رہتے ہو۔ و مٰلِکُنْ تَرْضَوْنَہَا اور تمہارے یہ معاملات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو غرضیکہ دنیا کی کوئی کشش و جاذبیت اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنْ اِلٰہِ و رَسُوْلِهٖ و جِهَادِہٖ فِی سَبِيْلِهٖ تمہارے نزدیک خدا، رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہو جائیں۔ فَتَرْجِئُوْا تَوَانْتَظَرُوْا۔ حَتّٰی یَاْتِیَ اِلَیْكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ (۲۴۰/۲) تاکہ قانونِ خداوندی اپنا فیصلہ صادر کرے اور تم تباہ و برباد ہو جاؤ۔ یہ ہے قرآن کی رو سے اقدارِ خداوندی سے ٹکراؤ کی صورت میں انسانی جذبات کی حیثیت۔ اس قسم کے تصادم کے وقت مومن جذبات کا دامن جھٹک کر اقدارِ خداوندی کے تحفظ کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ مومن تمام معاملات کے فیصلے ہدایتِ خداوندی کی روشنی میں عقل و فکر اور غور و تدبیر کی رو سے کرتا ہے۔ اور جب کسی معاملہ میں فیصلہ کر کے اسے بڑے کارلانے کا عزم کر لیتا ہے تو پھر وقتی مصلحت کوشیوں سے بے نیاز ہو کر راستے کی تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے جب کہا ہے کہ

فسزانه بگفتارم، دیوانہ بہ کروارم

لیکن یہی جذبات جب اس کی راہ کے کانٹے بنتے نظر آتیں تو وہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے کہ

یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند  
بتانِ وہم و گمان لا الہ الا اللہ

## عمل تخلیق

اب ایک اور گوشے کی طرف آئیے۔ خدا کی ایک صفت فَاِطْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرْضِ ہے۔ یعنی کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ یہ صفت خدا کے لئے مختص ہے اور انسانی ذات خواہ وہ کتنی ہی نشوونما یافتہ کیوں نہ ہو جائے اس صفت میں شریک نہیں ہو سکتی۔ حیوانی سطح پر افزائشِ نسل کا ذریعہ تولید ہے۔ یعنی جنسی اختلاط۔ خدا اس سے بلند و برتر ہے۔ اسی لئے اس نے اپنے متعلق کہا ہے کہ لَمْ يَلِدْ و لَمْ يُولَدْ (۱۱۲/۳) اس کی ذات افزائش کے طریق تولید سے بلند و بالاتر ہے۔ لیکن انسانی نسل کی افزائش طریق تولید کی رو سے ہوتی ہے اس اعتبار سے حیوان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

لیکن پیدائش کا ایک اور طریق ہے جسے عمل تخلیق کہا جاتا ہے۔ تخلیق کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ جو عناصر موجود ہیں ان میں مختلف ترکیب سے امتزاج کے ذریعے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا۔ خدا نے اپنے آپ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے علاوہ اور خالق ہو سکتے ہیں اگرچہ ان کا عمل تخلیق خدا کے تخلیقی نو اور جیسا حسین نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا احسن الخالقین ہے۔ اس سے تین نکات ہمارے سامنے آتے۔ (۱) فَاَطْرُ صَافِیٰ خَدا ہو سکتا ہے کوئی اور نہیں۔ (۲) عمل تولید حیوانی سطح پر طریق افزائش ہے اور (۳) مومن عمل تخلیق میں خدا کا رفیق ہوتا ہے۔ تولید میں صرف تکرار ہوتی ہے۔ اس کی رو سے ہر حیوان جس میں انسان بھی شامل ہے، صرف اپنے جیسا بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں ندرت نہیں ہوتی۔ ارتقا نہیں ہوتا۔ فکر کی دنیا میں اسے تقلید کہتے ہیں یعنی جو ہوتا چلا آ رہا ہے اسی طرح ہوتا چلا جائے۔ تخلیق کے لئے نئی فکر، نئے خیال، نئی آرزوئیں، نئے مقاصد کا دل میں ابھرنا، نئی نئی تمناؤں کا بیدار ہونا، شرطِ اولیں ہے۔ آپ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے جب تک آپ کے دل میں اس کے لئے ایک نیا خیال نہ ابھرے۔ مومن کی زندگی تخلیقی کارناموں کا مظہر ہوتی ہے۔ تقلید و تکرار اس کا شیوہ نہیں ہوتا۔ اقبال کے پیغام کا

نقطہء ماسکہ تخلیق مقاصد اور بیداری آرزو ہے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف "اسرارِ خودی" کے ابتدائی باب میں کہتے ہیں کہ

زندگانی رابعا از مدعا است کاروانش را دراز مدعا است

اور

مازِ تخلیق مقاصد زندہ ایم از شعاع آرزو تا بندہ ایم  
عملِ تخلیق کے لئے زندگی کے بلند مقاصد پر یقین ضروری شرط ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ۔

بے یقین را لذتِ تحقیق نیست

بے یقین را لذتِ تخلیق نیست

اقبال کے نزدیک ایمان کا فطری نتیجہ تخلیق مقاصد ہے۔ وہ واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ

ہر کہ اور لذتِ تخلیق نیست نزد ماجز کافر و زندیق نیست

مومن کارگہ کائنات میں اپنے عملِ تخلیق میں نت نئے اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو اقبال مردِ حُر یا بندہ آزاد کہتا ہے۔ اس کے برعکس غلام ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

کیش او تقلید و کاش آذری است ندرت اندر مذہب او کافری ست

تازگی با وہم و شک افزائش کہند و فرسودہ خوشی آیدش

حضرت علامہ فکر کی تازگی کی اہمیت کے متعلق کہتے ہیں کہ

جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود

کہ سنگ و نشیت ہوتے نہیں جہاں پیدا

اس کی تشریح (بال جبریل میں) ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلابِ ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا، لعلِ ناب

خدا نے اپنے عملِ تخلیق کے متعلق کہا تھا کہ بَزِيدُ فِي الْفَخْرِ مَا يَشَاءُ (۳۵/۱) وہ

اپنے قانونِ مشیت کے مطابق کائنات میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ مومن بھی ندرتِ فکر و

عمل سے نئی نئی ایجادات سے خدا کے تخلیقی پروگرام میں اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ پولینڈ کا مفکر

باردیو اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ "امرِ تخلیق صرف خدا کی طرف سے انسان کی طرف نہیں آتا بلکہ خدا بھی انسان سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کے کارناموں کا منتظر رہتا ہے۔"

## نسل و رنگ

(THE DIVINE AND THE HUMAN).

اب تولید و تخلیق کے فرق کا اگلا مرحلہ دیکھئے۔

جہاں تک انسان کی تمدنی زندگی کا تعلق ہے، تولید کی حیوانی سطح پر افراد کا باہمی رشتہ خون اور نسل کے اشتراک کی بنا پر ہوتا ہے۔ ایک خاص نسل کے گھوڑے، خاص نسل کے بیل، خاص نسل کی بھیریں، الگ الگ نوع قرار پاتی ہیں۔ ان میں نسلی اشتراک کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔ جب انسان بھی حیوانی سطح پر زندگی بسر کرے تو وہ بھی خون اور نسل کے اشتراک سے مختلف قبیلوں اور قوموں میں بٹ جاتا ہے۔ لیکن جب وہ مومن کی سطح پر آجائے تو پھر ان میں وجہ جامعیت خون اور نسل کا اشتراک نہیں رہتی۔ اقدار کا اشتراک وجہ جامعیت یا معیار قومیت قرار پاتا ہے۔ اس کو وو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کریں، ایک قوم کے افراد اور جو لوگ مومنانہ سطح پر زندگی بسر کریں، دوسری قوم کے اراکین۔ ماں، باپ، زن و فرزند، اعزاء و اقارب سے تعلقات معاشرتی زندگی کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر اس تقاضا اور اقدار خداوندی میں ٹکراؤ ہو تو یہ تعلقات یا یوں کہتے کہ خون اور نسل کا اشتراک کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ مومن ان رشتوں کو بلا تامل توڑ کر ان لوگوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَ إِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ  
اے جماعتِ مومنین! اگر تمہارے ماں باپ یا بھائی بند ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ پسند کرتے ہوں تو تم ان سے دوستی کے تعلقات مت وابستہ رکھو۔ وَ مَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۹/۲۳) یاد رکھو! جو ایسا نہیں کرے گا اور ان سے بدستور و ستانہ تعلقات وابستہ رکھے گا تو اس کا شمار بھی ظالمین میں سے ہوگا۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا تھا کہ

قوم تو از رنگ و خون بالاتر است      قیمت یک اسودش صد احمر است  
گر نسب را جز دلت کردہ      رخنہ در کارِ اخوت کردہ  
(بے خودی)

یعنی نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی  
اڑ گیا دنیا سے تو مانسہ خاک رہ گذر

میں چونکہ اس موضوع پر ساہا سال سے مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آ رہا ہوں اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان اشارات سے آپ نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہو گا کہ اسلام میں قومیت کا مسئلہ سیاسی یا تمدنی سوال نہیں۔ یہ کفر اور ایمان کا خط امتیاز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا انسانی سطح پر۔ حیوانی سطح زندگی کو کفر کہا جاتا ہے اور اقدارِ خداوندی کے مطابق انسانی سطح زندگی کو ایمان۔ قرآن کے عبا و اللہ اور اقبال کے مردانِ مومن کا ایک امتیازی جوہر یہ بھی ہے کہ وہ خون اور نسل کے حیوانی رشتہ کے بجائے ایمان و اقدار کے انسانی (مومنانہ) رشتہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔

## رحم اور قوت

اب ایک اور گوشے کی طرف آئیے۔ دنیا میں رحم اور قوت دو ایسے عناصر ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہ اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے۔ عیسائیت نے خدا کو سترتا ستر رحم قرار دیا ہے اور قوت کے ہر قسم کے تصور کو شر سے تعبیر کیا۔ خدا کے اس تصور نے جس قسم کا ضابطہ اخلاق مرتب کیا، اس کے نتائج و عواقب سے متعلق عصرِ حاضر کا ایک عظیم مفکر "وہاٹ بیڈ" لکھتا ہے کہ:-  
اس ضابطہ کو اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جاتے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

(ADVENTURES OF IDEAS).

اس تصور کے خلاف ردِ عمل کا انتہائی مظہر جرمن فلاسفر نیٹشے ہے جس کے نزدیک زندگی کا راز "قوت اور بے پناہ قوت میں ہے۔ وہ اس خصوصیت کے سوا کسی قدر کا قائل ہی نہیں۔ اس تصور حیات نے کیا نتائج پیدا کئے، اس کی زندہ شہادت وہ جہنم ہے جس میں اس وقت ساری دنیا

بتلائے عذاب ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ دونوں تصورات باطل اور غلط نگہی پر مبنی ہیں۔ خدا ذُو الْقُوَّةِ  
الْمَتِينُ (۵۱/۵۸) یعنی بے انتہا محکم قوتوں کا مالک بھی ہے اور اَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (۷۱/۵۱) بھی۔  
یعنی سب سے زیادہ رحم کرنے والا۔ وہ ظالم کی کلانی مروڑنے کے لئے صاحبِ قوت ہے اور مظلوم  
کے زخموں پر مرہم رکھے کے لئے انتہائی شفقت و رحمت کا مظہر۔ عبدِ مومن خدا کی ان دونوں صفات  
کا حامل ہوتا ہے اور اقبال نے ان صفات کے حسین و جمیل امتزاج کو مختلف اسالیب و انداز سے  
اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ اگر میں اس کی تفصیل میں جانا چاہوں تو اس کے لئے کئی  
نشتیں درکار ہوں گی۔ قرآن نے جماعتِ مومنین اور ان کے سربراہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ  
وسلم کے متعلق کہا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ خَدَاةٌ يَفِيءُ مَبْرُوحًا  
اور ان کے رفقاء کی کیفیت یہ ہے کہ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۲۸/۲۹)  
وہ حق و صداقت کے مخالفین کے لئے چٹان کی طرح سخت ہیں اور باہمدگر حریر و اطلس کی طرح نرم۔  
اقبال ان متضاد خصوصیات اور ان کے امتزاج کو انتہائی وجد و کیف کے عالم میں بیان کرتا چلا جاتا  
ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ضربِ کلیم کی وہ تابندہ نظم جس کا مطلع ہے — ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن —  
اور جس کے چند اشعار میں اس سے پہلے پیش خدمت کر چکا ہوں۔ اس کے آخر میں کہا ہے کہ  
مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

بانگِ درا کی مشہور نظم — طلوعِ اسلام — میں وہ مسلمان تک خدا کا یہ پیغام پہنچاتے  
ہیں کہ —

بستانِ محبت میں حریر و پربیاں ہو جا

گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر

گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہِ بیاباں سے



# قیام و سجود

مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ اَشِدَّاءُ عَلٰى الْكُفٰرِ رُحَمَآءٌ  
بَيْنَهُمْ۔ اس کے بعد قرآن کریم نے فدائیوں کی اس جماعت کی خصوصیت یہ بتائی کہ تَرَابُہُمْ  
رُكْعًا سُجَّدًا (۲۸/۲۹) تو انہیں دیکھے گا کہ کبھی رکوع میں جھکے ہوتے کبھی سجدہ میں گرے ہوئے۔  
علامہ اقبال مومن کی صلوة سے کئی نادر معانی اخذ کرتے ہیں۔ وہ کبھی کہتے ہیں کہ

بسوز مومن از سوزِ وجودش      کشود ہر چہ بتند از کسودش

جلالِ کبریائی در قیامش      جمالِ بندگی اندر سجودش

عبد مومن کے قیام و سجود کے جلال و جمال کے حسین منظر سے، میرے افقِ ذہنی پر بلا ساختہ  
افغانستان کی ایک شاعرہ پرمی بخشنی کی غزل کا ایک شعر نمودار ہو گیا۔ اس نے کہا ہے اور  
دیکھئے کس ساحرانہ انداز سے کہا ہے کہ

برخاستی! قیامتِ کبریٰ بلند شد

بنشیں دے! کہ فتنہ محشر نشہ پہ

لیکن اقبال کسی اور ہی مقام سے بات کرتا ہے۔ ارمغانِ حجاز کا ایک قطعہ آپ نے ابھی ابھی سن لیا۔  
اسی مضمون کا دوسرا قطعہ ہے کہ

دو گیتی را صلا از قرأتِ اوست      مسلمان لایموت از رکعتِ اوست

نداند کشتہٗ این عصر بے سوز      قیامت ہا کہ در قد قامتِ اوست

مومن کا قیام و سجود آئینہ وار ہے اس حقیقت کا کہ وہ ایک خدا کے حضور جھک کر دنیا کی بڑی  
سے بڑی طاقت کے سامنے مروانہ وار کھڑا ہو جاتا ہے۔ سجدہ، اگر بغیر قیام کے ہو تو وہ عیسائیت  
(بلکہ یوں کہتے کہ) مسلکِ ربانیت کے "خدا" کا خود ساختہ تصور ہے۔ اور اگر قیام بلا سجدہ  
ہو تو وہ نیٹشے کے تصور کا (SUPERMAN) ہے جو اندھی قوت کا قہر مانی مجسمہ ہوتا ہے۔

قرآن نے قوت اور اقدارِ خداوندی کے امتزاج کو نہایت بصیرت افروز الفاظ میں بیان  
کیا ہے جب کہ ہے کہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمْ

الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت اور میزانِ عدل دے کر بھیجا تاکہ لوگ عدل و انصاف کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیکن اس مقصد کے لئے نظری تعلیم یا پسند و نصح کا کافی نہیں تھے۔ اس لئے وَ أَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ بِهِمُ لِنُكَرُوا مَا كُنُوا يَكْفُرُونَ۔ ان کے ساتھ شمشیرِ خوارہ شگاف بھی نازل کی۔ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنْفَعٌ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵) اگر اسے خدا کے نازل کردہ ضابطہ ہدایت کے مطابق استعمال کیا جائے تو وہ نوعِ انسان کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی ہے۔ ضابطہ خداوندی اور اس کے ساتھ تلوار (یعنی مادی قوت)۔ یہ ہے اسلام۔ تلوار کے متعلق اقبال کہتا ہے کہ:-

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلمان کبھی تو نے  
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار  
اس بیت کا مصرعِ اول ہے کہ جس میں  
پوشیدہ چلے آتے ہیں توجید کے اسرار

تنہا تلوار بیتِ زندگی کا صرف ایک مصرع ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک اس کے ساتھ دوسرا مصرع نہ ہو، یہ شعر نہیں بن سکتا۔ وہ دوسرا مصرعہ اقدارِ خداوندی کا ضابطہ ہے۔ اقبال نے اپنی زندہ و پائندہ تصنیف 'جاوید نامہ' میں تلوار اور شرفِ ان کے باہمی تعلق کو ایسے عمیق لیکن درخشاں انداز سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں چشمِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ (مغلیہ خاندان کے) شاہِ عالم کے زمانہ میں، پنجاب کے گورنر، نواب خان بہادر خان کی صاحبزادی محترمہ شرف النساء کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ کمر سے تلوار باندھے رکھتی تھیں اور ہاتھ میں قرآن اور انہوں نے اپنی والدہ کو وصیت کی تھی کہ اس کی وفات کے بعد یہ دونوں چیزیں اس کی قبر کے اوپر رکھ دی جائیں۔

اقبال اپنے آسمانی سفر میں، جنت الفردوس میں اس شہزادی والا تبار سے ملتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ اس کے اس شعارِ زندگی اور آخری وصیت کی حکمت کیا تھی۔ وہ جواب میں کہتی ہیں کہ میں تلوار اور قرآن کو اس لئے ساتھ رکھتی تھی کہ

اے دو قوتِ حافظیکِ دیگر اند  
کائناتِ زندگی را محور اند!

مومنوں را تیغ باقرآن بس است  
تربیت ما را، ہمیں سامانِ بس است

تلوار سے مراد، عسکری قوت ہی نہیں بلکہ ہر قسم کا اقتدار ہے۔ جب دین بلا اقتدار کے ہو تو

وہ مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا منتہی وعظ و نصیحت کی منت خوشامد سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اور جب اقتدار ضابطہ خداوندی سے الگ ہو جائے تو وہ ہر دور میں فرعونیت کا مظہر بن جاتا ہے۔ ضربِ کلیم کی اس جلال آفریں نظم کو پڑھئے اور دیکھئے کہ حکیم الامت نے اس حقیقت کو کیسے داشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

تاریخ اُمم کا یہ پیام ازلی ہے  
 صاحبِ نظراں نشہ قوت ہے خطرناک  
 اس سیلِ سبک سیرِ زمیں گیر کے آگے  
 عقلِ نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک  
 لادیں ہو تو ہے زہرِ بلاہل سے بھی بڑھ کر  
 ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

واضح تر الفاظ میں کہ :

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو  
 جد اہودیں سیاست کی تورہ جاتی ہے جنگیزی  
 مومن کی سیاست دین کے تابع رہتی ہے۔ قرآن اس کی تلوار کا محافظ ہوتا ہے کہ وہ بے راہ رُو نہ ہونے پائے اور تلوار و شہر آن کی محافظ کہ وہ مذہب بن کر نہ رہ جائے۔ اس طرح مومن کی تلوار اس کی قوت، اس کا اقتدار، اس کی سیاست، اس کی مملکت، دنیا میں مقاصدِ خداوندی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جب متحدہ کے مظلوموں نے اپنی امداد کے لئے خدا سے فریاد کی تو اس نے کس طرح مدینہ کے صاحبِ اقتدار مسلمانوں سے کہا کہ تم ان مظلوموں کی فریاد کو سنتے نہیں! تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟ اسی حقیقت کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ :

اللہ کو پامردی مومن پر بھروسہ  
 ابدیس کو یورپ کی شینوں کا سہارا  
 مومن کو خدا کے قانونِ مکافات کی محکمیت پر بھروسہ ہوتا ہے اور خدا کو جماعتِ مومنین کی استقامت اور پامردی پر بھروسہ کہ جب یہ مشیتِ خداوندی کے بروئے کار لانے کے لئے اٹھتے ہیں تو اس کی (مشیت) بروئے کار آکر رہتی ہے۔ اس لئے کہ اُدَلِّعَكَ حِزْبُ اللّٰهِ۔ یہ خدا کی پارٹی ہے۔ اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۵۸/۲۲۱) اور سُنْ رَکْهُوْكَ خُذِ اللّٰہِ پَارِئِیْ کَامِیَابٍ ہُوکَر رَہْتِیْ ہے۔ صرف کامیاب ہی نہیں فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۵/۵۶)

یہ سب پر غالب آکر رہتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کوئی قوم ان سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آگے بڑھنا تو ایک طرف، کوئی قوم ان کے ہمدوش نہیں ہو سکتی۔ ان کی برابری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔

مومننے بالائے ہر بالا ترے غیرت اور نبتا بدہم سے

اس لئے کہ ان کے خدا کا ارشاد ہے کہ وَ اَنْتُمْ الْاَغْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (۱۳۹/۳) جب تم مومن ہو تو پھر تم سے بڑا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وَ لَنْ يَجْعَلَ اللهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلاً ۝ (۴۱/۴۱) یہ مومن نہیں سکتا کہ کفار کبھی مومنوں پر غالب آجائیں جب صورت یہ ہے تو پھر واضح ہے کہ دنیا میں خدا کی طرف سے ما حق حکومت صرف جماعت مومنین کو حاصل ہوگا۔ کسی اور کو نہیں۔

عالم ہے فقط مومن جانناز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مومن جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق نہیں ڈھال لیتا۔ وہ اس ماحول کو اپنے نظریات و تصورات کے مطابق ڈھلنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ اسی کا نام انقلاب ہے اور مومن دنیا میں سب سے بڑا انقلابی ہوتا ہے۔ مثنوی اسرار و رموز میں ہے کہ

مرد خود وارے کہ باشد پختہ کار  
بامزاج اوبسازد روزگار  
گر نہ سازد بامزاج ادجہاں  
می شود جنگ آزما با آسماں  
بر کند بنیاد موجودات را  
می دهد ترکیب نو ذرات را  
گردشش ایام را برہم زند  
چرخ نیلی نام را برہم زند  
می کند از قوت خود آشکار  
روزگار تو کہ باشد سازگار

اس قسم کا انقلاب، مرد مومن کا ایمان ہی برپا کر سکتا ہے اور اس کا طریق یہ ہے کہ ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جہاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار  
اور خاکِ تر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

(MARTIN BUBAR) نے اس حقیقت کو جس خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے، جی نہیں چاہتا

کہ اس کیف میں آپ کو شریک کئے بغیر آگے بڑھا جائے وہ کہتا ہے کہ  
جب قوتِ تخلیق ہم پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو جلا کر ہمارے  
اندر جذب ہو جاتی ہے اور اس آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے ہماری  
تخلیق نو کرتی ہے۔ ہم اس کے آتشیں جلال کے حضور میں پہلے کانپتے ہیں، گڑگڑاتے  
ہیں، سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہم خود عملِ تخلیق میں شریک ہو جاتے  
ہیں اور خالق سے ج ملتے ہیں اس کے معاون اور رفیق کی حیثیت سے۔

(I AND THOU).

اس قسم کا جہانِ نو، مردِ مومن کی قوتِ بازو ہی سے وجود میں آسکتا ہے۔ ایسا انقلاب کوئی  
اور پیدا نہیں کر سکتا جس میں کیفیت یہ ہو کہ **يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ  
وَ السَّمَوَاتُ** (۱۲/۲۸) یہ زمین بدل جاتے، یہ آسمان بدل جاتے۔ **وَ بَنِيؤُا لِلّٰهِ الْوٰحِدِ  
الْقَهَّارِ** (۱۲/۲۸) اور ان میں ایک نئی دنیا اُبھرے جس میں صرف خدائے واحد کا سکہ رواں  
ہو۔ **وَ أَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا** (۳۹/۶۹) اور زمین اپنے نشوونما دینے والے کے  
نور سے جگمگا اٹھے۔ یہ ہیں وہ مردانِ حُر جو ہیگل کے ”روحِ زمانہ“ اور مارکس کے ”تاریخی و جوہر“  
کے تابع مجبور و مقهور زندگی بسر کرنے کے بجائے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیتے ہیں۔  
بار دیو کے الفاظ ہیں:-

یہی وہ انسان ہے جو تاریخ اور کائنات کی زندگی جیتا ہے اور اس میں  
باعمل و متحرک رہتا ہے لیکن تاریخ اور کائنات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ  
انہیں اپنے ارادوں کے تابع ڈھال لیتا ہے۔ اس قسم کا انسان صرف اپنی

لے بوبر چونکہ یہودی ہے اس لئے اس کا اشارہ حضرت موسیٰ کے واقعہ طور کی طرف ہے۔

ذات کی یا ان لوگوں کی ذمہ داری ہی نہیں لیتا جو اس کے گرد و پیش ہوں  
بلکہ تمام نوع انسان کے مقدمات کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔

(THE DIVINE AND HUMAN)

قرآن کے الفاظ ہیں وَ كَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى  
النَّاسِ (۲/۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا تاکہ تم تمام نوع انسان  
کے اعمال و کردار کی نگرانی کرو۔

یہ ہے مومن کا مقام اس دنیا میں اور چونکہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، آگے بھی چلتی ہے،  
اس لئے جہان فردا میں بھی امامت کا سزاوار ہی ہوگا۔ اس لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ  
فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن  
قدم اٹھایہ مقام انتہائے راہ نہیں  
بانگِ در میں ہے۔

پے سے چرخ نیلی قام سے منزل مسلمان کی  
اور بالِ جبریل کی یہ رقصندہ و سرائندہ غزل  
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کاڈاں تو ہے  
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں  
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں  
چمن اور بھی آسشیاں اور بھی ہیں  
تو شاہیں ہے پرداز ہے کام تیرا  
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں  
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا  
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں!

قرآن کریم کی رُو سے تو، جنت بھی مومن کے سفرِ حیات کی آخری منزل نہیں راستے میں سستانے کا  
مقام ہے یعنی دم لے کر آگے چلنے کا مقام۔ کاروانِ حیات نے اس کے بعد بھی کئی ارتقائی منازل  
طے کرنی ہیں۔ اسی لئے اہل جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ نُورُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ  
وَ بَأْيَمَانِهِمْ۔ ان کی (پیشانی کا) نور ان کے آگے اور دائیں بائیں راستے روشن کرتا جائے گا۔  
يَقْوُونَ رَبَّنَا أَنْتُمْ لَنَا نُورٌ وَ اغْفِرْ لَنَا (۴۶/۸) اور ان کی پکار یہ ہوگی کہ آگے

ہمارے نشوونما دینے والے، ہمارے نور کی تکمیل کر دے۔ اس نورانی سفر کی آخری منزل کو نسی ہوگی، اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ اس لئے کہ ہمارے شعور کی موجودہ سطح پر یہ حقیقت ہمارے جیٹھ اور اس میں آ نہیں سکتی تھی۔ اس کی سمت کا اشارہ کرتے ہوئے اتنا کہا گیا کہ **وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ** (۵۳/۴۲) اس سفر کا انتہائی تیرے رب کی طرف ہے۔ یاد رہے کہ اہل تصوف کا جو نظریہ ہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا ایک جزو ہے اور زندگی کی تمام تک و تاز کا حاصل یہ ہے کہ یہ جزو اپنی اصل یعنی ذاتِ خداوندی میں جا کر جذب اور فنا ہو جائے، یہ تصوفِ شریفِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا۔ خود اقبال بھی اس نظریہ کے خلاف ہے۔ اس کی تلقین یہ ہے کہ

چناں با ذاتِ حقِ خلوت گزینی      ترا و بیند و اُورا تو بینی  
بخود محکم گزار اندر حضورش      مشونا پید اندر بحر نورش

(گلشنِ راز جدید)

یہ بہر حال ایک الگ موضوع ہے جس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ مومن وہ ہے جو زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس کے مقامات کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔

مقام بندہ مومن کا ہے ورائے سپہر      نہیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات  
حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی      نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جہتند

(ارمغانِ حجاز)

طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکتند

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا، شریفِ کریم کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس میں مختلف پہلوؤں اور متنوع گوشوں سے مروانِ مومن کی خصوصیت

لے ذاتِ خداوندی میں فنا ہو کر نہیں، بلکہ اسی حریم میں، اس سے الگ۔

کیفیات کا تذکرہ ہے اور علامہ اقبال کا پیغام بھی چونکہ حقائقِ قرآنی ہی کا ترجمان ہے اس لئے اس میں بھی مومن کی صفات و تجلیات کو پہلو بہلو بدل بدل کر بیان کیا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر وہ پھول کی بھری ہوئی پتیوں کی طرح فرداً فرداً سامنے آتی ہیں اور کہیں انہیں گلہ ستہ کی طرح جامع حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ میں ایسے مقامات کی دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں تاکہ اقبال کے مرد مومن کی ایک جھلک بیک نظر آپ کے سامنے آجائے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف 'مثنوی اسرار و رموز میں سورۃ اخلاص کی آیت **وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ** کی شرح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

رشتہ با لَمْ يَكُنْ باید قوی	تا تو در اقوام بے ہمتا شوی
آنکہ ذاتش احد است لا شریک	بندہ اش ہم در نسا زد با شریک
مومنے بالائے ہر بالا ترے	غیرت او برنتابد ہمسرے
پیش باطل تیغ و پیش حق سپر	امر و نہی ادعیار خیر و شر
عفو و عدل بذل احسانش عظیم	ہم بقہر اندر سزاج او کریم
ساز او در بزمہا خاطر نواز	سوز او در رزمہا آہن گداز

زیر گردوں می نیاسایدش

بر فلک گیرد قرار آب و گلش

میں یہ اشعار پڑھ رہا ہوں اور میرے حافظہ میں ایک ایسے واقعہ کی یاد تازہ ہو رہی ہے جو ہے تو ذاتی لیکن جی نہیں چاہتا کہ میں اسے یہاں بیان کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ میری ابتدائی تعلیم و تربیت میرے لائق صد احترام، واداجان (مرحوم و مغفور) کے زیر سایہ عاطفت ہوئی تھی۔ انہوں نے حضرت علامہ کی یہ مثنوی مجھے خود پڑھائی تھی۔ اس وقت میری عمر چھوٹی سی تھی۔ انہوں نے جب اقبال کے اشعار اور قرآن کی روشنی میں 'مرد مومن کی صفات و خصائص بیان کیں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی اور میں نے نہایت استعجاب اور کچھ خوف کے سے، ملے جلے جذبات کے ساتھ ان سے کہا کہ باباجان! مرد مومن اگر ایسا ہوتا ہے تو مجھے تو آج ساری دنیا میں کوئی مرد مومن نظر نہیں آتا۔ انہوں نے اپنے مخصوص محبت بھرے انداز سے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ آج مرد مومن کہیں



نظر نہیں آتا۔ لیکن غنیمت ہے کہ اگر ہمارے ذمہ میں کوئی مومن نہیں تو دنیا میں آج کوئی کافر بھی موجود نہیں۔ اگر صورت یہ ہوتی کہ ابو جہل تو ہوتا اور عمرؓ نہ ہوتا تو پھر البتہ گھبرانے کی بات تھی۔ دنیا آج کفر اور ایمان دونوں کی طرف سے بے اعتنا (INDIFFERENT) ہوتی جا رہی ہے اور جو لوگ زندگی کے حقائق کی طرف سے (INDIFFERENT) ہو جائیں ان سے کوئی خطہ نہیں ہوتا۔ یہ تھا جو کچھ دادا جان (مرحوم) نے فرمایا۔ اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد جب ضربِ کلیم سامنے آئی تو اس کے شروع میں یہ شعر نظر پڑا۔

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

کہ خادراں ہیں ہے قوموں کی روح تریاتی

تو میری سمجھ میں آیا کہ دادا جان نے اتنا عرصہ پہلے کیا بات کہی تھی۔ یہ جملہ معترضہ تھا۔ میں کلامِ اقبال سے مردِ مومن کی صفات و خصوصیات کی مثالیں پیش کر رہا تھا۔ ضربِ کلیم میں وہ مردِ بزرگ کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق	تہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں	ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو	شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثل خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں	بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا

اس کے احوال سے محرم نہیں یہ ان طریق

میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ جب اقبال کے کلام سے مردِ مومن کی خصوصیات میرے سامنے آئیں تو میں نے بصد تاسف کہا کہ دادا جان! مجھے اس بھری دنیا میں کوئی مومن نظر نہیں آتا۔ اب سوچتے کہ جب کلامِ اقبال کے سامنے آنے سے میری یہ کیفیت ہو گئی تھی تو اس باب میں خود اقبال کی کیفیت کیا ہوگی؟ اقبال ساری عمر مردِ مومن کی تلاش کرتا رہا اور گلی گلی کوچہ کوچہ صحرا صحرا دریا دریا پکارتا گیا کہ۔

درمگر کہ بے سوز تو ذوقے متواں یافت  
اے بندہ مومن! تو کجائی؛ تو کجائی؛

اس کی ساری عمر اسی پکار میں گذر گئی۔ لیکن زندگی بھر کی طلب و جستجو کے باوجود جب اسے مردِ مومن کی آواز کہیں سے سنائی نہ دی تو وہ ہارتھک کر بیٹھ گیا اور انتہائی کرب و الم کے ساتھ پکارا اٹھا کہ

مسلمان ہے توحید میں گرم جوش  
مگر دل ابھی تک ہے زنا پر پوش  
تمدن، تصوف، شریعت، کلام  
بتانِ عجم کے پجاری تمام  
حقیقت خرافات میں کھو گئی  
یہ امت روایات میں کھو گئی  
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے  
مسلمان نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

اور یہ اس لئے کہ

منزل و مقصودِ قرآن دیگر است  
رسم و آئینِ مسلمان دیگر است  
اس کا نتیجہ یہ ہے کہ  
دینِ حق از کافری سوا تر است  
ہذا، مردانِ مومن کہاں سے آئیں؟

والسلام



# آدم کی کہانی اقبال کی زبانی

یوم اقبال ۱۹۵۲ء کی تقریر

اسلام سے پہلے تمام مذاہب میں تصویر یہ تھا کہ دنیا ایک جیل خانہ ہے جس میں انسان ایک بے کس و مجبور قیدی کی طرح زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنے پھیلے جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں پابند سلاسل ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ ابن آدم اپنے اولیں ماں باپ، آدم و حوا کے گناہ کی پاداش میں ماخوذ ہے۔ بدھ مت کے نزدیک انسان کی مصیبتوں کا راز اس کی آرزوؤں میں تھا اور اس مصیبت سے چھٹکارے کا علاج ترک آرزو و نیت کی رو سے انسان کی ہستی ہی ایک فریب تصور اور عالم تمام لائق و ام خیال تھا۔ شرآن آیا اور اس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰)** ہم نے ابن آدم کو لو جب تک بنایا ہے۔ یہ مسجود ملائک اور مخدوم مخلوق ہے۔ کائنات کی پتیاں اور بلندیاں اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں۔ یہ شاہکارِ فطرت ہے۔ اس کی تخلیق، حسن تقویم کی مظہر ہے۔ اس کے مدارج بڑے بلند اور اس کے مناصب بڑے رفیع الشان ہیں۔

اقبال چونکہ شرآن کا ترجمان ہے اس لئے اس کے کلام میں مقامِ آدم کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ آپ حضرت علامہ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے، یہاں سے وہاں تک آدم کے احوال

ظروف کا تذکرہ ملے گا۔ کلامِ اقبال میں آدم کی یہ سرگزشت اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ اس سے ایک مستقل کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے تو بڑی فرصت درکار ہے۔ سر دست کچھ اُبھرے ہوئے عنوانات ہیں جن سے اس طویل و عریض داستان کے کچھ گوشے آپ کے سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ سرگزشت حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) تخلیق کائنات۔

(۲) پیدائش آدم۔

(۳) ہبوطِ آدم۔

(۴) آدم کی نیند۔ اور

(۵) اس کی بیداری۔

علاوہ قلتِ وقت کے میری بڑی دشواری یہ ہے کہ حضرت علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے اور اس قسم کی مخلوط محفلوں میں اُردو کے اشعار ہی زیادہ موزوں رہتے ہیں۔ لہذا مجھے بھی زیادہ تر انحصار ان کے اُردو کلام پر ہی کرنا پڑے گا اور فارسی اشعار صرف وہاں پیش کروں گا جہاں اس کے بغیر چارہ نہ ہو۔

اب سنئے سرگزشتِ آدم یعنی اپنی اور میری سرگزشت۔

پہلا عنوان تخلیق کائنات | ذرا تصور میں لایئے اس منظر کو کہ اس کائنات کی کوئی شے وجود میں نہیں آئی تھی۔ نہ زمین نہ آسمان۔ نہ چاند نہ

ستارے۔ نہ شجر تھے نہ حجر۔ نہ صحرا تھے نہ سمندر۔ نہ حیوان تھے نہ انسان۔ ایک خدا کی ذات تھی اور باقی سب ہو کا عالم۔ ظاہر ہے کہ ایسی سنسان حالت کب تک رہ سکتی تھی؟ ہر تصور اپنی نمود کے لئے بتاب ہوتا ہے۔ ہر حقیقت لباسِ مجاز میں آنے کے لئے پیکرِ اضطراب ہوتی ہے۔ ہر نقش اپنے اُبھرنے کے لئے بیجِ ذناب کھاتا ہے۔ ہر جلوہ اپنے نکھرنے کے لئے برقِ درآغوش ہوتا ہے۔ ہر سبز پوش سرِ بامِ آنے کے لئے سیماب پا ہوتا ہے یعنی ہر قوتِ خاموش ذوقِ نمود و لذتِ تخلیق سے عمل بیدار بننے کے لئے ہمہ تن شوق ہوتی ہے۔ شانِ الوہیت کی اسی لذتِ تخلیق اور ذوقِ نمود نے

انگوائی لی۔ خطیرۃ قدس کی ملکوتی فضا میں ہلکا سا موج پیدا ہوا۔ عدم کے پردے اٹھے اور افق کے اس پار نگارخانہ کائنات خاموشی سے ابھرنا شروع ہوا۔ یہ دن کارکنانِ قضا و قدر کی زندگی میں بڑی گہما گہمی کا دن اور یہ ساعت مدبرانِ امورِ البیہ کے اوقات میں بڑی ہمہ ہی کی ساعت کھٹی یعنی وہ وقت جب کیفیت یہ تھی کہ :-

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی      تبسمِ نشاں زندگی کی کلی تھی  
 کہیں بہر کو تاجِ زر مل رہا تھا      عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی  
 سیہ پیر بن شام کو ڈے رہے تھے      ستاروں کو تعلیم تہ بندگی تھی  
 فرشتے سکھاتے تھے شبِ بنم کو رونا      ہنسی گل کو پہلے پہل آرہی تھی

بیولائے کائنات ابھرنے کو توجہ بھرا۔ لیکن بڑا بے کیف اور بہت بے رنگ۔ سورج اپنی نور افشاہیوں اور حرارت سامانیوں کو لئے لئے سارا دن پھرتا رہتا لیکن نہ اسے کوئی آنکھ ایسی ملتی جو اس کی روشنی کی داد دیتی نہ کوئی سینہ ایسا ملتا جو اس کی تپش کو اپنی متاعِ سوز بنا لے چاند اپنے بلوریں ساغریں مئے نور بھرے رات بھر محو تلاش رہتا لیکن اسے کوئی ایسا زندہ مست نہ ملتا جو اس آتشِ خنک کے جامِ مرمر میں کو پیک کر اٹھالے۔ ستارے سہ شام نقابِ الٹ الٹ کر سرگرم تماشا ہو جاتے لیکن کوئی نگہِ نظارہ باز ایسی نہ ملتی جو ان کی چلمنی مسکراہٹوں سے آنکھ مچولی کھیلتی۔ لالہ اپنا سینہ شوق کئے دن بھر کسی کے انتظار میں چاروں طرف آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھتا اور شام کو یاس و ناامیدی سے لڑکھڑا کر گر پڑتا۔ صحنِ چمن میں پھول خود ہی کھلتے اور تھوڑی دیر مسکرا کر خود ہی مرجھا جاتے۔ یعنی یہ وہ زمانہ تھا جب

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے      ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے  
 قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا      نہ تھا وقت ابھی گردش کے آئینِ مسلم سے

ابھی امکان کے طلعتِ خانے سے ابھری تھی دنیا

مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کائنات کی اس تنہائی اور غمگینی، اس بے نوری اور بے سوزی، اس بے کیفی اور بے رنگی پر نقش طرازِ ازل کا جی بھر آیا۔ اس کے پاس سامانِ سوز و ساز کی کمی نہ تھی۔ صرف ایک ترکیبِ نو کی ضرورت

تھی۔ اس نے فرشتہ میر سامان کی طرف دیکھا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ پا کر تعظیم کے لئے جھکا اور  
ستوح قدوس کی بے صوت صداؤں میں تعمیل ارشاد کے لئے روانہ ہوا۔ اس نے

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا      اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ بہم سے  
تڑپ بجلی سے پانی حور سے پاکیزگی پائی      حرارت لی نفسہائے مسیح ابن مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت کے شان بے نیازی لی!

ملک سے عاجزی افتادگی تقدیرِ شبنم سے

اور ان اجزا سے ایک مرکب تیار کیا۔ پھر اس میں کچھ آگ کی چنگاریاں بھریں اور اس پر خون کے پھینٹے  
ویئے۔ تسبیح بدست فرشتے چپکے ہی چپکے اس پیکرِ آبِ دگل کو دیکھتے جو ایسے متضاد عناصر سے  
ترکیب پارہا تھا۔ وہ آج تک ہر عنصر کو الگ الگ دیکھنے کے عادی تھے۔ پانی کو پانی، آگ کو آگ۔ اس  
لئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آگ اور پانی، روشنی اور تاریکی، محبت اور عداوت، زہر اور نریاق،  
صلح اور فساد کا مجموعہ بالآخر بنے گا کیا؟ ہزار ہا سال کی گردشوں کے بعد اس مشیتِ خاک نے ایک  
متعین صورت اختیار کی۔ بکھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بن گئیں۔ زمین کانپی، آسماں تھر تھرا یا  
چاند کا سا غر زریں چھلک گیا۔ ستاروں کے ننھے سے دل دہل گئے۔ فضا میں اک شورا اٹھا اور

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد      حسن لرزید کہ صاحبِ نظرے پیدا شد

فطرت آشفٹ کہ از خاکِ جہانِ مجبور      خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد

خبرے رفت ز گردوں بہشتانِ ازل      حذر اے پردگیاں پردہ دے پیدا شد

آرزو بے خبر از خویش باغوشِ حیات      چشم واکر دو جہانِ دگرے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک تپیندم ہمہ عمر

تا ازیں گنبد ویرینہ درے پیدا شد

اقبال کی فارسی نظموں کا اردو میں ترجمہ بہت مشکل ہے۔ ترجمہ میں یوں بھی اصل کی روح نکل  
جاتی ہے۔ لیکن اس نظم کا ترجمہ علامہ اسلم حیرا چوری نے کیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان اشعار  
کو اردو داں طبقہ کو سمجھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں الفاظ ملنے مشکل ہیں۔ وہ ترجمہ

عشق چنچ اٹھا کہ اک خونیں جگر پیدا ہوا  
 فطرت آشفقتہ کہ خاکِ عالمِ مجبور سے  
 حسن کانپ اٹھا کہ اک صلحِ نظر پیدا ہوا  
 پنہنجی گردوں سے شبستانِ ازل میں یہ خیر  
 اک خود گرا خود شکن اور خود نگر پیدا ہوا  
 آرزو تھی زندگی کی گود میں سوئی ہوئی  
 پردہ دارو! ہوشیار اک پردہ ور پیدا ہوا  
 آنکھ کھولی، اک جہانِ خیر و شر پیدا ہوا

زندگی بولی کہ تھی میں آبِ و گل میں مضرب

بارے آج اس گنبدِ بے در میں در پیدا ہوا

علامہ آلم نے ان اشعار کے ترجمہ کے بعد کچھ اپنی طرف سے اضافہ بھی فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔

مسکرا کر یہ ملائک سے کہا ابلیس نے  
 چرخ سے آئی ندا اے ساکنانِ بحر و بر  
 لو تمہارا اک حریفِ تازہ تر پیدا ہوا  
 جس کی خاطر یہ زمین و آسماں چکر میں تھے  
 اک جہاں آشوبِ ظالمِ فتنہ گر پیدا ہوا  
 مادِ فطرت کا وہ نورِ نطفہ پر پیدا ہوا

تھا فضائے عالمِ ناسوت کا بربطِ خموش

آخر اس سازِ گہن کا زخمہ ور پیدا ہوا

فرشتے اس پیکرِ خالی کو دیکھ کر محو حیرت تھے کہ بالآخر اس میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اسے تمام کائنات میں سب سے اونچے مقام پر بٹھایا جا رہا ہے۔ خلاقِ فطرت نے ان کا استعجاب دور کرنے کے لئے آدم کو باغِ جنناں میں بھیج دیا جہاں ہر شے ایک خاص انداز سے رکھی گئی تھی اور کسی کو مجال نہ تھی کہ اس میں ذرا سی بھی تبدیلی پیدا کر سکے۔ آدم نے صحنِ چمن پر ایک تیرتی ہوئی نگاہ ڈالی اسے اس کی ترتیب کچھ پسند نہ آئی۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہ پیڑ وہاں ہونا چاہیے۔ وہ روش یوں ہونی چاہیے۔ اس پھول کا رنگ ایسا ہونا چاہیے۔ اس پھل کے ذائقے میں یہ تبدیلی ہونی چاہیے۔ وہ ابھی ان تبدیلیوں کا خیال ہی کر رہا تھا کہ جانبِ عرشِ عظیم سے آواز آئی کہ آدم! ہماری دی ہوئی ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔ آدم نے سر اٹھایا اور نہایت تمکنت سے کہا کہ معاف فرمائیے جس جگہ مجھے رہنا ہے اس کی ترتیب میری پسند کے مطابق ہونی چاہیے۔

گفت بزدان کہ چنیں است و چنیں خواہد بود

گفت آدم کہ چنیں ہست و چنناں خواہد بود

آدم کے اس جواب پر صحنِ چمن سے دُور ایک طرف سے بلند قمقمے کی آواز اٹھی جس میں ابلیس نے سرکشی کی گرج سی محسوس ہو رہی تھی۔ فضائے چمن پر سناٹا چھا گیا۔ معصوم فرشتے بہم کر کونوں گوشوں میں چھپے ہر شے اپنی اپنی جگہ ساکت و صامت انگشت بند داں کھڑی ہو گئی۔ اس سکوت کو ایک دلکش آواز نے یہ کہتے ہوئے توڑا کہ یہی وہ اختیارِ ارادہ کی قوت ہے جو آدم کی سرفرازی و سر بلندی کا موجب ہے۔ اسی سے یہ مسجود ملائک اور مخدومِ خلایق ہے۔ کشمکشِ حیات میں پُر کیف جاذبیتیں ہیں تو اسی سے اور کشاکشِ زندگی میں رنگیں کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بر ربطِ ہستی کے خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی کے مضراب سے اور مینائے حیات کے سادہ پانی میں کیفِ رنگ و تعطر کی ارغوانی موجیں اٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے تم کائنات کی دوسری چیزوں پر غور کرو اور پھر انسان کی اس خصوصیتِ کبریٰ کو دیکھو۔ بات سمجھ میں آجائے گی کہ ان میں اور انسان میں کیا فرق ہے۔

منظر چمنستان کے زیبا ہوں کہ نازیبا	محرورِ عملِ رنگس مجبورِ تماشا ہے
رفقاری لذت کا احساس نہیں اس کو	فطرت ہی صنوبر کی محرومِ تماشا ہے
تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں	انسان کی ہر قوتِ سرگرم تقاضا ہے
اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوسِ نگر	یہ ذرہ نہیں شاید مٹا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی

یہ ہستی دانا ہے، بیٹا ہے، تو انا ہے

اب فرشتوں کو معلوم ہوا کہ اس پیکرِ آب و گل میں وہ کون سی قوتیں خوابیدہ ہیں جن کی بنا پر اسے کائنات میں یہ مقام عطا ہوا ہے۔ اس احساس سے ان کی نگاہیں تعظیم کے لئے جھک گئیں۔ آدم نے تبسمِ فشاں نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا کہ اب مجھے اس دنیا میں جانا چاہیے جسے میں اپنے نقشے کے مطابق ترتیب دے سکوں۔ آدم خراماں خراماں نیچے اُترا۔ اس کے جلو میں قطار و در قطار فرشتے اسے رخصت کرنے کے لئے ساتھ تھے۔ وہ نسیمِ سحر کی طرح آہستہ آہستہ ساتھ آ رہے تھے اور اپنی نورپاش بے صوت صداؤں سے یہ نغمہ تبریک و بہنیت گارہے تھے کہ

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بتابی	خبر نہیں کہ تو خاک کی ہے یا کہ سیما بی
سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن	تری سرشت میں ہے کو کبھی و مہتابی



جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی  
گراں پہا ہے ترا گر پہ سحر گاہی اسی سے ہے ترے نخل کبن کی شادابی

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر  
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

یہ خسروانہ جلوس بایں شوکت و سطوت جانبِ فلک سے سوئے زمین آیا۔ خاک کے ذرے آنکھیں  
ملتے ہوئے اٹھے۔ سبز خوابیدہ جوشِ نمود سے بیدار ہوا۔ غنچے چٹکے، پھول کھلے، چاندنی مسکرائی سینہ  
سحر سے بیتاب موجیں ابھرا بھر کر دیکھنے لگیں۔ عروسِ فطرت نے اپنے حسین چہرے سے نقاب الٹی  
اور رُوحِ ارضی اس تمام سامانِ رنگ و چنگ اور جہانِ شوخ و شنگ کو ساتھ لئے استقبال کے لئے  
آگے بڑھی۔ بربطِ ہستی کے خاموش تاروں میں ارتعاش پیدا ہوا اور سازِ فطرت کی ہم آہنگی سے رُوحِ  
ارضی نے یہ کہتے ہوئے آدم کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا کہ۔

کھول آنکھ زبیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ  
اس جلوے بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ایامِ جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ  
بے تاب نہ ہو معرکہ بیم ورجا دیکھ

میں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں یہ گنبدِ انداک یہ خاموش فضا میں  
یہ کوہِ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں تمہیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

خوشید جہاں تاب کی ضوتیرے شرر میں آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں  
چختے نہیں بخشے ہوئے فردوسِ نظر میں جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گلِ کوششِ پیہم کی جہاں دیکھ

آدم نے اس کرۂ ارضی کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ یہ ایک مٹی کا گھروندا ہے جس کا نہ کوئی متعین نقشہ ہے نہ  
ترتیب۔ سر پر آگ برسانے والا آتشیں گولہ چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ۔ ادھر ادھر ساحل  
نا آشنا سمندر اور اس کی بہیب طغیانیاں۔ ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک  
ورندے اور اثر ہے چاروں طرف خوفناک بلاؤں کا ہجوم اور ان میں بہتا ابنِ آدم بے کس و

بے بس اور بے یار و مددگار۔ شروع شروع میں ان لرزہ انگیز بلاؤں نے اسے دبانا چاہا لیکن اس کے بعد اس کی مضمحل قوتوں نے بیدار ہونا شروع کیا۔ اس نے پہاڑوں کے جگر شق کر دیتے۔ سمندر کے سینہ پر کشتیاں چلا دیں۔ بڑے بڑے مہیب طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آہنی دیواریں کھڑی کر دیں، دریاؤں کے رُخ بدل دیتے۔ ہواؤں کی سمتیں تبدیل کر دیں۔ آسمان کی بجلیاں مقتدر کر لیں۔ غرضیکہ اس زمین کا پورے کا پورا نقشہ بدل دیا۔ نہ وہ انداز رہے نہ وہ ترتیب نہ وہ رنگ رہا نہ وہ ڈھنگ۔ اس نے فطرت کی ہر شے کو اپنے مطلب کے مطابق متشکل کر لیا۔ اس شکست و ریخت اور حرب و ضرب کو دیکھ کر ایک دن اللہ میاں نے اس سے کہا کہ تو نے یہ کیا کر دیا؟

جہاں رازیک آب و گل آفریدم  
تو ایران و تاتار و تنگ آفریدی  
من از خاک پولاد و ناب آفریدم  
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی  
تبر آفریدی نہال چمن را  
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

آدم نے یہ سن کر کلبھاڑا ایک طرف رکھ دیا اور کہا کہ گستاخی معاف! ذرا اپنی اور میری تخلیق پر غور تو کیجئے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم  
سفال آفریدی ایام آفریدم  
بیابان و کہسار و راغ آفریدی  
خیابان و گلزار و باغ آفریدم  
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم  
من آنم کہ از زبر نوشینہ سازم

ذرا اس مخلوق کو سامنے لائے جسے تسبیح و تقدیس سے فرصت نہیں اور اس کے بعد یہ دیکھئے کہ میں نے اس دنیا کو کیا سے کیا بنا دیا ہے؟

قصور و از غریب الٰہی ہوں لیکن  
تیرا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد  
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے  
وہ دشتِ سادہ وہ تیرا جہانِ بے بنیاد  
مقامِ شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں  
انہیں کام ہے یہ جن کے حوصلے میں زیاد

یہ تبدیلیاں تو وہ ہیں جو صرف مٹی اور پانی کی دنیا میں میرے ہاتھوں نمودار ہوئی ہیں لیکن ان سے کہیں اہم ہیں وہ نقوش و آثار جو دنیا نے فکر و جہانِ تصورات میں میری کاہش و کاوش سے صورت پذیر ہوتے ہیں۔

میری نولے شوق سے شورِ حرمِ ذات میں  
غولہ ہائے الاماں بتکدہ صفات میں  
خورد فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں  
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں  
گاہ میری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود  
گاہ اُبجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں  
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا  
میں ہی تو ایک راز تھا سینہ کائنات میں

آدم کے اس دعویٰ کی شہادت زمین کے ذرے ذرے نے دی۔ چاروں طرف پہاڑوں سے اس کی  
صدائے بازگشت نے فضا کو معمور کر دیا اور پستیوں اور بلندیوں سے یہ آواز آنے لگی کہ یہ بالکل درست ہے۔  
ہے گرمی آدم سے ہنگامہ عالم گرم  
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

دن گذرتے گئے، آدم اپنے ہنگاموں میں سرگرم عمل رہا۔ ایک دن اس کے دو بیٹے کھیت  
میں کام کر رہے تھے۔ ایک کی کسی بات پر دوسرے کو تاؤ آگیا۔ یہ تھا ذرا زور آور۔ اٹھا اور اسی کے تبر  
سے اس کا گلا کاٹ دیا۔ کھیت پر دُور دُور تک سُرخ خون کے چھینٹے بکھر گئے۔ اس نے اس سے  
پہلے کبھی سُرخ رنگ کے چھینٹے نہیں دیکھے تھے۔ وہ گھبرا گیا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔  
وہ دیوانہ وار بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے پیچھے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنی۔ مُڑ کر دیکھا تو اس کا بھائی  
اپنا سر متھیلی پر لے لے اس کے پیچھے پیچھے بھاگے آ رہا تھا۔ اس منظر سے اس پر وحشت سی چھا گئی۔ یہ  
پہلا دن تھا کہ اسے ڈر معلوم ہوا۔ وہ جتنی تیزی سے بھاگتا اس کا بھائی اسی رفتار سے اس کا پیچھا  
کرتا۔ کام کرنے والے یہی دونوں بھائی تھے۔ دونوں اس افراتفری میں پڑ گئے۔ ایک کے پیچھے دوسرا۔  
ایک ہاتھ میں گھلا ہوا خنجر، دوسرے کی متھیلی پر کٹا ہوا سر۔ زمین خون کے چھینٹوں سے لالہ زار۔  
ان کی کھیتیاں اُجڑ گئیں۔ باغ ویران ہو گئے۔ مکان گر گئے۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندے پھر سے  
باہر نکل آئے۔ پہاڑوں میں رُکے ہوئے طوفان دوبارہ اُمنڈ آئے۔ مسترتوں کے چشمے سُکھ گئے۔  
شادا بیوں کے پھول مُرجھا گئے۔ صحنِ عالم قتل گاہ بن گیا۔ جس پتھر کو اٹھایا نیچے سے خون کا فوارہ  
اُبھر آیا۔ جس شاخ کو توڑا لہو کے قطرے ٹپکنے لگ گئے۔ دنیا کا ہر بناؤ بگاڑ میں اور ہر تعمیر تخریب

میں بدل گئی۔ آدم کی ان وحشت سامانیوں کو فرشتے تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ جاتے۔ مطلب صاف تھا کہ یہی ہے وہ اشرف المخلوقات، صدر بزم کائنات، گل سرسبدِ ممکنات جس کے سامنے ٹھکنے کے لئے ہمیں کہا گیا تھا! رفتہ رفتہ یہ باتیں اشاروں کنایوں سے گزر کر زبانوں تک آنے لگیں۔ اب بساطِ کائنات کے ہر گوشے میں یہی چرچا تھا۔ کارکنانِ فضا و قدر کی مفلحوں میں ہر ایک ہی زبان پر یہی تذکرہ تھا۔ جو ان میں ذرا ویدہ ورتھے وہ کبھی کبھی یہ کہہ دیتے کہ آدم کا یہ جنوں عارضی ہے۔ اس کی یہ گراوٹ وقتی ہے ہمیں یقین ہے کہ

ٹوڑ ڈالے گی یہی خاکِ ظلمِ شب و روز گرچہ ابھی ہوئی تقدیر کے پچاک میں ہے

فرشتے یہ سن کر سر بلا دیتے۔ وہ درحقیقت آدم کی اس بربادی کو اپنی فتح سمجھتے تھے۔ اگرچہ وہ اس حرف کو زبان تک نہیں لاسکتے تھے۔ لیکن وہ خلاقِ فطرت سے کہنا یہی چاہتے تھے کہ "کیوں! ہم نہ کہتے تھے؟" ان کی اس سادہ لوحی کاظم کبھی کبھی اس قسم کی آواز توڑ دیتی ہے کہ یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ ایاز! قدرِ خود شناس!

کجا نوسے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند کجا خاک کے کہ در آغوش دارد آسمانے را

یعنی

عرشِ معلیٰ سے کم سینہ آدم نہیں گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپر کبود

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجد

بہر حال بزمِ پردگیانِ راز میں صبح و شام اس قسم کے چرچے ربتے، طعنے دینے والے طنز آمیز لہجے میں اور غمگساری کرنے والے ہمدردانہ انداز میں اس قسم کی باتیں کرتے کہ

مہ دستارہ سے آگے مقام ہے جس کا وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

ابن آدم بھی یہ سب کچھ سنتا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ کیا کرے۔ وہ ہزار جاہتا کہ اپنے خنجر کو کواٹھا کر کہیں دور پھینک دے اور کسی طرح بھائی کا کٹا ہوا سر پھر سے اس کی گردن کے ساتھ جوڑ دے لیکن وہ نہ یہ کر سکتا نہ وہ۔ اب اس پر یا یوسی چھلنے لگی۔ وہ اپنے مستقبل سے ناامید ہونے لگا۔ وہ ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ خا سرد نامراد، شرمندہ اور ناکام۔ ہتھیلی پر سر رکھ کر گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اسی حالت میں سو گیا۔ آدم ہزاروں سال اسی طرح سویا رہا۔ سوچ حسبِ معمول اس

کے دن کو روشن کرتا اور شام کو اسے سوتا چھوڑ کر اپنا چکر پورا کرنے چلا جاتا۔ چاند حسب دستور اپنی منزل میں پوری کرتا۔ لیکن آدم میں بیداری کے کوئی آثار نہ دیکھتا۔ فرشتوں سے اب نہ رہا گیا۔ انہوں نے جرات کر کے بحضور رب العزت عرض کر ہی دیا کہ

عقل ہے بے زام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی  
خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میٹر پیر  
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست  
دانش و دین و علم و فن بست گئی ہڈیں تمام

جو ہر زندگی ہے عشق جو ہر عشق ہے خودی

آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی

فرشتوں کو اس کا جواب سولہ تے ایک حسین بستم کے اور کچھ نہ ملا۔ ایک دن جبریل کو ابلیس سر رہا ہے مل گیا۔ اس نے اس سے کہا کہ ہمدم دیرینہ! یہ آدم کا معتمہ کیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر تم اس راز کو پاسکے ہو تو ذرا ہمیں بھی بتادو۔ ابلیس مسکرایا اور کہا کہ

یکے درستی آدم نگر از من چہ می پرسی  
چنان موزوں شود اس پیش پا افتادہ مضمونے

بنو زاندر طبیعت می خلد موزوں شود روز  
کہ یزداں رادل از تاثیر او پرخوں شود روز

بہر حال زمانہ اسی طرح آگے بڑھنا گیا اور آدم خواب سے بیدار نہ ہوا۔ تا آنکہ

## بیداری۔ آسمان پر کائنات

آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار  
ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار  
اس کر ملک شب کو رے سے کیا ہم کو سرکار  
تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار  
اونچی ہے تریا سے بھی یہ خاک پُر اسرار  
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت دستار

اک رات ستاروں نے کہا نجم سے  
کہنے لگا مریخ او افہم ہے تفتدیر  
نہ رونے کہا اور کوئی بات نہیں ہے  
بولامہ کامل کہ وہ کو کب سے زمینی  
واقف ہو اگر لذت بیداری شب سے  
آغوش میں اس کے وہ تجلی ہے کہ جس میں

ناگاہ فضا بانگِ اذان سے ہوئی لبریز

وہ نعرہ کہ بل جاتا ہے جس سے دل کہسار

اذان کی آواز پہاڑوں سے ٹکرائی اور ساری وادی اس دلولہ انگیز نعرے سے گونج اٹھی کہ

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد      ایں مشتِ غبائے را انجم بہ سجود آمد

آدم نے ہزاروں سال کے بعد آنکھ کھولی۔ اس کے جاگنے سے سارا عالم جاگ اٹھا۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی۔ جس دنیا میں وہ سویا تھا وہ دنیا کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک نئی دنیا میں تھا۔ روح کائنات ایک بار پھر بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آئی۔ اس نے پوچھا کہ یہ آواز کیا تھی کہاں سے آئی اور کس نے دی؟ اس نے کہا کہ یہ آواز خاکِ پاکِ حجاز سے اٹھی۔ بلالؓ کے حلق سے نمودار ہوئی اور ساری دنیا کو یہ کہہ گئی کہ

خودی کا سہ نہاں لا الہ الا اللہ      خودی بے تیغِ فساں لا الہ الا اللہ

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند      بُتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند

بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

اس آواز کو اذان کہتے ہیں۔ یعنی وحدتِ خالق اور وحدتِ آدم کا نعرہ انقلاب۔ وہی اذان جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

یہ سحر جو کبھی فردا بے کبھی ہے امروز      نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے بستانِ وجود      ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذان سے پیدا

یہی اذان ہے جو تمہاری بیداری کا موجب ہوتی ہے۔ اگر یہ اذان بلند نہ ہوتی تو آدم کبھی خواب سے بیدار نہ ہو سکتا۔ اب تو اٹھ اور پھر اپنا مقام پہچان۔

تو مرو میدانِ تو میرِ شکر      توری حضوری تیرے سپاہی

کچھ قدر اپنی تونے نہ جانی      یہ بے سواد ی یہ کم نگاہی

تو نے اذان کے الفاظ کو سنا ہے۔ اس کی حقیقت کو کبھی اچھی طرح سمجھ لے کہ

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ دیکتا      اتر گیا جو ترے دل میں لا شریک لہ

جس کے دل میں "لَا شَرِيكَ لَهُ" اتر جاتے اسے بندۂ مومن کہتے ہیں اور

مقام بندۂ مومن کا ہے درائے پہر  
زمین سے تابہ تریا تمام لات و منات

حريم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی  
نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

اس پیامِ زندگی سے آدم کے دل میں نئی آرزوئیں بیدار ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی

اس کی مایوسیاں امیدوں سے بدل گئیں۔ دنیا اس کی نگاہوں میں پھر حسین نظر آنے لگی وہ نئے

ارادوں اور نئے ولولوں سے اٹھا اور ذوق و شوق کی ایک دنیا اپنے دل میں لئے اس سمت روانہ

ہوا جدھر سے بانگِ اذان اس کے کان میں پڑی تھی چلتے چلتے وہ حجاز کی وادیوں میں جا پہنچا۔

اس نے دیکھا کہ ایک وسیع و رفیع قلعہ ہے جس کے دروازے پر جلی حروف لکھا ہے۔

مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (۹)

وہ دروازے پر ٹھٹکا کہ نہ معلوم اس حصارِ امن و عافیت میں داخلے پر کیا پابندیاں ہوں۔ پہرے دار

نے کہا کہ اس میں داخل ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔ صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ انسان کے

پاس قلبِ سلیم ہونا چاہیے۔ اور تمہارے خلوص اور تسلیم کی اس سے بڑھ کر ویل اور کیا ہوگی کہ تم ان

سلامتی کی تلاش میں ہزاروں میل سے چل کر آئے ہو۔ اَدْخُلُوهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِيْنَ ؕ وَ نَزَعْنَا

مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ رِّجْلٍ اِخْوَانًا (۲۶... ۱۵/۲۷) اس میں امن و سلامتی کے ساتھ

داخل ہو جاؤ۔ اس میں داخل ہونے والوں کے دلوں سے کدورت، کینہ، عداوت، باہمی کبیدگی کی تمام

آلاتشیں دور ہو جاتی ہیں اور وہ خلوصِ قلب سے ایک دوسرے کے بھائی بن جاتے ہیں۔

آدم کو کسی ایسے ہی مقام کی تلاش تھی۔ اس نے پہرے دار کو سلام کیا اور شاداں و فرحان

قلعے کے اندر چلا گیا۔

وہ جانے کو تو اندر چلا گیا لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ فی الواقعہ ایک ایسا مقام ہے جہاں

کوئی انسان دوسرے انسان کا گلا نہیں کاٹتا۔ جہاں کوئی سر بریدہ اپنا سر متصلی پر لئے جوشِ انتقام

میں دیوانہ وار کسی کے پیچھے پیچھے نہیں پھرتا؟ وہ رہ رہ کر اپنے آپ سے پوچھتا کہ یہاں فی الواقعہ

خوف اور ترن کو کوئی دخل نہیں؛ کیا یہاں پہنچ کر انسان سچ مچ زمین کی پستیوں سے آسمان

کی بلندیوں کی طرف ابھرنے لگ جاتا ہے؟ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ خیالات پیدا ہو رہے

تھے۔ ان وساوس کے هجوم نے اس کے پاؤں میں لڑکھڑاہٹ سی پیدا کر دی۔ قریب تھا کہ وہ بیٹھ جائے یا پچھے لوٹ آئے کہ اس نے سنا کہ کہیں دُور افق کے اس پار سے یہ حیات آفریں آواز آ رہی ہے کہ کیوں گھبراتے ہو، کیوں خوف کھاتا ہے۔

خدا نے لم یزل کا دستِ قدرت تو زبانِ توبے  
پسے ہے چرخِ نیلی فام سے منزلِ مسلمان کی

یقین پیدا کرے غافل مغلوب گماں تو ہے  
ستارے جس کی گرو راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

تری فطرت میں ہے ممکناتِ زندگانی کی

جہاں کے جوہرِ مضمحل کا گویا امتحان تو ہے

نہ معلوم اس آواز میں کیا سحر تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے اندر ایک نئی دنیا بیدار ہو رہی ہے۔ اسے ایسا نظر آ رہا تھا کہ جو کچھ وہ پہلے تھا وہ گم ہو رہا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا آدم جنم لے رہا ہے وہ آدم کہ جس کی خاک کا ذرہ ذرہ اُبھر کر کہہ رہا ہے کہ

زمینِ خاکِ درِ میخانہ ما  
فلکِ یکِ گوشِ پیمانہ ما

حدیثِ سوز و سازِ مادرِ از است  
جہاں دیبِ اچہ افسانہ ما

اس نئے آدم نے محسوس کیا کہ اس کے اندر عجیب و غریب قوتیں نمودار ہو رہی ہیں۔ اسے ایسا نظر آتا تھا کہ سحر و برکی و سقین سمٹ کر اس کی مٹھی میں آگئی ہیں۔ پہاڑوں بلکہ آسمانوں کی بلندیاں نیچے اتر کر اس کے لئے فرشِ راہ بن گئی ہیں۔ وہ اب اپنے آپ کو ساری کائنات سے اونچا دیکھ رہا تھا۔ اسے بوں و کھائی دیتا تھا گویا وہ زمین کو چھوڑ کر فضا میں اڑتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ تبدیلیاں کس طرح پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ انقلاب کس وجہ سے آ رہا ہے۔ وہ اسی حیرت میں گم تھا کہ اس کے کان میں آواز آئی کہ اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں حقیقت یہ ہے کہ

جب اس انکارِ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا

تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روحِ الایں پیدا

اس یقین سے اس کے جوہرِ خفّہ کی نمود ہو جاتی ہے۔ اسی سے اس کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں زمان و مکان کے محدود پیمانوں سے نہیں باہر جاسکتیں۔



کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

وہ حیران تھا کہ یہ آوازیں بار بار کہاں سے آتی ہیں جو اس کے دل میں پیدا ہونے والے ہر شبہ کا ازالہ کر کے اس کے اضطراب کو تسکین میں بدل دیتی ہیں۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتے اس سمت کو ہونے لیا۔ جدھر سے یہ آوازیں آرہی تھیں۔ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ ایک وسیع و عریض میدان ہے نہایت سرسبز و شاداب، سایہ دار گھنیرے درخت پھلوں سے لدے ہوئے، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے اُبلتے ہوئے چشمے اور ناچتی ہوئی ندیاں، ہرے بھرے کھیت اور ان کے اناج سے لدے ہوئے خوشے، ہر سمت تازگی اور ہر طرف شگفتگی۔ اس میدان میں ادھر ادھر تندرست و توانا انسانوں کے گروہ تھے۔ جن کے چہروں سے سکون و طمانیت کا نور برس رہا تھا۔ ہر شخص کام میں مصروف لیکن کسی کی کسی حرکت سے تکان یا افسردگی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ جو یہی آدمِ نو اس میدان میں داخل ہوا چاروں طرف سے سلاماً سلاماً کی طمانیت تہنیت سے فضا گونج اٹھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل سے غیریت اور بیگانگی کے تمام حجابات دُور ہو گئے۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ انہی میں سے ایک ہے اور یہ سب اس کے عمر بھر کے ساتھی ہیں۔ اتنے میں کھانے کا وقت آگیا اور وہ سب ایک دسترخوان کے گرد بیٹھ گئے۔ نئے کوئی غفور و خاقان نے فقیرہ نشیں۔ کسی میں کوئی فرق اور کوئی تخصیص نہ تھی۔ اس نو وارد کے لئے یہ انداز بالکل نرالا اور یہ اسلوب غیر مانوس تھا۔ ان میں سے ایک

نے اس کی حیرت کو بھانپ کر کہا کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں؛

آبِ دِوَانِ مَارْتِ یَکِ مَائِدَہٗ دُودَہٗ آدَمِ کَنْفَسِ وَاحِدَہٗ

یہاں ہر شخص کام کرتا ہے لیکن کام کے حاصل کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔

بندۂ مومن ہیں، حق مالک است غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است

یہ باتیں تمہیں نئی نئی سی اس لئے دکھائی دیتی ہیں کہ تم ایک دوسری دنیا سے آئے ہو ورنہ یہ تو ایسی کھلی ہوئی حقیقت پر بینی ہیں کہ ان کے سمجھنے میں ذرا بھی وقت نہیں ہو سکتی۔ تم حیران ہو کہ ہم زمین میں بل چلاتے ہیں۔ سال بھر محنت کرتے ہیں اور اس کے بعد ساری فصل کو خدا کے بندوں کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے لئے صرف اپنی ضروریات کے مطابق رکھتے ہیں۔ تم ہماری محنت کو تو دیکھتے

ہو لیکن یہ بھی سوچو کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تابی میں کون؟  
 کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار  
 کون دریاؤں کی موجوں کا اٹھا تپا ہے سحاب  
 خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب  
 کس نے بھردی تو یوں سے خوشہ گندم کی جیب  
 موسموں کو کس نے سکھلائی ہے غم سے انقلاب

جس نے یہ سب کچھ کیا ہے، ملکیت کا حق اس کا ہے یا تمہارا اور میرا؟ بس اتنا سائل ہے جس کی اوٹ  
 زندگی کا سارا پہاڑ کھڑا ہے۔ جو یہ سب کچھ کرتا ہے اس کا نام رازق ہے اور اتنی سی بات کے سمجھ لینے  
 سے سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک  
 اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دار و جسم

ہماری دنیا میں حرام اور حلال کا یہی معیار ہے جو رازق اس معاشرے سے ملے جس میں انسان صرف  
 امین ہوں وہ رزقِ حلال اور جس میں رزقِ انسانوں کی ملکیت قرار پا جائے اور اس طرح اس کی  
 نسبت غیر اللہ کی طرف ہو جائے وہ رزقِ حرام۔ تم یہاں جس قدر قوت و توانائی اور طاقت پر داز و  
 برو مندی دیکھ رہے ہو سب رزقِ حلال کی بدولت ہے۔

علم و حکمت زاید از نانِ حلال  
 عشق و رقت آید از نانِ حلال

اور اس نکتے کو یاد رکھو کہ

زندگی جز لذتِ پرواز نیست  
 آشیاں با فطرتِ اوساز نیست

جب زندگی نام ہی لذتِ پرواز کا ہے تو اس بات کے سمجھنے میں کیا دشواری پیش آ سکتی ہے کہ

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ہمارے معاشرے میں چونکہ ہر ایک کو رزقِ حلال ملتا ہے اس لئے کسی کی پرواز میں کوتاہی نہیں آ سکتی۔  
 اور اس کا راز یہ ہے کہ یہاں ہر فرد، دوسرے کی سود و بہبود کی فکر میں مصروف کار رہتا ہے۔ "سود خویش"  
 کی جگہ "سودِ ہمہ" یہاں کے نظام کا عروۃ الوثقی ہے کیونکہ یہاں ہر فرد خدا کی صفتِ رب العالمین کا  
 منظر ہے۔ ہماری ساری تعلیم کا ما حاصل یہ ہے کہ

کس نباشد درجہاں محتاج کس نکتہ شرع میں این است بس

اس نووارد نے پوچھا کہ تم اپنے معاملات کس طرح طے کرتے ہو۔ یعنی یہاں حکومت کا انداز کیا ہے؟ حکومت کا لفظ سن کر اس مخاطب کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے کہا کہ ہمارے ہاں حکومت کا تصور ہی نہیں۔ یہاں کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر حکم نہیں چلا سکتا۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ

سروری زیبا فقط اس ذات ہے بہتاکو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آوری

ہمیں خدا کی طرف سے ایک کتاب ملی ہے جس میں نظام زندگی کے لئے محکم اور غیر تبدیل اصول درج ہیں۔ اس کا نام قرآن ہے۔ اس لفظ کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر متمہاہٹ آگئی۔ ایک ثانیہ کے لئے گہری سوچ میں ڈوب کر اس نے سر اوپر کو اٹھایا اور کہا کہ تم نہیں جانتے قرآن کیلئے!

دستگیر بندہ بے ساز و برگ

نقشہ ہائے کاہن و پاپا شکست

این کتابے نیست چیزے دیگر است

جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

چیت قرآن؟ خواجہ را پیغام مرگ

نقش قرآن تادریں عالم نشست

فاش گویم آنچه در دل مضمراست

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

اس صلابت زندگی کے محکم اصولوں کی روشنی میں ہم اپنے معاملات علم و عقل کی رُو سے طے کرتے ہیں اور ہم میں جو سب سے زیادہ صاحب فکر و عمل ہوتا ہے وہ ان فیصلوں کو جماعتی حیثیت سے نافذ کرتا ہے۔ نووارد نے پوچھا کہ اس صاحب فکر و عمل کو تم کیا کہتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ وہ ہمارے ہی جیسا ابن آدم ہوتا ہے۔ اسے ہم بندہ حق کہتے ہیں اور

لے غلام اور اندکس را غلام

ملک آینش خدا داد است و بس

زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

بندہ حق بے نیاز از ہر مقام

بندہ حق مرد آزاد است و بس

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن

اس کا نام ہماری اصطلاح میں مرد مومن ہے۔ وہ مرد مومن جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت  
ہمسایہ جبریل میں بسندہ خاکی  
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن  
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے  
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم  
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان  
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان  
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن  
دنیا میں بھی میزانِ قیامت میں بھی میزان  
دیاؤں کے دن جس کے دل جائیں وہ طوفان

فطرت کا سرِ دوازیلی اس کے شب و روز

آہنگ میں یکتا صفت سورہٴ رحمن

خاک کے ذرے اپنی ارتقائی منازل طے کرتے کرتے پیکرِ آدم تک پہنچے اور آدم اپنی ارتقائی منازل  
طے کرنے کے بعد مقامِ مومن تک پہنچتا ہے۔ اور

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے مومن کا مقام ہر کہیں ہے

مومن، فطرت کا شاہکار اور دائرہٴ کائنات کا نقطہٴ پرکار ہے۔ کائنات میں مومن کے مقام سے بلند اور  
کوئی مقام نہیں۔

مومن بالائے ہر بالاتر سے غیرت اور برنتا بدہمسرے

پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی۔

عالم ہے فقط مومن جانناز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

یہ مومن ہی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات ذوقِ سف کے سوا کچھ اور نہیں

لیکن اس کا ذوقِ سفر ناقہ بے زمام کی آوارگی نہیں کہ جدھر منہ اٹھایا چل دیتے۔ اس کے سامنے

زندگی کا متعین نصب العین ہے اور اس کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔ یہ نصب العین

اس کا اپنا متعین کردہ نہیں بلکہ اس ضابطہٴ حیات کی رو سے متعین شدہ ہے جو اس کی زندگی کی اساس

ہے۔ وہ فضا کی پہنائیوں میں پورے زور بازو سے اڑتا ہے لیکن اپنی منزل مقصود کو کبھی لگا ہوں سے

اوجھل نہیں ہونے دیتا۔

پزدور وسعتِ گردوں یگانہ نگاہِ اوبشاخِ آشیانہ

مہ و انجم گرفتار کندش بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ

دُشْران کے محکم اصولوں کے ساتھ اس درجہ وابستگی اور اس کے بعد اپنے زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے میں اس درجہ آزادی۔ یہ ہیں وہ عناصر جن سے اس کی سیرت مرتب ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

نہ اس میں عصرِ رواں کی جیسا سے بیزاری

نہ اس میں عہدِ کین کے فسانہ و افسوں

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی

عناصر اسکے ہیں رُح القدس کا ذوقِ جمال

یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

عجم کا حسنِ طبیعتِ عرب کا سوزِ دروں

آدم نے کہا کہ میں نے یہ سب کچھ سمجھ لیا۔ میں لفظاً لفظاً تم سے متفق ہوں کہ زندگی اسی کا نام ہے

باقی سب وہم و تخیلات ہیں۔ میں اپنا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ مجھے اس حلقے میں شامل کر لیجئے۔ سننے والے

نے کہا کہ ذرا اور سوچو۔

یہ شہادت کہ الفت میں قدم رکھنا ہے

لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

اس نے کہا کہ میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میرا فیصلہ مشرق اور مغرب کے خلاف

اعلانِ جنگ ہے۔ لیکن میں یہ اعلانِ عقل و مہوش اور قلب و نگاہ کی پوری تائید کے ساتھ کر رہا ہوں۔

اشھدان لا الہ۔ اشھدان لا الہ۔ سننے والے نے کہا کہ

لا الہ کوئی بگواروئے جاں

تاز اندام تو آید بوئے جاں

ایں دو حرفِ لا الہ کفار نیست

لا الہ جز تیغِ بے زہار نیست

زیستن با سوزِ او قہاری است

لا الہ ضرب است ضربِ کاری است

اس نے کہا کہ میں نے یہ بھی سمجھ لیا۔ اب مجھے بتا دیجئے کہ مجھے کرنا کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اس کا سمجھنا

کیا مشکل ہے۔ جاؤ دنیا میں چلو پھرو اور جہاں جہاں انسان اور خدا کے درمیان کوئی قوتِ حائل نظر

آتے۔ اسے درمیان سے ہٹا دو تا کہ بندہ اپنے خدا کو اپنے سامنے بے حجاب دیکھ لے اور زمین اپنے

پرورش کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ تم دیکھو گے کہ

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے

قیامت ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکاری ہے

جاؤ اور صورتِ اسرافیل لے کر ساری دنیا میں اعلانِ کردو کہ

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو  
تم دیکھو گے کہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق کے سرچشموں پر انسان سانپ کی طرح گھیرا ڈال کر بیٹھے ہیں۔  
جاؤ اور انہیں نقیبِ فطرت کا یہ پیغام ازلی سنا دو کہ  
تدبیر کی فسوں سازی سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدن کی بنا سر پر داری ہے  
تم مکتبوں اور خانقاہوں میں دیکھو گے کہ

شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ  
مذرا نہ نہیں سو دہے پیرانِ حرم کا  
میرا شہیں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد  
یہ فریب کب تک قائم رہے گا جاؤ اور انسانوں کے ان خود ساختہ پردوں کو الگ اٹھا کر پھینک دو۔  
کیوں خالق و مخلوق میں حامل ہیں پردے  
حق را بس جو دے صنماں را بطوائفے  
جاؤ اور ان تک خدا کا یہ پیغام پہنچاؤ کہ  
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو  
میں ناخوش و بیزاریوں مہر کی سلوں سے  
تم دیکھو گے کہ۔ ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو۔ آدمی کی تعظیمِ آدمی کی حیثیت  
سے کہیں باقی نہیں رہی۔ کہیں اس کی عزت، دولت کی وجہ سے ہوتی ہے کہیں جاہ و منصب کی وجہ  
سے کہیں وہ رنگ و نسب سے پہچانا جاتا ہے کہیں ملک و قوم کی نسبت سے۔ دنیا میں انسان  
کی سب حیثیتیں اضافی رہ گئی ہیں۔ اس کی ذاتی حیثیت کہیں باقی نہیں رہی حالانکہ اس کے پیدا  
کرنے والے نے کہا تھا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ۔ ہم نے آدم کو بہ حیثیتِ آدم باعثِ عزت و  
تکریم بنایا ہے۔ جاؤ اور مہذب دنیا کے ایک ایک گوشے میں اعلان کر دو کہ

برتر از گردوں مقامِ آدم است اصل تہذیب احترامِ آدم است  
اس نے کہا کہ اس انقلابِ عظیم کے لئے مجھے کچھ ساز و سامان دے دیجئے۔ اس نے اس کے ایک ہاتھ  
میں قرآن اور دوسرے میں تلوار دے کر کہا کہ  
ایں دو وقتِ حاملِ یک دیگر اند

کائناتِ زندگی را محور اند

اور ان دونوں کے مجموعے کا مطلب یہ ہے کہ یہی تلوار  
لا دیں ہو تو ہے زہرِ بلاہل سے بھی بڑھ کر ہو دیں کی حفاظت میں تو ہرزہ ہر کا تریاق  
اور دین سے مراد ہے جمعیتِ آدم کا ضابطہ نظامِ جو وحی کی بنیادوں پر متشکل کیا گیا ہو۔ اس لئے  
باخبر شواہد مقامِ آدمی

آدم نو اس ساز و یراق اور اس جاہ و طمطراق کے ساتھ خراماں خراماں سوئے قوم آیا اور اک نسخہٴ کیمیا  
ساتھ لایا۔ وہ اس طرح دنیا میں رہنے والوں کی طرف آ رہا تھا اور زمین کے ذرے ابھرا بھر کر اس کے  
قدم چوم رہے تھے۔ آسمان جھک جھک کر اسے سلام کر رہا تھا اور فضا میں چاروں طرف سے یہ  
تہنیت بار زمرہ بیدار ہو رہا تھا کہ

برتر از گردوں مقامِ آدم است اصل تہذیبِ احترامِ آدم است  
اور آسمان کی بلندیوں سے کوئی پکار کر کہہ رہا تھا کہ  
عروجِ آدمِ خاکی سے انجم ہے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ میرِ کامل نہ بن جائے  
اتنے میں آنسوئے افلاک سے ندائے جمال نے نہایت محبت آمیز انداز سے کہا کہ آدم! تم یہاں سے  
گئے تھے۔ اب پھر یہیں آ جاؤ۔ آدم نے نگاہ اوپر کو اٹھائی اور تعظیم اور شوخی کے ملے جلے حسین تبسم آمیز  
لہجے میں کہا۔

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟  
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر



# مجلسِ قلندِ انِ اقبال

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالوہاب عزائم کے 'ضربِ کلیم' کے عربی ترجمہ کا تعارف پرویز صاحب نے لکھا تھا۔ ڈاکٹر عزائم (مرحوم) نے صرف 'ضربِ کلیم' کا ترجمہ نہیں کیا تھا اصل یہ ہے کہ دنیا نے عرب کو پیامِ اقبال کی روشنی سے منور کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ یہ شمع کس طرح سے روشن ہوئی اور اس کی روشنی کس طرح پھیلی یہ داستان بڑی دلکش بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ اسے پرویز صاحب کے رفیقِ قدیم محترم خورشید عالم صاحب نے قلمبند کیا تھا اور وہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوئی تھی۔ ہم زیرِ نظر تالیف کا اہتمام اسی داستان پر کرتے ہیں کہ اس سے موزوں تر مقطع کا بند کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

(طلوعِ اسلام ٹرسٹ)

شروع ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے کہ محترم پرویز صاحب کو یہ پیغام ملا کہ نئے سیفر مصر ان سے ملنے کے متمنی ہیں۔ مملکتِ مصر کا نمائندہ اور ایک درویش سے ملنے کی خواہش! بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پرویز صاحب اسی پر کم متوجہ تھے کہ پیغام مہر نے کہا کہ ان کے اس شوقِ ملاقات کا جذبہ محرکہ وہ نسبت ہے جو آپ کو اقبال سے ہے۔ اس پر پرویز صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ سارا نقشہ پھر گیا جس کا تجربہ انہیں عمر بھر ہوتا رہا ہے، کہ کس طرح "بڑے لوگ" ضرورت کے وقت اقبال سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں اور یوں طالبِ علمانِ اقبال سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس خیال نے پرویز صاحب کے دل سے اس بلکے سے ردِ عمل کو بھی ختم کر دیا جو مجرد تمنائے ملاقات سے قدرتا



پیدا ہوا تھا، چنانچہ انہوں نے معذوری کا اظہار کیا۔ لیکن پیغامبر (سید عبدالواحد صاحب سیکرٹری مجلس اقبال) نے اصرار کیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ صاحب موصوف کی طلب صادق ہے اور جذبہ خالص۔ ناچار پرویز صاحب آمادہ ملاقات ہو گئے۔

پہلی ملاقات سفارت خانہ مصر میں ہوئی۔ یہ اس لئے کہ پرویز صاحب وہاں خود چلے گئے تھے ورنہ سفیر صاحب نے تو یہ کہلا بھیجا تھا کہ انہیں بتایا جائے کہ کب اور کس وقت وہ پرویز صاحب سے ملنے کے لئے آئیں؟ سفارت خانے عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ان میں جھانک کر دیکھئے۔ شان و شوکت، ٹھاٹھ باٹھ، تصنع، تکلف، ظاہر داری (بے اختیار منافقت کا لفظ زبان پر آ رہا ہے) اور دیگر بے شمار بظاہر حسین مگر باطن خبیث، دخترانِ مادر ڈپلومیسی قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ تن کی دنیا ہے جو "سو و سودا مکر و فن" سے معمور ہے نہ کہ "سوز و مستی جذب و شوق سے آباد" من کی دنیا۔ اس جہانِ گندم و جو میں ان درویشوں کا کہاں گزر جن کے قلوب واذہان میں قرآن اور اقبال نے اقدار کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہو جس میں اضطرابِ موج کے ساتھ ساتھ سکونِ گہر بھی ہو جو بدلتے رہنے کے باوجود نہ بدلیں اور جن کی حالت یہ ہو۔

زبرون درگذشتم ز درونِ خانہ گفتم  
سخنے نگفتہ راجہ قلندرانہ گفتم

بہر حال پرویز صاحب گئے اس حال میں کہ "آیا نہیں لایا گیا ہوں"۔ سفیر مصر ڈاکٹر عبدالواہب عزام سے ملاقات ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد پرویز صاحب نے محسوس کیا کہ وہ کاخِ نمائندہ شاہی میں نہیں بلکہ کسی حجرہ درویش میں ہیں۔ وہ درویشِ خدا مست نہ شرتی ہے نہ غربی۔ ایک طرف ان کا علم و فضل تھا جو عالمانہ نمائش سے پاک تھا۔ اس میں سراسر طالبِ علمانہ تجسس تھا۔ دوسری طرف ان کا عشق تھا جس نے انہیں سراپا سوز و گداز بنا رکھا تھا۔ یہ اقبال ہی کا فیض ہو سکتا تھا۔ اب پرویز اور عزام اس دنیا میں تھے جہاں تمام حجابات یک لخت اٹھ جاتے ہیں اور ملنے والے من تو شرم تو من شرمی کی حقیقی "أَلْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ" کی تصویر بن جاتے ہیں۔

یہ منفرد ملاقات "مجلس قلندرانِ اقبال" کا نقشِ اول بنی۔ اس بے مثل مجلس کی کوئی باقاعدہ

رسمی تاسیس نہیں ہوئی۔ حتیٰ تو یہ ہے کہ اس کا بیج ارکانِ مجلس کی کشتِ جاں میں بودیا گیا۔ اس کا باقاعدہ نام بھی تجویز نہیں ہوا۔ جوں جوں سفر بڑھتا گیا مجلس کا نقشہ صاف تر ہوتا گیا تا آنکہ اسے ایک وقت سے مجلس قلندرانِ اقبال کہہ دیا گیا اور پھر اسے یہی کہا جانے لگا۔ بہر حال مجلس کی طرح یوں پڑی کہ عزام صاحب نے جو پیامِ مشرق کا عربی ترجمہ مکمل کر چکے تھے اور اس کی اشاعت کے انتظامات میں مصروف تھے، یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں (عوام صاحب اور پرویز صاحب کو) باقاعدہ ملتے رہنا چاہیے تاکہ وہ آئندہ جس کتاب کا ترجمہ کریں، اسے ترجمے سے پہلے اکٹھے بیٹھ کر ازل تا آخر پڑھ لیں۔ سید عبدالواحد صاحب جنہوں نے پیغامِ سری کے فرائض سرانجام دیتے تھے بے اختیار بول اٹھے کہ اگر ایسی بات ہے تو اس میں انہیں بھی شریک کیا جائے تاکہ وہ بھی ان مباحث سے مستفید ہو سکیں۔ اس سے بات چل نکلی اور یہ فیصلہ ہوا کہ جو اور احباب اس محفل میں شریک ہونا چاہیں انہیں بھی شریک کر لیا جائے لیکن صرف انہی کو جو اس میں قلندرانہ رنگ میں شریک ہونا چاہیں۔ اس طرح ایک باقاعدہ اجتماع منعقد ہونا شروع ہوا۔

رفتہ رفتہ قلندروں کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ گویا یہ حضرات بھی تھے جو کبھی کبھی آجاتے تھے لیکن ایک درجن کے قریب بالعموم پابندی سے شریکِ مجلس ہوتے رہے۔ لفظ "پابندی" شاید موزوں نہ ہو، لیکن ہم سب کا یہ حال تھا کہ مجلس ہو رہی ہوتی تو ہم اس میں شریک ہوتے تھے اور نہیں ہو رہی ہوتی تھی تو اس کے لئے انتظار اور تیاری میں لگے رہتے تھے۔ ہمارے لئے یہ وہ غذا جس کے بغیر نہ سینے کی کشو ممکن ہے، نہ قلب کا حضور، اور جب یہ دولت ہاتھ آجاتی ہے تو — کوئی اس کو بے قیام ہوش و حواس ہاتھ سے نہیں جانے دینا اور قلندرانِ اقبال کے لئے تو ہوش و حواس کا کھونا از قبیل محالات ہے۔

باچنیں زردِ جنوں پاسِ گریباں و اشتم

در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

مجلس بالعموم ہفتے میں ایک بار منعقد ہوا کرتی تھی۔ ہفتہ واری اجتماع کسی مجلس کے لئے بظاہر بڑا کافی ہے لیکن جن کے نزدیک گردشِ میل و نہار کا معیار اوقات ہماں بود کہ با یارب رفت انھیں تو ہر وقت یہ غلشِ احساس رہتی ہے کہ "چیفِ در چشمِ زردن صحبتِ یارِ آخر شد" مجلس کے لئے دن کا کوئی

تعیین نہیں تھا۔ گو وقت عموماً شام کے پانچ بجے کا ہوا کرتا تھا۔ یہ دن کی عدم تعین فلندروں کے شوق کا عجیب امتحان ہوا کرتی تھی۔ ہر رات اور نئی کیفیات کی حامل۔ عام طور پر مجلس برخاست ہونے سے پہلے یہ طے کر لیا جاتا تھا کہ آئندہ اجتماع کب ہو؟ اس میں ایک رکاوٹ ہوا کرتی تھی اور وہ تھی سفیر صاحب کی سرکاری مصروفیات۔ انہیں بہر حال ان کے مطابق وقت مقرر کرنا پڑتا تھا۔ اور محفل صرف اسی ایک رکاوٹ کے سامنے جھکنے کے لئے تیار ہوا کرتی تھی ورنہ کوئی اور مصروفیت آئندہ یوم انعقاد کے تعین میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تعین کا منظر بھی قابل دید ہوا کرتا تھا۔ آئندہ کب؟ کے سوال پر سفیر صاحب اپنی ڈائری منگواتے تاکہ معین مصروفیات کا جائزہ لیں۔ گو انتظار کیا جاتا کہ سفیر صاحب ڈائری دیکھ کر فارغ دن کا اعلان کریں لیکن بے صبری یا بے خودی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ڈائری آتے آتے کسی دن "مقرر" ہو جایا کرتے تھے۔ ڈائری آتی تو سفیر صاحب اس کی ورق گردانی کرتے اور مجلس ان کے چہرے کو پڑھتی۔ خود سفیر صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کہیں ہفتے سے زیادہ کا وقفہ ہو گیا ہے تو وہ متردّد نظر آتے تھے۔ اس وقت عجیب "سودا بازی" شروع ہو جاتی۔ چلتے چلتے صبح صبح آجائیں گے۔ اچھایوں کیجئے۔ آپ ڈنر سے واپس آئیے اور پھر شب درمیان ہوئی۔ بہت سا حساب بیک ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ ایسے ہی رات کی بات ہو رہی تھی تو سفیر صاحب نے بڑی بیساختگی سے کہا "حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ" اس کے بعد مجلس میں یہ ضرب المثل ہو گئی تھی۔ اس سے ذوق و شوق کے پیمانوں کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ مجلس کا وقت اس خیال سے مقرر کیا گیا کہ اس سے فارغ ہو کر سفیر صاحب اپنی "غیر مجلسی" مصروفیت سے عہدہ برآ ہو سکیں گے لیکن ذوق حضورِ دل میں طرے طرح کی راہیں تراشنا شروع کر دیتا۔ "یہ موضوع زیادہ اہم ہے"۔ "یہ سب زیادہ غور طلب ہے"۔ "اسے ایک ہی نشست میں نمٹالینا چاہیے" وغیرہ وغیرہ۔ سب کورہ رہ کے خیال اور بہت حد تک افسوس) سفیر صاحب کی مصروفیت کا آرہا ہے۔ سفیر صاحب ہیں کہ فرما رہے ہیں کہ مجھے بھی جلدی نہیں تیار ہو کر چلے جانا ہے۔ چند منٹ اور بیٹھ لیتے ہیں، چند منٹ اور۔۔۔ تا آنکہ ایک منٹ کا پس منظر پیشِ خلافِ مصلحت ہو جاتا اور سب بادلِ خواستہ اٹھ کھڑے ہوتے۔

کسی مجلس کے ذکر یا تصور سے معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے عہدیدار کون ہیں؟ سطور بالا سے آپ کی توجہ شاید اس طرف نہ گئی ہو یا ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ نتیجہ نکال لیا ہو کہ

مجلس قلندران اقبال میں مناصب کی تقسیم نہیں ہوگی۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ ہو بھی کیسے؟ اس مجلس کو باقاعدہ طور پر معرض وجود میں نہیں لایا گیا اور یوں بھی اس کی اٹھان اور فضا انجمنوں کے عام انداز و معیار سے بالکل مختلف رہی۔ لیکن نہیں۔ اس میں بھی مناصب پیدا ہو گئے تھے اور اس طریق سے جیسے وہ پہلے سے "مقدر" تھے۔

سب سے بڑا "عہدہ" پرویز صاحب کو ملا۔ وہ شیخ قلندران کہلاتے۔ اس کی صورت یوں ہوئی ہر چند مجلس کی تشکیل سیر صاحب کی تحریک پر ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر پرویز صاحب نہ ہوتے تو یہ تحریک لباس تشکیل اختیار ہی نہ کر سکتی۔ اگر سیر صاحب نے مجلس کا ڈھانچہ تیار کیا تو پرویز صاحب نے اس میں روح پھونکی۔ چونکہ پرویز صاحب ہی اقبال پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے اور اپنے مطالعہ اقبال اور تدبر فی القرآن کی بدولت وہی اس کے اہل بھی تھے۔ اس لئے انہیں شیخ قلندران کہا جانے لگا۔ سیر صاحب کو بھی منصب سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اس میں ان کے سرکاری عہدے اور علمی مشاغل کی یہ رعایت رکھی گئی کہ انہیں "سیر اقبال" کا لقب دیا گیا۔ وہ نہ محض والہانہ جوش سے ہر جگہ اقبال کا پیغام پہنچاتے تھے بلکہ کلام اقبال کا عربی میں ترجمہ کر کے آپ نے پوری دنیائے عرب کو فکر اقبال کے نور سے منور کر دیا اور اس طرح اس دنیا کے لئے تنہا "سیر اقبال" قرار پائے۔

ایک منصب "ساقی" کا تھا۔ آج وہی ساقی ساقی گری کی شہرہ رکھ کر اس اجڑی محفل کی یاد کو دل و دماغ میں بساتے اس کی داستان گوئی کا فریضہ ادا کر رہا ہے۔ یہ منصب بھی بلاوجہ عطا نہیں ہوا۔ دراصل منصب بقدر ظرف عمل ہوتا تھا۔ ہر منصب کا استحقاق عمل تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ مجالس شروع ہوتی تو سیر صاحب کے ملازمین چائے کی تیاری شروع کر دیتے (میں نے اس وقت انہیں "ملازمین" محض تعارف کے لئے لکھا ہے۔ ورنہ وہ کبھی درحقیقت اس مجلس کا ایک جزو بن چکے تھے اور انہیں کسی بڑے سے بڑے بہانہ کی تواریح میں وہ لطف نہیں ملتا تھا) جب چائے تیار ہو چکتی تو چائے کا دور چلتا۔ شروع شروع میں ایسا ہوا کہ چائے آئی تو اتفاق سے راقم الحروف نے چائے بنائی۔ وہ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ چائے رکھ دی گئی لیکن شروع نہ کی گئی کیونکہ شیخ قلندران اپنا بیان ختم نہیں کر چکے تھے جو نہی بیان ختم ہوا سیر صاحب نے فرمایا: "ساقی" اور چائے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی بیساختہ داد دی گئی اور ساقی پر ساقی گری کی دائمی ذمہ داری آبروی چائے کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے ضرور ہوتا تھا اس کی تقسیم کی ذمہ داری ساقی پر نہ تھی۔

ساتی کا کام "سقایتِ مجلس" تک محدود تھا۔ تقسیمِ کام کا کام "قاسم" کے سپرد ہوا۔ قاسم ہمیشہ ساتی کے معاون رہے۔ ساتی کا پیالہ بڑھتا تو قاسم کی پلیٹ اس کے ساتھ پہنچتی۔ ساتی گرمی بڑی نازک ذمہ داری ہے، پھر قلندروں کی ساتی گرمی! کچھ پوچھتے نہیں۔ دس بارہ قلندرجن کی "ہر لحظہ نئی شان نئی آن" اسے کم دودھ، اُسے تیز قہوہ، یہ اتنی شکر وہ اتنی شکر۔ مجلس قلندران کی ساتی گرمی طرف شناسی سے کہیں زیادہ مزاج شناسی تھی اور مزاج شناسی کا امتحان شکر کے معاملہ میں ہوا کرتا تھا، کیونکہ جہاں ایسے قلندر تھے کہ جو چائے کو شکر آمیز کرنے کے روادار نہیں تھے وہاں ایسے قلندر بھی تھے جو تلخی چائے کو شکر سے انجلیں بنا کر کام دہن کی آزمائش کیا کرتے تھے۔ ساتی کو اس نسیب و فراز کی خصوصی رعایت مد نظر رکھنا پڑتا تھی۔ ساتی کو قاسم کی بھی خصوصیت سے رعایت رکھنا پڑتی تھی کیونکہ اس کی "قسمت" کی پلیٹ قاسم کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ قریباً ہر محفل میں دونوں آنکھوں آنکھوں میں پیالی اور پلیٹ کے ایسے سودے کر لیتے تھے کہ قلندروں کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔ اس راز کا افشاء کرتے ہوئے ساتی کو یقین ہے کہ اگر وہ اہل محفل سے پوچھتے کہ کیا وہ مجھے ساتی تسلیم نہیں کرتے تو اس کا جواب "ہلی" ہوگا۔ قلندروں کے انداز بڑے زالے ہوتے ہیں۔ ہاں تو یہ قاسم تھے سب کے ہر دل عزیز عزیز اس لئے ایک عہدہ جو دیا نہیں گیا لیکن جس کا پورا پورا استحقاق پایا جاتا ہے "علی بخش" کا ہے۔ یہ ان خدامِ مجلس کو زیب دیتا ہے جن کے دماغِ اقبال کو نہ پاسکے لیکن جن کے دل قلندروں کی طرح گرم اور ہاتھ قلندروں کی طرح سرگرم تھے۔ ابراہیم، خمیس، محمد وہ "علی بخش" ہیں جو سفیر صاحب کے خدامِ خانہ تھے۔ وہ مجلس کے دن کا اتنی ہی بیتابی سے انتظار کرتے تھے جتنا کہ بڑے سے بڑا قلندر کر سکتا ہے۔ دوپہر کے بعد ان کا سارا کاروبار بند ہوتا تھا۔ وہ محبت آمیز انہماک سے چائے اور اس کے لوازمات تیار کرتے تھے۔ یہ ذمہ داری طور پر ہمارے شریک نہیں تھے لیکن روحانی طور پر ہم سے بالکل جدا نہیں تھے۔

مجلس کا معمول یہ تھا کہ پروفیسر صاحب اقبال کے اشعار پڑھتے جاتے اور ساتھ ساتھ ان کی تشریح بھی کرتے جاتے۔ یوں بھی ہوتا تھا کہ نئی کتاب یا نیا موضوع شروع کرنے سے پہلے ایک جامع تہیہ تفریحی ہوتی جس میں موضوع کا بسوط بیان ہوتا۔ اقبال کا کلام اور پروفیسر صاحب کا بیان، محفل علمی اور جدانی طور پر ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتی۔ کراچی کی بے آب و گیاہ وادی میں مصری سفارت خانہ بمنزلہ نخلستان تھا۔ وہ نخلستان

جہاں رُوح کی بالیدگی کے بے حساب سامان تھے۔ پرویز صاحب کے بیان کے بعد یوں تو بہت کم کسی سوال کی گنجائش رہ جاتی لیکن جب کبھی ان کے علم کے سخیل بلند تک کسی کا کوتاہ ہاتھ نہ پہنچتا وہ درختِ خود جھک کر اس کے دامن کو بھر پور کر دیتا۔

ایسا بیان کوئی آدھے گھنٹے تک کے لئے ہوتا۔ اس کے بعد "علی بخش" محفل کا رنگ بدل دیتے۔ پھر محفل کا چارج ساتی کے سپرد ہوتا اور شیخ ذرا سستا لیتے۔ قلندر مطالعہ اقبال میں مستغرق بحرِ قرآن کی غواصی کر رہا ہوتا تو کیا اور چائے کی میز پر مائل بہ تفریح ہوتا تو کیا۔ وہ — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز — ہوتا ہے۔ دونوں اس کی ذات کے شعون ہیں اور وہ دونوں میدانوں میں قلندر ہے۔ وقفہ چائے میں لطافتِ ظرافت کی مخصوص فضا پیدا ہوتی۔ وہ فضا جس کے تصور سے اب بھی روح میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد "شمع" پھر شیخ قلندران کے سامنے پہنچ جاتی۔ پرویز صاحب ہمیں ان گزرگاہوں میں لے جاتے کہ ستارے بھی جن کی گردِ راہ بن جاتے اور فلکِ زمین معلوم دیتے۔ اس جذب و انہماک میں "سفرِ اقبالِ زمین کے ہنگاموں" کو نہ بھولتے اور انہیں پتہ ہوتا کہ ترجمہ کرتے وقت ان کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ وہ ان وقتوں کو پیش کرتے اور پرویز صاحب ان کا حل کرتے۔ سفرِ اقبال کے متعلق غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک زمانے سے اقبال کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ خود بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں۔ عربی تو ان کی مادری زبان ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی تک ہیں انہیں دستگاہ ہے۔ اس کے باوصف جب وہ پرویز صاحب سے ملے تو انہیں معلوم ہوا کہ جب علم و فکر، قرآن کی بھٹی سے ہو کر نکلتے ہیں تو کیا بن جاتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انہوں نے اب اقبال کو سمجھا ہے۔ انہوں نے سمجھا ہی نہیں، وہ سمجھاتے بھی پھرتے ہیں "سفرِ اقبال" کا لقب انہی کو زیب دے سکتا ہے۔ اب تک وہ پیامِ مشرق، ضربِ کلیم اور اسرارِ دروازہ کا عربی ترجمہ کر چکے ہیں۔ پہلے دونوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور تیسرا پریس میں تھا کہ آپ کا تبادلہ ہو گیا۔ آپ نے ایک کتاب اقبال کی سیرتِ فلسفہ اور شاعری پر بھی لکھی ہے۔ آپ نے ضربِ کلم کے ترجمے کا تعارف پرویز صاحب سے لکھوایا اور اپنے مقدمہ میں مجلس قلندران کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے۔

اس مجلس میں ضربِ کلیم، بالِ جبریل، ارمغانِ آجاز (حصہ اُردو) جاوید نامہ، اسرارِ دروازہ، پس چہ باید کرد، بانگِ دریا چیدہ چیدہ، لفظاً لفظاً پڑھی گئیں۔ ہمیں اس کمی کا احساس رہا کہ کوئی مختصر نوٹس مہیا نہ ہو سکا کہ جو ان مجالس کے نوٹ لے سکتا۔ یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے متعلق اس سے پہلے کبھی اتنا کچھ اور

اس طرح کہا یا سنا نہیں گیا۔ اگر یہ سب کچھ جمع ہو جاتا تو اقبالؒ پر کئی مجلدات تیار ہو جاتیں اور پھر شاید ایک عرصہ تک اس سے آگے بات نہ کی جاسکتی۔ لیکن بقول غالب۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ نہاں ہو گئیں

سفیرِ اقبالؒ نے دامن بھر بھر کے اس متنازع فقیر کو دنیائے عرب میں لٹا دیا۔

قارئین یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ مجلس قلندراں — ایک "ختم" کی تقریب بھی منایا کرتی تھی۔ یہ تقریب ہر کتاب کے خاتمہ پر منائی جاتی تھی۔ جب کسی کتاب کا اس قدر حصہ باقی رہ جاتا جسے آئندہ نشست میں ختم ہو جانا تھا تو اس کتاب کی آخری مجلس معمول سے ذرا دیر میں یعنی مغرب کے لگ بھگ منعقد کی جاتی۔ سفیرِ اقبالؒ اپنی کتاب پر لکھتے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت فلاں جگہ کتاب ختم کی گئی۔ پھر اس تحریر کے نیچے تمام قلندروں کے دستخط ہوتے اس کے بعد سب مل کر کھانا کھاتے۔ اس دعوت میں ساتی اور قاسم کے سب امتیازات ختم کر دیئے جاتے۔ ہر کوئی اپنا ساتی ہوتا اور اپنا قاسم تکمیل مرحلہ کی خوشی قلندروں کی پیشانیوں سے ہو پورا ہوتی اور گفتگو میں لطافت اور شوکتی بن کر ظاہر ہوتی۔ محفل کا یہ رنگ چائے کے لگ بھگ تو ہوتا مگر اس کا دوران زیادہ ہوتا۔

اس مجلس کی آخری نشست ۱۱ دسمبر ۱۹۵۴ء کی شام کو منعقد ہوئی۔ یہ نشست عاجلانہ طور پر طلب کی گئی کیونکہ کسی فزرائے قلندر کو یہ سوجھ گئی کہ سفیرِ اقبالؒ پاکستان سے رخصت ہو رہے ہیں تو ایک نشست کو "مشکل" کر کے محفوظ کر لیا جائے۔ قلندرانِ اقبالؒ جو نقوش و کیفیات کو دل کی لوح پر لئے پھرتے تھے اس کے قائل ہو گئے۔ آخری نشست کا سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ سینوں میں تلاطم تھا۔ مگر چہرے سنجیدہ تھے۔ نہ گریاں نہ خنداں۔ فراق کی غلش ضرور تھی لیکن یہ اطمینان تھا۔

نہ کر ذکرِ فراق و آشنائی کہ اصل زندگی ہے خود نمائی  
نہ دریا کا زیاں ہے نہ گہر کا دل دریا سے گوہر کی جدائی

اس لئے ہر ایک کی حالت یہ تھی۔

کشاومِ چشمِ دبرِ بستم لبِ خویش سخن اندر طریقِ ماگنا ہیست

ہیں اطمینان تھا کہ ہمارا سفیرِ اقبالؒ اس محفل کو سونا کر جائے گا تو کیا۔ وہ جہاں جائے گا نئی محفلیں آباد کرے گا جو اس ویرانی کا صلہ بن جائیں گی۔ یہ ضبط بھی درحقیقت پیامِ اقبالؒ اور تعلیمِ قرآن ہی کے صدقے میں تھا۔

ورنہ سینے میں تلاطم خیزیاں ساحل نا آشنا ہو رہی تھیں۔

یہاں تک تو ضبط نے ساتھ دیا۔ لیکن جب محفل شروع ہوئی تو اس کا نقشہ کچھ اور ہو گیا۔ اتفاقاً اس دن ”پس چہ باید کرد“ کا آخری باب زیر مطالعہ تھا جس کا عنوان ہے ”در حضور رسالتآب“۔ ایک طرف اقبال حضور رسالتآب میں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ اس کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے؟ دوسری طرف شیخ قلندران اور سید اقبال دونوں کی حالت یہ ہے کہ حضور ختمی مرتبت کی محبت میں ہمہ تن سوز۔ انہی کے سوز سے باقی قلندروں کے سینے بھی حرارتوں سے معمور ہو چکے تھے کہ مجلس پر کس قدر وہاں کیفیت طاری تھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی ہے۔ اس کا اہتمام کر لیا گیا تھا کہ جہاں اس آخری محفل سوز و ساز کے نقشے کو کیمرے کی پلیٹ میں محفوظ کر لیا جائے وہاں اس کے الفاظ کو بھی ریکارڈ میں ضبط کر لیا جائے۔ چنانچہ ایسا کر لیا گیا۔ اب جس وقت اس محفل کی یاد سے قلندروں کے سینے میں ہوک سی اٹھتی ہے وہ اسے اپنے لئے فردوس گوش بنالیتے ہیں۔

یہ آخری محفل اس کیفیت بار و حیات آورد وعدہ پر ختم ہوئی کہ اگلی کتاب (ارمغان حجاز) خود حرم کعبہ اور صحن مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر پڑھی جلتے گی۔ یہی وعدہ ہے جو اب قلندروں کی تمناؤں کا حسین مرکز بن رہا ہے اور جس سے آنے والے دن ان کی نگاہوں میں اس قدر تابناک ہو رہے ہیں۔ (دسمبر ۱۹۵۴ء)۔ (خورشید عالم)

اس کے بعد سید صاحب جدہ تشریف لے گئے اور اپنے ہر خط میں اس وعدہ کو دہراتے رہے کہ جو یہی حالات مساعد ہوتے وہ تمام قلندروں کو دعوت دیں گے اور ارمغان حجاز کا مطالعہ اور ختم حرم کعبہ اور صحن مسجد نبویؐ (علیہ التحیۃ والسلام) میں ہوگا۔ اس دوران میں حالات ناسازگار سے رہے جن کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں)۔ دسمبر ۱۹۵۶ء میں وہ انٹرنیشنل اسلامک کلیم (منعقدہ لاہور) میں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مجھے اس کی پہلے سے اطلاع دے دی اور تاکید سے لکھا کہ تم کلیم میں ضرور آنا تاکہ ملاقات کے لئے کافی وقت مل جائے۔ چنانچہ میں لاہور آ گیا اور جس گرجوشی سے وہ ملے اس سے میرے سینے میں ابھی تک حرارت باقی ہے۔ انہی کے ایما سے کلیم کے دوران دیاں سنگھ کالج ہال میں من و زرداں کے عنوان پر میری تقریر ہوئی جس کی انہوں نے صدارت فرمائی۔ پھر یہیں یہ بھی طے ہو گیا کہ وہ کلیم کے بعد کراچی پہنچ کر ایک ماہ مختص کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک بار پھر مجلس قلندران کا انعقاد ہو جائے۔ ۹ جنوری ۱۹۵۸ء کی شام (سفر سخا



کے بجائے میرے کاٹھانے میں، اس مجلس کا انعقاد ہوا اور زمانے کی طناہیں چار سال پیچھے کو کھینچ گئیں۔  
 نہ معلوم ان کے دل میں کیا خیال آیا کہ انہوں نے خاص طور پر کہا کہ اس مجلس کا ریکارڈ بھی ٹیپ پر محفوظ کر لینا۔  
 چنانچہ ایسا کر لیا گیا۔ رخصت کے وقت انہوں نے تمام قلندروں سے با چشمِ غم کہا کہ اب حرمِ کعبہ  
 میں ملاقات ہوگی۔

کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات "حرمِ جنت" پر ملتوی ہو جائے گی! جنوری ۱۹۵۹ء میں ان کا (الریاض  
 میں) حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ طوبیٰ لہ و حسن مآب۔

(پستین)

